مشرق سے ہو بیزار
نہ مغرب سے حذر کر
معارفِ
فکرِ اقبال
طالب حسینؒ ہاشمی
فطرت کا اشارہ ہے
کہ ہر شب کو سحر کر
BC

اکیسویں صدی کے نوجوانانِ اسلام کے لیے یہ کتاب "معارفِ فکرِ اقبال" جناب طالب حسین ہاشمی، ہیڈ ماسٹر کی طرف سے ایک قیمتی تحفہ ہے۔ عصرِ حاضر کے چیلنجوں کا مقابلہ کرنے کے لیے یہ پُرعظمت تصنیف ضربِ کلیمی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس مادہ پرستی کے دور میں نوجوان نسل "معارفِ فکرِ اقبال" کا مطالعہ کر کے فکرِ اقبال کے بحرِ بیکراں میں غوطہ زنی کر سکتی ہے اور موتیوں سے اپنی جھولیاں بھر سکتی ہے۔ طالب حسین ہاشمی عظیم اقبال شناس اور مایہ ناز سکالر ہیں۔ آپ کی مفکرِ اسلام اور شاعرِ مشرق سے محبت، وابستگی اور عشق اہلِ وطن کے لیے قیمتی اثاثہ ہے۔ بندہ ناچیز بھی حضرت اقبالؒ کی حیات آفریں فکری درس گاہ کا ایک ادنیٰ سا متعلم ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ طالب حسین ہاشمی کی یہ علمی اور فکری کاوشیں نوجوانوں کے قلوب کو گرماتی رہیں گی۔ میں ان کے لیے دعا گو ہوں کہ اللہ تبارک و تعالیٰ ان کے قلم کو اور زیادہ طاقت اور جذبہ بلند عطا فرمائے۔ آمین!

پروفیسر (ر) قدرت علی سیالوی
ماہرِ اقبالیات
گولڈ میڈلسٹ، ریٹائرڈ پرنسپل ضلع جہلم

معارفِ فکرِ اقبال

طالب حُسین ہاشمی

۱۶ اَکتوبر ۱۹۸۳ء کو تحصیل سوہاوہ ضلع جہلم کے معروف علمی و دینی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ بچپن ہی سے نصابی کُتب کے علاوہ دیگر علمی و اَدبی سرگرمیوں میں دلچسپی کی بدولت اُنھیں مطالعہ کا شوق پیدا ہوا جو وقت کے ساتھ ساتھ پروان چڑھتا گیا اور کتاب سے اُن کا تعلق گہرا ہوتا گیا اور اعلیٰ تعلیم کی راہیں ہموار ہوتی گئیں۔ آپ نے ایم اے اُردو، ایم ایڈ اور ایم فِل اقبالیات کی ڈگریاں حاصل کیں، اِسی شوق کے زیرِ اثر مستقبل میں پی ایچ ڈی کا اِرادہ رکھتے ہیں۔ پیشے کے لحاظ سے شعبہ تدریس سے وابستہ ہیں اور اپنا گراں قدر علمی سرمایہ نسلِ نَو کو منتقل کرنے کا فریضہ بھی بخوبی انجام دے رہے ہیں۔ ذوقِ مطالعہ نے اِقبال شناسی کی راہیں ہموار کیں تو وہ اقبالؒ کی شخصیت اور فِکروفن کے اَسیر ہو گے۔ انہوں نے اِقبال شناسی کو مقصدِ حیات بنا لیا۔ ایم فِل اقبالیات کا مقالہ ''مجلّہ اقبال کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ (۲۰۰۱ء سے ۲۰۱۶ء تک)''، اقبالیات کے حوالے سے دو زیرِ طبع کتابیں اور کتاب ہذا ''معارفِ فکرِ اقبال'' اُن کے اسی شوق کی غماض ہے۔ اقبال اکادمی لاہور، بزمِ اقبال لاہور اور بزمِ فکرِ اقبال راولپنڈی کے با قاعدہ رُکن ہیں اور اقبالیاتی سرگرمیوں میں با قاعدہ حصہ لیتے ہیں۔ اقبال کے فکروفن پر آپ کے مقالات معتبر قومی مجلّوں کی زینت بنتے رہتے ہیں۔

طالب حسینؒ ہاشمی

انتساب

اللہ تعالیٰ کی رحمتوں کے بہترین مظہر
اپنے محترم والدین کے لیے

فہرست

دیباچہ

زیرنظر کتاب ''مُعارفِ فکرِ اقبال''، تحقیقی مقالات کا مجموعہ ہے جن کا تعلق حضرت علامہ اقبالؒ کی تعلیمات سے ہے۔آپ کے مدّنظر وہ موضوعات ہیں جن کے بارے میں علامہ اقبالؒ نے سیر حاصل بحث کی ہے اور وہ عام فہم اور ہماری روزمرہ زندگی سے وابستہ ہیں یا پھر جن کا تعلق تعلیم اور تعلیم کے نظام سے ہے۔موصوف نے سادہ اور مدّلل انداز میں علامہ اقبالؒ کے نقطۂ نظر کو واضح کیا ہے اور حسبِ موقع مناسب اُردو اور فارسی اشعارِ اقبال کے حوالے دیئے ہیں پھر حاشیہ میں ان مقالات کے مراجع پیش کیے ہیں جن سے مصنف نے استفادہ کیا ہے۔اس طرح فِکرِ اقبال کو ایک مبتدی کے لیے سمجھنا آسان ہوگیا ہے۔

جن موضوعات کو زیر بحث لایا گیا ہے اِن میں علامہ اقبالؒ کے نظام فکر کی تکون، علامہ اقبالؒ اور عشقِ ختم المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم، قرآن، تصور شاہین، تصور فن، تصور ملّت، تصور عقل و عشق، تصوّف، تصور اجتہاد، تصور خیر و شر، تصور زمان و مکاں، تصور خُودی و بے خُودی، تصور تقدیر اور تصور جبر و قدر، تصور مرد مومن، عقیدہ ختم نبوت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم، مغربی تہذیب پر تنقید، فلسفہ تعلیم ۔یہی وہ موضوعات ہیں جن پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور تقریباً ہر ایک موضوع پر علیحدہ علیحدہ کتب موجود ہیں لیکن مصنف نے جس اختصار، سادگی اور آسانی سے ان پر قلم اُٹھایا ہے وہ کُوزے میں دریا بند کرنے کے مترادف ہے۔مصنف ایک استاد ہیں اس لیے انھیں ہائی، ہائیر اسکینڈری، گریجویشن اور ایم اے اُردو کی سطح کے طلبا کی علمی استعداد اور ضروریات کا بخوبی ادراک ہے۔تمام مقالات کو مختصر مگر جامع انداز میں یکجا کر دیا گیا ہے۔تاکہ مبتدی کے ساتھ ساتھ عام قارئین بھی اس سے مستفید ہو سکیں۔ وہ اس کتاب کے مطالعہ کے بعد علامہ اقبالؒ کے شعر و نثر کا با آسانی مطالعہ کرسکیں اور وہ بغیر کسی دِقت کے اشعار کو سمجھ سکیں اور علامہ کی صحیح فکر تک رسائی حاصل کرسکیں۔

مصنف نے مقالہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ذات سے علامہ کی عقیدت، عشق اور اطاعت کا جاندار انداز سے احاطہ کیا ہے۔علامہ اقبالؒ کی تعلیمات قرآنی احکامات پر مبنی ہیں اور مصنف نے اس موضوع پر بھی قلم اٹھایا ہے۔

علامہ اقبالؒ نے جب یہ محسوس کیا کہ مُسلمان دوسو برس کی غلامی اور معاشی استحصال کے باعث

احساس کمتری کا شکار ہوکر خود کو ایک عضوِ مفلوج سمجھ رہے تھے تو ان میں خُودی کا جذبہ بیدار کیا اور خُودی کا احساس دلاتے ہوئے انھیں خود شناسی، خودداری اور خودنگری کا احساس دلا کر تحرک کی راہ دکھلائی۔چونکہ خُودی کا مطلب یہ ہرگز نہیں تھا کہ انسان تکبر اور تفاخر میں اُلجھ کر دوسروں کو حقیر سمجھنے لگ جائے علامہ اقبالؒ نے بے خُودی کا تصور دے کر اجتماعی اور ملی خُودی کا احساس دلایا۔

اقبالؒ کے شاہین کے تصور کو بھی واضح کیا ہے۔علامہ اقبالؒ نے شاہین کی بلند پروازی، درویشی، خودداری اور آشیانہ نہ بنانے سے استغنا کی خوبیوں کے پیش نظر اسے حرکت و جرأت کی علامت قرار دیا ہے۔مصنف نے اس موضوع پر سیر حاصل بحث کی ہے۔علاوہ بریں علامہ کے تصور اجتہاد پر بحث کرتے ہوئے فاضل مصنف نے اس ضمن میں علامہ اقبالؒ کی قرآن فہمی کا اور قرآنی آیت کے استدلال کا ذکر کیا ہے۔

عمومی طور پر مصنف نے فلسفیانہ موضوعات سے اِعتنا برتا ہے مگر زمان و مکاں اور جبر و قدر کے فلسفہ کو موضوع سخن بنایا ہے۔علامہ اقبالؒ انسان کی آزادی عمل کی تلقین کرتے ہیں اور ان کے ہاں خُدا کی تقدیروں کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ انسان حسبِ کوشش نئی سے نئی تقدیر سے بہرہ ور ہوسکتا ہے۔جناب طالب حسین ہاشمی نے ان تمام مقالات میں تمام لازمی موضوعات کو علیحدہ علیحدہ بیان کر کے دراصل علامہ اقبالؒ کے افکار کی ایک مجموعی صورت پیش کر دی ہے۔اس مجموعہ مقالات میں سیاست بھی ہے، دین بھی ہے اور فلسفہ بھی، مسلمانوں کی تنزلی کے اسباب کی وضاحت بھی ہے اوران کی نکبُت و اِدبار سے باہر نکلنے کے اسباب اور عوامل کا ذکر بھی ہے۔

علامہ اقبالؒ ایک دردمند دل رکھتے تھے وہ زندہ دل بھی تھے ایک مفکر اور مفسر بھی۔ایک مجتہد اور قابل سیاستدان بھی تھے۔اُنہوں نے نازک مرحلہ پر قومی رہنمائی کا فریضہ کماحقہٗ ادا کیا ہے۔اس کی جھلک اس کتاب میں ہم پر واضح ہو جاتی ہے۔میری خواہش ہے کہ مبتدی علامہ اقبالؒ کی تعلیمات کو سمجھنے کے لیے اس کتاب کو اساس بنائیں۔میری دلی دعا ہے کہ فاضل مصنف اپنی کاوشوں کو جاری رکھیں ان میں سے کچھ موضوعات منتخب کر کے ان پر علیحدہ علیحدہ کتب تحریر فرمائیں۔

پروفیسر بریگیڈیئر (ر) ڈاکٹر وحیدالزمان طارق

فاضل فارسی، فاضل اُردو، ایم اے اردو، ایم اے فارسی،
ایم او ایل، پی ایچ ڈی فارسی ادب، بی ایس سی، ایم بی بی ایس، ایف سی پی ایس،
ڈپ پیکٹ، ایف سی پی ایس، ایف آر سی پیتھ (لندن)، ایف آر سی پی (ایڈنبرا)
لاہور
۴۔رمضان المبارک ۱۴۴۱ھ/ ۲۸۔اپریل ۲۰۲۰ء

اِقبالیات کے اُفق کا نیا ستارا

طالب حسین ہاشمی میرے پسندیدہ اور قابل قدر شاگردوں میں شامل ہے اور اِس کا شُمار میں اپنے عزیز ترین اور ہونہار شاگردوں میں کرتا ہوں۔ظاہر ہے میری اِس پسندیدگی کی کچھ وجوہات بھی ہیں۔وہ مؤدب، محنتی، عِلم کا رَسیا، اِطاعت گزار، سلیقہ شعار، خلوص کا پیکر، جہدِ مسلسل کا خُوگر، قَول کا سچا، دُھن کا پکا اور عمل کی طاقت پر یقین رکھنے والا کھرا انسان ہے۔اس کے ساتھ ساتھ طالب حسین ہاشمی سے میرے قُرب کی بڑی وجہ میرا اور اس کا دَردِ مشترک یعنی اقبال اور اقبالیات کی محبت ہے۔

طالب حسین ہاشمی عِلم کے نُورانی راستے کا راہی ہے۔وہ نہ صرف خُود اِس راستے پر مسلسل گامزن ہے بلکہ بطورِ شیخِ مکتب، میرِ کارواں کا کردار ادا کرتے ہوئے، قوم کے نونہالوں اور نوجوان نسل کے ذہنوں کی آبیاری اور ان کی روحوں کی صنعت کاری کا فریضہ بھی بطریقِ احسن انجام دے رہا ہے۔علم وعمل سے اِس کی یہی محبت اسے کشاں کشاں اقبال اور اقبالیات کے کُوچے میں لے آئی اور یہاں قدم رکھتے ہی اُس نے اپنی طبعِ رسا کی بدولت یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ اِس کُوچے کے پیچ وخَم اور اَسرار ورُموز سے آشنائی حاصل کر کے اِس کا مردِ میدان بنے گا۔اور یہیں سے اُس نے یقینِ مُحکم، عملِ پیہم اور محبت فاتح عَالم کا درس لیا اور پھر اِس سبق کو اپنا لائحہ عمل بنا لیا۔

شاعرِ مشرق علامہ محمد اقبالؒ سے ملنے والے جَہدِ مسلسل کے سبق کو طالب حسین ہاشمی نے محض روایتی انداز میں صِرف اپنی تقریروں کا موضوع اور تحریروں کا عنوان ہی نہیں بنایا بلکہ اُسے عملی طور پر اپنایا ہے۔ ایم فل اقبالیات میں اس کی شاندار کامیابی، وقیع مقالہ اور آپ کے ہاتھوں میں موجود، یہ خوب صورت تحقیقی کتاب میرے اس دعوے پر دال ہیں۔

طالب حسین ہاشمی اپنی اِس کتاب کے مقالات میں ایک سُلجھا ہوا قلمکار اور ذَوق وشَوق رکھنے والا مُحقق بن کر سامنے آیا ہے۔اس نے بظاہر اقبال اور اقبالیات کے عام موضوعات پر قلم اُٹھایا ہے مگر جو کچھ لکھا ہے وہ پوری دیانت، صداقت اور کمال محنت و ریاضت سے لکھا ہے۔ہر موضوع پر اس نے نپی تُلی آرا اور خیالات کے ساتھ ساتھ معروف اقبال شناسوں اور ماہرین اقبالیات کی تحریروں کے اقتباسات کا خاصا ذخیرہ بھی مہیا کر دیا ہے۔خوب صورت بات یہ ہے کہ اس نے تحقیقی اصولوں کو بروئے کار لاتے ہوئے حوالہ جات کے مکمل اور مسلسل اندراج پر خاص توجہ مرکوز کی ہے۔اس طرح اُس کا انداز رواں دواں ہونے کے ساتھ ساتھ علمی و تحقیقی بھی بن گیا ہے اور یہی خوبی اس کے ان مقالات کو وقیع اور قابل قدر بناتی ہے۔اس کی تحریر کی روانی اور تحقیقی اٹھان بتاتی ہے کہ اگر وہ اسی طرح تحریری و تحقیقی مشق بہم پہنچاتا رہا تو جلد ہمارے اقبالیاتی ادب کو ایک پُختہ کار مصنف اور ثِقہ مُحقق میسر آ جائے گا۔میں طالب حسین ہاشمی کے اِن مقالات کو پاکستان کے اقبالیاتی ادب کے لیے نیک فال سمجھتا ہوں اور اس کی علمی و تحقیقی ترقی کے لیے دُعا گو ہوں۔

ڈاکٹر محمد قمر اقبال

راولپنڈی

۱۳۔رمضان المبارک، ۱۴۴۱ھ/ ۷ مئی ۲۰۲۰ء

دَرگاہِ اقبال کا دُرِّ افشاں

علم و آ گہی کے طالب تمام قلوب و اَذہان اُس وقت تک فکرِ اقبال کی گہرائی تک رسائی حاصل نہیں کر سکتے جب تک وہ روحانی طور پر نُور اقبال کی بے تاب لہروں کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہو جاتے اور ان سارے دُشوار مراحل میں صرف خلوص نیت اور بے لوث روحانی عقیدت ہی فکر اقبال کی اصل روح تک رسائی کی اجازت دے سکتی ہے۔جس کی نیت خلوص جتنی گہری ہوگی روحانی عقیدت جتنی پختہ ہوگی وہی اقبال کے نُورِ بصیرت کا فیضان اور اصل گوہر مقصود سے بہرہ مند ہو سکتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ طالب حسین ہاشمی نے اپنی سوچ، روحانی وابستگی اور بے تاب نگاہ سے فکرِ اقبال کے درشن کی سعادت حاصل کی اور بے پایاں فیض حاصل کر کے اپنے منتخب مقالات کو سجایا اور زیر نظر کتاب کی صورت میں اقبال کے چاہنے والوں کی خدمت میں پیش کر دیا۔اس کتاب کو میں تو چراغ سے چراغ جلانے کی خوب صورت سعی کا ہی نام دوں گا کیونکہ روشنی کا اصل منبع بصیرت اقبال ہی ہے۔البتہ اس روشنی کا دائرہ وسیع تر ہوتا جا رہا ہے۔اس روشنی کو پھیلانے میں جو شخصیات بھی مگن ہیں وہ قابل ستائش ہیں اور ان ہی کی وجہ سے فکرِ اقبال کی ضیاء ہر سُو پھیلتی اور بڑھتی جا رہی ہے۔

طالب حسین ہاشمی بھی اپنی کتاب "معارفِ فکرِ اقبال" سینے پر سجائے ہوئے اقبال کے عقیدت مندوں میں شامل ہو گیا ہے اور ضیائے اقبال کی کرنیں بکھیرنے میں فکری پختگی کی حامل شخصیات میں شامل ہو گیا ہے۔کتاب ''معارفِ فکرِ اقبال'' کے مطالعہ سے یہ واضح طور پر محسوس ہوتا ہے کہ مصنف نے اس دُشوار گزار سفر کے سارے لوازمات کا بڑے سلیقے سے بندوبست کر رکھا ہے۔سفر بہت دشوار ہے اس سفر کے لیے تو عزم و

حوصلہ، قوت برداشت، ذہنی پختگی، محنت و ریاضت، حسن و صداقت جیسی خوبیاں، صلاحیتیں زادِ راہ کا کام دیتی ہیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ مصنف نے اپنے تمام مضامین رواں، شُستہ اور شگفتہ انداز میں اور سادگیِ زبان و بیان کے پیرائے میں سجا کر پیش کیے ہیں۔ جو ایک مُخلص اقبال شناس کا امتیاز ہے۔زیر نظر کتاب علامہ اقبالؒ کی عظیم و آفاقی فکر کے فروغ کا ایک عملی اظہار ہے جو کہ ایک عام قاری اور طالب علم کی اقبالیات سے مزید دلچسپی کا سامان مہیا کرے گی۔

اگرچہ یہ مصنف کی پہلی کاوش ہے۔لیکن مضامین کا انتخاب اعجاز ہُنر سے کامل آ گہی کا واضح اظہار ہے۔ یہ امر انتہائی حوصلہ افزا ہے کہ اگر مصنف پر ادراک کا یہ احساس طاری رہا اور اقبالؒ سے عقیدت و لگاؤ کا الاؤ جلتا رہا تو یقیناً اقبالؒ کی فکر کے دیگر رنگ و زاویے اور پہلو مصنف کے زیر قلم ہوں گے۔کتاب کے گہرے مطالعے سے اِس بات کا اظہار بھی ہوتا ہے کہ فکرِ اقبال کے فروغ کے لیے جس سوچ اور بصیرت کے پرت کھولے گئے ہیں۔اس میں تحقیقی عناصر کو خوب صورتی، کامیابی اور مہارت کے ساتھ استعمال کیا گیا ہے۔دراصل اقبال کی فکر کی قوسِ قزح کے دائرے میں مضامین کو مفاہیم کی نظر کرنا، وسیع اور گہرے مطالعے کے بغیر ممکن نہیں ہے اور خاص طور پر زبان پر مکمل عبور اور دسترس حاصل نہ ہو تو اس خزانے سے قیمتی موتیوں کی تلاش سعیِ رائیگاں کے مترادف ہے۔لیکن مصنف کتاب نے مذکورہ اوصاف کو پہلے اپنایا اور پھر حلقہ اقبالیات میں قدم رکھا اور ایسا قدم رکھا کہ کہیں پر کوئی جھجک محسوس نہ کی اور خوب صورت اور اعتماد کے ساتھ اقبال کی فکر کی روشنی بکھیری اور اپنی گہری عقیدت جو اقبالؒ سے وابستہ ہے کی کشش کی بنیاد پر حلقۂ اقبالیات کے پہلے زینہ پر قدم رکھا اور اپنی اس جرات پر نہایت مسرور و مطمن بھی دکھائی دیتا ہے جو کہ مصنف کی تحریر سے بھی واضح عیاں ہے۔ مجھے قوی یقین ہے کہ عقل کی جہاں داری کے قائل سبھی افراد کے لیے ''معارفِ فکرِ اقبال'' کا مطالعہ باعث تسکین ہوگا اور علامہ اقبالؒ کی فہم و بصیرت، ملّت اسلامیہ کی سربلندی کی بے پناہ آرزو نبی آخر الزماں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے والہانہ عقیدت، عشق و محبت کی معطر خوشبو سے مستفید ہوگا۔دُعا ہے کہ اللہ کریم طالب حسین ہاشمی کو مزید استقامت، ہمت و ہنر عطا فرمائے کہ اقبال کی درگاہ سے موتی چُن کر صاحبان علم و دانش کے حضور پیش کرتا رہے۔آمین!

شاہد لطیف ہاشمی

ایڈووکیٹ ہائی کورٹ، گوجر خان

۱۳۔رمضان المبارک، ۱۴۴۱ھ/ ۷۔مئی ۲۰۲۰ء

'معارفِ فکرِ اقبال' میری نظر میں

اقبالیات ایک وسیع موضوع ہے اور فکرِ اقبال کی وُسعت، گہرائی، گیرائی اور دائرہ کار کا اندازہ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کے اِس قَول سے لگایا جاسکتا ہے۔''وہ (اقبالؒ) مشرق و مغرب کے کم ازکم سہ ہزار سالہ اِرتقائے فِکر کا وارث ہے۔'' علامہ اقبالؒ کے نظامِ فِکر میں فرد یعنی خُودی کی تربیت سے لے کر جماعت یعنی بے خُودی کے اِستحکام تک مکمل راہنمائی موجود ہے۔علامہ اقبالؒ خُودی اور بے خُودی کے ذریعے فرد و ملّت کے علاوہ خُدا، خودی اور کائنات کے باہمی تعلق کو بھی واضح کرتے ہیں۔اِن کے ہاں عالم انسانیت اور خاص طور پر ملّتِ اسلامیہ کے لیے مکمل فِکری نظام موجود ہے، اتنے متنوع اور ہمہ گیر اَفکار کو نوجوان نسل تک منتقل کرنا ایک اہم فریضہ ہے۔طالب حسین ہاشمی اقبالیات کے حوالے سے ایک سنجیدہ اور ہمہ وقت متحرک رہنے والے محقق ہیں، اِن کے مقالات کا مجموعہ اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ اُنھوں نے اَفکارِ اقبال کو سادہ اور عام فہم انداز میں نوجوان نسل تک پہنچانے کی کامیاب کاوش کی ہے چونکہ علامہ اقبالؒ کا زیادہ تر کلام فارسی میں ہے اور ہم فارسی کو اپنی درس گاہوں سے خارج کر چکے ہیں تو اس تناظر میں طالب حسین ہاشمی کی کتاب ''معارفِ فکرِ اقبال'' کے مقالات کا اُسلوب زیادہ اہمیت اختیار کر جاتا ہے۔اللہ تعالیٰ مزید توفیقات سے نوازے۔آمین!

پروفیسر منیر احمد یزدانی

سابق صدر شعبہ اُردو

گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج، میر پور (آزاد کشمیر)

۹ مئی، ۲۰۲۰ء

پیش گُفتار

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت ان کے فِکری وفنی ارتقا، سیاسی و مذہبی اور فلسفیانہ نظریات، ان کی نظم و نثر کی توضیح وتشریح اور ان کے اَفکار کی تفہیم، تشریح سے متعلق کئی مضامین اور بکثرت کُتب منظر عام پر آچکی ہیں۔اس کے باوجود اِقبال کی جستجو میں بے تاب قلوب واذہان اِن کے اَفکار کی مختلف جہات پر موضوعات تلاش کر کے اقبال شناسی کے دائرے کو وسیع کرنے میں کوشاں ہیں۔مجھے بھی اقبال سے مُحبت اور اندرونی خلش تڑپاتی رہی کہ اپنی استطاعت کے مطابق بصیرت اقبال کے نُور کو پھیلانے میں اپنا کردار ادا کروں۔ذہن وقلب میں اقبال کے جن آفاقی افکار نے ہلچل مچائے رکھی ان کو سادہ زبان اور عام فہم انداز میں اس کتاب میں پیش کیا گیا ہے تاکہ طلبہ و عام قاری ان مقالات سے استفادہ کرتے ہوئے اقبال شناسی کے دائرے میں شامل ہوسکے۔

علامہ اقبالؒ نے جو سوچ دی، جو کچھ بھی لِکھا اور جو کُچھ بیان کیا وہ سب تو بنیادی ماخذ کے طور پر محفوظ ہے۔اب اس پر غور وفکر کے مُختلف پہلو ہیں جِن کو اقبالیاتی تحقیق کا رفروغ دینے میں کوشاں ہیں۔میری بھی یہی خواہش رہی ہے کہ جہاں اقبالؒ کے افکار کی روشنی پھیلانے والوں کی فہرست مرتب ہوتو میرا نام اور کام بھی شامل ہوجائے کہ میرے لیے یہی بات باعث فخر وانبساط ہوگی۔

میرے ان مقالات کا انتخاب اقبال کی اُس فِکر سے ہے جو کہ عِشق ختم المُرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، عقیدہ ختم نبوت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، قرآن، اجتہاد، تصور ملّت، خیر وشر اور زمان و مکاں کا احاطہ کئے ہوئے ہے اور میری یہی کوشش

رہی کتاب میں شامل مقالات محض حسن اقبالیات میں اضافہ کا باعث نہ ہوں بلکہ ہر دل اور ہر ذہن میں فکرِ اقبال کے عملی اثرات کی صُورت موجزن دکھائی دیں اور قافلہ اقبال کامیابی کی منزلیں طے کرتا ہوا دِکھائی دے اور یہ فِکر عہد بہ عہد، نسل در نسل ذہنوں میں اِنقلاب کی خُوشبو بکھرتی محسوس ہوتی رہے۔ اسی لیے اقبال کے اِن افکار کو آسان فہم اور سادہ زبان میں پیش کیا ہے تاکہ قاری کو نہ صرف مفہوم واضح ہو سکے بلکہ اقبالؒ کے گہرے مشاہدات کا اثر قاری اپنے دِل میں محسوس کرے۔

اس کتاب کی تیاری کے مختلف مراحل میں قابل اساتذہ اور دیگر احباب نے بھر پُور راہنمائی اور معاونت فراہم کی۔ اُن کو ہمیشہ اپنی دُعاؤں میں یاد رکھوں گا۔ اُن محترم شخصیات میں پروفیسر ڈاکٹر شاہد اقبال کامران صاحب، پروفیسر ڈاکٹر شیراز علی زیدی صاحب، پروفیسر ڈاکٹر خالد اقبال یاسر صاحب کا بے حد شُکر گزار ہُوں جنہوں نے ہر موڑ پر پُرخلوص راہنمائی اور اصلاح فرمائی۔

پروفیسر ڈاکٹر محمد ارشد اویسی صاحب، پروفیسر ڈاکٹر سہیل عباس خان صاحب کا بھی شکر گزار ہوں جنھوں نے رہنمائی فرمائی۔

پروفیسر ڈاکٹر قمر اقبال صاحب نے ادبی ذوق خاص طور پر اقبالیات کو پروان چڑھانے میں میری مدد کی۔ میری کتاب کی تکمیل کے آخری مراحل تک ساتھ دیا۔ میں آپ کا تہ دِل سے شکر گزار ہوں۔

میں جناب پروفیسر جلیل عالی صاحب، پروفیسر، بریگیڈیئر (ر)، ڈاکٹر وحید الزمان طارق صاحب، پروفیسر منیر یزدانی صاحب، پروفیسر قدرت علی سیالوی صاحب کا بھی تہہ دِل سے مشکور ہوں کہ اُنہوں نے میری اس کاوش کو سراہا۔ چودھری محمد معروف صاحب، چیف ایگزیکٹو آفیسر (ڈی۔ای۔اے) ضلع جہلم، سیّد مظہر اقبال شاہ صاحب، ڈسٹرکٹ ایجوکیشن آفیسر، ضلع جہلم، سہیل رضا صاحب، ڈپٹی ڈی ای او، سوہاوہ، عادل حسین صاحب، اے ای او، سوہاوہ کا بہت ممنون ہوں اُنہوں نے بھی میری حوصلہ افزائی فرمائی۔

بہت شفیق دوستوں صاحبزادہ حارث نذیر (انگلینڈ)، قاضی وسیم اعجاز مجسم، (ایم۔ڈی) الائیڈ اسکول سوہاوہ، احمد اویس (امریکا)، سجاد اعجاز راجا (ناروے) کا ممنون ہوں انھوں نے میری ہمت بندھائی۔ اپنے کلاس فیلوز پروفیسر محمد طارق، شفیع اللہ ایس ایس اُردو، اسسٹنٹ پروفیسر گلناز عظیم بھٹی، پروفیسر محمد اعظم، خالد جوہری، معلم پروفیسر ادریس آزاد اور میاں ساجد علی کا بہت شکر گزار ہوں جنھوں نے میری کتاب کے پایہ تکمیل تک بخوبی ساتھ نبھایا۔

اپنے نہایت مُشفق چچا شاہد لطیف ہاشمی، ایڈووکیٹ کا ساتھ شروع سے آخر تک ایک سایہ کی طرح

رہا جنہوں نے قدم قدم پر رہنمائی فرمائی۔ میں اپنی شریکِ سفرِ حیات شائشہ ہاشمی کے تعلیم یافتہ ہونے سے بھی بھر پُور مستفید ہوا۔

میں خاص طور پر اپنے محترم اور مشفق والدین کا بے حد مشکور ہوں جن کی پُرخلوص دُعاؤں نے آج مجھے اس مقام تک پہنچایا۔ مجھے گھریلو اور معاشی فِکر سے دور رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی اور میں اپنا کام کرنے کے قابل ہوا۔

مقالات کمپوز کروانے میں محمد توصیف ہاشمی اور علینا ہاشمی نے میرا بھرپور ساتھ دیا۔ کتاب کی اشاعت کے سلسلے میں میں قیمتی وقت عنایت کرنے اور رہنمائی کرنے پر نایاب خاور بھٹی ایڈووکیٹ کا بھی انتہائی شکر گزار ہوں۔ نعیم اختر مرزا، پرنسپل، گورنمنٹ ہائی اسکول سوہاوہ نے میری کتاب کی نظرِ ثانی میں میرا ساتھ دیا۔ میں تہ دل سے آپ کا ممنون ہوں۔ صاحبزادہ دلدار علی شاہ صاحب (دیوان حضوری)، پروفیسر ڈاکٹر محمد عارف خان صاحب، پروفیسر ارشد علی صاحب، ڈاکٹر عُمر فاروق صاحب، ڈاکٹر اسد نعیم منوچہر صاحب، نوید شیراز، معلم، پروفیسر محمد فاروق، حسیب حیدر (انگلینڈ) کا سپاس ہوں انہوں نے نہایت قیمتی مشورے دیے اور میری حوصلہ افزائی فرمائی۔

محترم امر شاہد اور گگن شاہد کی شفقت اور محبّت کا تہ دِل سے شکر گزار ہوں کہ اُنھوں نے میری کتاب ''معارفِ فکرِ اقبال'' کو نہ صرف سراہا بلکہ اپنی قیمتی آراء اور مشوروں سے رہنمائی بھی کی۔ محترم امر شاہد نے اپنی گُوناگُوں مصروفیات سے وقت نکال کر میرے ساتھ بھرپور تعاون کیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ بُک کارنر جہلم ایک ایسا گراں قدر عِلمی واَدبی اِدَارہ ہے جہاں تمام شعبہ ہائے زندگی سے متعلق کثیر تعداد میں کُتب موجود ہیں جو عِلم واَدب سے وابستہ لوگوں کے لیے بہترین اثاثہ ہیں۔ میری دِلی خواہش ہے کہ ایسے ادارے ہر تحصیل میں ہونے چاہییں تاکہ عِلم کے رَسیا لوگ آسانی کے ساتھ اپنا شوق پورا کر سکیں۔

طالب حسین ہاشمی

ایم فل اقبالیات، ایم۔ایڈ

تحصیل سوہاوہ، ضلع جہلم (پنجاب)

۱۴۔رمضان المبارک، ۱۴۴۱ھ ۸۔مئی ۲۰۲۰ء

موبائل: 0333-5205642

talib.hashmi@gmail.com

علامہ اقبالؒ کے نظامِ فکر کی تکون

(خدا، انسان اور کائنات)

انسان نے جب سے تاریخی شعور سنبھالا ہے وہ اسی فکر میں سرگرداں نظر آتا ہے کہ اپنے آغاز وانجام اور اپنے کائنات کے رشتوں کا ادراک حاصل کر لے اور جب وہ اس میدان میں پہلا قدم ہی اُٹھاتا ہے تو اسے قہری طور پر عالم امکان واسباب کی گتھیاں سلجھانے کے لیے تخلیق کائنات کا راز معلوم کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے اور فلسفہ انسان کو آزادانہ عقلی تجسس وتحقیق کے ذریعے ماہیت وجود کا ادراک حاصل کرنے کی راہ سمجھا تا ہے۔

''یہ وہ مقام ہے جہاں علم اور فلسفہ کو مُسلمات ومفروضات کی تہ تک پہنچنے کے لیے روحانی وجدان سے مدد لینے کی ضرورت پیش آتی ہے، اور دراصل علم وفلسفہ اور عقل وخرد کے ساتھ روحانی وجدان اور الہامی فکر کے اسی توافق کو قائم کرنے کے لیے اقبال نے فکر اسلامی کی تشکیل جدید کی ضرورت کو محسوس کیا اور اسی کی تبلیغ و اشاعت کے لیے اپنے کلام وخطبات کو استعمال کیا۔ علامہ اقبالؒ نے تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ کے پہلے خطبے میں اپنے اسی نظام فکر کی توضیح وتشریح کی ہے اور خُدا انسان اور کائنات کے رشتوں سے بننے والی تکون کے اندرونی نظم کی وضاحت کی ہے۔''(۱)

آج جب علوم انسانی نے اس قدر ترقی کر لی ہے اور انسان نے بے شمار عناصر فطرت کو اپنی خدمت پر مامور کر کے کائنات عالم میں انسان کے تفوق وبرتری کا سکہ بٹھالیا ہے اور وہ اشرف المخلوقات ہونے کا حقدار کسی حد تک قرار دے دیا گیا ہے، وہ ابھی تک مادی توجیہات اور طبیعی مشاہدات کے ذریعے اپنے انجام و آغاز سے قطعی بے خبر ہے، اور اسے اس کائنات میں اپنے وجود کی مقصدیت سے لاعلمی ہے انسان نے سائنسی

علوم اور ٹیکنالوجی کے ذریعے مہر و ماہ پر کمندیں ڈالنا تو شروع کر دی ہیں لیکن اسے ابھی تک فراخئ افلاک اور وُسعتِ کائنات کا علم حاصل نہیں ہو سکا۔ وہ مشاہدے اور تجربے سے جو جان جاتا ہے اور جس قوت کو تسخیر کر لیتا ہے اسے تو اپنا تابع بنا لیتا ہے لیکن اقبالؒ کی طرح قرآن اور سیرت محمدی ﷺ سے فیض یاب ہونے کی بنا پر یہ نہیں کہہ سکتا کہ

سبق ملا ہے یہ معراج مصطفیٰ ﷺ سے مجھے
کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں!

(۲)

اس لیے کہ سائنس علوم الٰہیہ سے قطع نظر کرتی ہے اس لیے کہ اس کا ضمیر ایقان کی موت سے عاری اور اس کا ادراک روحانی وجدان سے خالی ہوتا ہے، اس میں نہ مقصدیت ہوتی ہے نہ اخلاقی اقدار کی قدر و قیمت اور نہ وجود خُداوندی کا تصور، اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ سائنس عالم امکان کو صرف مادہ کی کارفرمائی قرار دیتی ہے اور اس طرح انسانی دماغ اور انسانی شعور کے اعمال وافعال کو مادی افعال سمجھا جاتا ہے اور وجود مطلق بھی مادہ ہی قرار پاتا ہے لیکن اس طرح تخلیق کائنات کا راز انسان کی سمجھ میں نہیں آتا اور وہ صرف مادّی علوم کے ذریعے یہ پتا نہیں لگا سکتا کہ مادہ کو صورت، حسن، شعور اور ذہن بخشنے والا کون ہے، اور اس کہنہ سرائے عالم کے نظام حیات کو خلق کرنے والا اور جاری رکھنے والا کون ہے؟(۳)

عقل مدت سے ہے اس پیچاک میں اُلجھی ہوئی
روح کس جوہر سے خاکِ تیرہ کس جوہر سے ہے؟

(۴)

فکر اقبال کے عمیق مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ خُدا، خُودی اور کائنات ایک ایسی مثلث ہے جس میں اللہ تعالیٰ اکمل ترین خُودی، انسان اشرف المخلوقات ہونے کے ناطے اللہ تعالیٰ کا پرتَو اور اللہ تعالیٰ کی تخلیق کردہ کائنات میں تخلیقی عمل جاری وساری ہے۔

''اقبال کے فلسفیانہ تصور کی رو سے خُدا خُودی مطلق ہے اور دیگر تمام وجود یا خُودیاں اسی خُودی مطلق نے تخلیق کی ہیں۔ اقبال فرماتے ہیں کہ الہ (معبود حقیقی) نے امر اور خلق دونوں کو اپنے تصرف میں رکھا ہوا ہے۔ خلق یعنی تخلیق کرنا ظاہر ہے کہ عرف عام میں کسی چیز کی ہیت بدل دینے کو بھی تخلیق کہتے ہیں مگر اصطلاحی طور پر تخلیق عدم سے کسی چیز کو وجود میں لانا ہے اور یہ خُدا کے علاوہ کسی دوسرے سے ممکن نہیں ہے۔ دوسری بات امر

یعنی ہدایت کی ہے۔ پس خالق کائنات نے ہر چیز کی تخلیق ہی نہیں کی، اسے اس کی منزل مقصود تک پہنچنے کے لیے ضروری رہنمائی بھی کی ہے پھر جس ہستی کامل کو رہنمائی کا سب سے اعلیٰ شرف دیا ہے اسے رحمۃ اللعالمین قرار دیا ہے۔'' (۵)

جاوید نامہ میں اقبالؒ کا ایک شعر ہے:

خلق و تقدیر و ہدایت ابتدا است
رحمۃ اللعالمینی انتہا است

مابعد الطبیعات کا ایک موضوع یہ ہے کہ خالق کا کائنات اور مخلوق (خصوصاً انسان) سے کس قسم کا رابطہ ہے۔'' (۶)

''قرآن مجید نے ذات الٰہیہ کا جو تصور قائم کیا ہے، اس کے دوسرے اہم اجزا ہیں، اس کی خالقیت، اس کا علم، قدرت کاملہ اور دیمومت۔ نفس متناہیہ کے لیے تو عالم فطرت کی حیثیت ایک ایسے غیر کی ہے جو اس کے بالمقابل موجود اور اپنی ذات کے سہارے آپ قائم ہے اور جس کا ذہن کو علم تو ہوتا ہے مگر جسے وہ خلق نہیں کرتا، لہٰذا ہم سمجھتے ہیں اس کی تخلیق ماضی کا ایک مخصوص حادثہ ہے، یعنی وہ کوئی بنی بنائی شے ہے جس کو اپنے صانع کی ہستی سے زندہ اور نامی تعلق نہیں اور جس کی حیثیت اب محض ایک تماشائی کی ہے۔ نفس متناہیہ کی یہی تنگ نظری ان لا حاصل اور لا طائل بحثوں کی حقیقی علت ہے جو علمائے الٰہیات میں مسئلہ تخلیق کے متعلق پیدا ہوئیں۔ حیات الٰہیہ میں کائنات کی حیثیت محض ایک عرض کی رہ جاتی ہے اور اس لیے بہت ممکن ہے اس کو پیدا ہی نہیں کیا جاتا۔ لہٰذا یہاں جو سوال فی الحقیقت غور طلب ہے وہ یہ کہ ذات الٰہیہ کے لیے کائنات کی حیثیت کیا سچ مچ ایک وجود مقابل کی ہے اور اس لیے ان کے درمیان کچھ بعد مکانی حائل ہے۔ زمان و مکان اور مادہ بجائے خود ذات الٰہیہ کی آزادانہ تخلیقی فعالیت کی وہ تعبیریں ہیں جو فکر نے اپنے رنگ میں کی ہیں، ان کا کوئی مستقل وجود نہیں کہ اپنے سہارے آپ قائم رہ سکیں، وہ محض عقل کے تعینات ہیں جن کے ذریعے ہمیں حیات الٰہیہ کا اِدراک ہوتا ہے۔'' (۷)

''اشاعرہ کے نزدیک کائنات کی ترکیب جواہر یعنی اِن لا انتہا چھوٹے چھوٹے ذروں سے ہوئی جن کا مزید تجزیہ ناممکن ہے، لیکن خالق کائنات کی تخلیقی فعالیت کا سلسلہ چوں کہ برابر جاری ہے اس لیے جواہر کی تعداد بھی لا متناہی ہے، کیوں کہ ہر لحظہ نئے نئے جواہر پیدا کیے جا رہے ہیں اور اس لیے کائنات میں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔ قرآن مجید کا بھی یہی ارشاد ہے: واللہ یزید فی الخلق مایشاء۔

لیکن یاد رکھنا چاہیے جواہر کی حقیقت کا دار و مدار ان کی ہستی پر نہیں، ہستی تو وہ صفت ہے جو اللہ تعالیٰ جواہر کو عطا کرتا ہے۔ جب تک یہ صفت عطا نہیں ہوتی، جواہر گویا قدرت الٰہیہ کے پردے میں مخفی رہتے ہیں، وہ ہستی میں آتے ہیں تو اس وقت جب یہ قدرت مرئی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ لہٰذا بہ اعتبار ماہیت جواہر قدر سے عاری ہے گو یا یوں کہیے کہ اس کا ایک محل بھی ہے لیکن مکان سے بے نیاز۔'' (۸)

''شاید اگر انسان کو کائنات کی نیرنگیاں پریشان نہ کرتیں اور فطرت کی قُوتیں اس کے سامنے مسائل کے انبار نہ لگا دیتیں اور شعور و علم انسانی اسے فکر و غور اور تجسس و تحقیق پر نہ اکساتا تو یہ انسان کبھی بھی خُدا کی تلاش میں نہ نکلتا اور روحانی وجدان کی ضرورت محسوس نہ کرتا لیکن انسان کی مشکل تو یہی ہے کہ بغیر خُدا سے رابطہ قائم کیے وہ اس کائنات سے نہ ہم آہنگ ہو سکتا ہے نہ مربوط، اسے یہ تکون مکمل کرنے کے لیے اس بازو کو قہراً و جبراً اپنے نظام تکوین کا جزو لاینفک بنانا ہی پڑتا ہے۔ زندگی کی ابتدا اور شعور کی تخلیق کے ساتھ ساتھ نظم حیات اور ارتقائے حیات کی معنویت جاننے کے لیے خُدا کی موجودگی، اس کا خالق ہونا اور اس کا معبود ہونا تسلیم کرنا پڑتا ہے اور جیسے ہی ایک خالق کائنات کا تصور قائم ہوتا ہے اسے جاننے کی خواہش پیدا ہوتی ہے اور خود اپنی خلقت کے مقاصد سے واقف ہونے کا سودا بھی دل میں سما جاتا ہے۔ انسانی شعور اور کائنات میں ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے خُدا کے وجود پر ایمان لانا اور اسے اقدار حیات کا خالق تصور کر کے کائنات میں اپنی حیثیت اور مقام کو جاننا ضروری ہے تاکہ الہامی فکر کی روشنی میں انسان اپنے اقتدار و اختیار کی راہیں متعین کر سکے اور اسے ارتقائے انسانی کی انتہا اور عُلّوِ مرتبت کی اعلیٰ ترین منزل کا پتا چل جائے۔'' (۹)

"مذہب میں عقاید کا جو پہلو ہے وہ کلی صداقتوں کا ایک نظام ہے جن کا غیر مبہم اور بیّن ادراک و یقین سیرت و کردار کی تشکیل میں موثر ثابت ہوتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ مذہب انسان کو زندگی کی ماہیت سے کبھی دور نہیں لے جاتا اور اس کا تعلق زندگی کے کسی ایک پہلو سے نہیں، دین نہ خالی فکر ہے اور نہ صرف تاثر و عمل بلکہ یہ انسان کی پوری شخصیت پر حاوی ہے اور اس میں فکر و تاثر بیک وقت موجود رہتے ہیں۔" (۱۰)

''اپنی کتاب ''فلسفہ اور طبیعات'' میں پروفیسر راں گیئر نے لکھا ہے اور ان کی یہ عبارت بالخصوص قابل توجہ ہے کہ قدما کے اس مقولے کے برعکس کہ فطرت جست نہیں لگاتی۔ اب تو کچھ ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ کائنات میں جو تغیرات رونما ہوتے ہیں، یک بیک جست لگانے ہی سے ہوتے ہیں، بتدریج نہیں ہوتے کہ ہمیں ان کا اِدراک نہ ہو سکے، دراصل کوئی بھی طبیعی نظام ہو، اس میں ان حالتوں کی تعداد جو اپنی جگہ پر واضح اور نمایاں ہیں، متناہی ہی ہو سکتی ہے، لیکن دو مختلف اور یکے بعد دیگرے رونما ہونے والی حالتوں کے درمیان

کائنات چوں کہ ساکن رہتی ہے، لہٰذا اس اثنا میں زمانہ بھی معطل ہو جاتا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ زمانے کا وجود بھی مسلسل نہیں۔'' (۱۱)

''کائنات اضافہ پذیر ہے اور جس کو اس امید نے سہارا دے رکھا ہے کہ انسان ایک نہ ایک دن شر پر غالب آئے گا۔'' (۱۲)

''دراصل خیر میں جبر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ خیر کا مطلب ہے انسان کا برضا و رغبت کسی اخلاقی نصب العین کی پیروی کرنا، جس کا دارومدار پھر اس بات پر ہے کہ وہ ''انا'' جن کو اختیارِ ذات کی نعمت حاصل ہے، برضا و رغبت ایک دوسرے سے تعاون کریں۔ اس لیے کہ وہ ہستی جس کے اعمال و افعال کل کی طرح متعین ہیں، خیر کی اہل کیسے ہو سکتی ہے؟ آزادی خیر کی شرطِ اولین ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ایسے نفوسِ متناہیہ کی آفرینش جن کے سامنے عمل کا ایک نہیں کئی راستے ہوں اور ہر راستے کی اپنی اپنی قدر و قیمت ایک بہت بڑا خطرہ ہے، کیوں کہ ہم ان میں جس راستے کو چاہیں اختیار کر سکتے ہیں، اگر انسان خیر کا انتخاب کر سکتا ہے تو یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اس کی ضد یعنی شر کا انتخاب کر لے۔ لہٰذا اگر مشیت ایزدی یوں ہی تھی کہ اس طرح کا خطرہ برداشت کر لیا جائے تو اس کی یہ حقیقت بھی آشکار ہو جاتی ہے کہ خُدا کو اپنے بندوں پر کس قدر اعتماد ہے، اندریں صورت انسان کا بھی فرض ہے کہ اس اعتماد پر پورا اُترے۔'' (۱۳)

''اسلام نے عبادت کو اجتماعی شکل دے کر روحانی تجلیات میں بھی جو اجتماعی شان پیدا کر دی ہے اس پر ہمیں خاص طور پر توجہ کرنی چاہیے۔ روزمرہ کی صلوٰۃ باجماعت کے ساتھ ساتھ جب ہر سال مسجد حرام کے اردگرد مکہ معظّمہ میں حج کا منظر ہماری آنکھوں میں پھر جاتا ہے تو ہم کس خوبی سے سمجھ لیتے ہیں کہ اسلام نے اقامتِ صلوٰۃ کے ذریعے عالم انسانی کے اتحاد و اجتماع کا حلقہ کس طرح وسیع سے وسیع تر کر دیا ہے! لہٰذا دعا خواہ انفرادی ہو، خواہ اجتماعی ضمیرِ انسانی کی اس نہایت درجہ پوشیدہ آرزو کی ترجمان ہے کہ کائنات کے ہولناک سکوت میں وہ اپنی پکار کا کوئی جواب سنے۔ یہ انکشاف و تجسّس کا وہ عدیم المثال عمل ہے جس میں طالب حقیقت کے لیے نفیِ ذات ہی کا لمحہ اثباتِ ذات کا لمحہ بن جاتا ہے، اور جس میں وہ اپنی قدر و قیمت سے آشنا ہو کر بجا طور پر سمجھتا ہے کہ اس کی حیثیت کائنات کی زندگی میں سچ مچ ایک فعال عنصر کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نفسِ انسانی کی اس روش کے پیشِ نظر جو دُعا میں اختیار کی جاتی ہے، اسلام نے صلوٰۃ میں نفی و اثبات دونوں کی رعایت ملحوظ رکھی۔ مگر پھر یہ دیکھتے ہوئے کہ دعا یا عبادت کا تعلق دراصل انسان کے باطن اور ضمیر سے ہے اور اس لیے اس کی شکلیں بھی، جیسا کہ تاریخ سے ہمارے اس خیال کی تائید ہوتی ہے، مختلف ہیں۔ اسلام کا کہنا ہے:

لِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنسَكًا هُمْ نَاسِكُوهُ ۖ فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فِي الْأَمْرِ ۚ وَادْعُ إِلَىٰ رَبِّكَ ۖ إِنَّكَ لَعَلَىٰ هُدًى مُّسْتَقِيمٍ ۝ وَإِن جَادَلُوكَ فَقُلِ اللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُونَ ۝ اللَّهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فِيمَا كُنتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ (الحج: ۶۷-۶۹)

لہٰذا عبادت کی شکل کوئی ایسا مسئلہ نہیں جس سے ہم انسانوں میں بحث و نزاع کا دروازہ کھل جائے، کیوں کہ جہاں تک اس کی رُوح کا تعلق ہے یہ غیر ضروری سی بات ہے کہ اس میں ہم نے اپنا منہ کس طرف پھیرا۔ اسلام نے عبادت کے لیے ایک مخصوص سمت انتخاب کی تو محض اس لیے کہ جماعت کے اندر ایک قسم کے جذبات موجزن ہوں، بعینہٖ جس طرح اس کی ظاہری شکل سے مساوات اجتماعی کی حس بیدار ہوتی اور پرورش پاتی ہے کیوں کہ صلوٰۃ باجماعت سے مقصود ہی یہ ہے کہ شرکائے جماعت میں اپنے مرتبہ و مقام یا نسلی حیثیت کا کوئی احساس باقی نہ رہے۔

''نوعِ انسانی ایک ہے، اس لیے کہ وہ محیط بر کل ذات جس نے ہر شے کو اپنے دامن میں لے رکھا ہے جو ہر ''انا'' کی خالق اور اس کا سہارا ہے، ایک ہے۔ لہٰذا قرآن مجید نے نسل اور قوم اور شعوب و قبائل کی تقسیم کو تعارف کا ایک ذریعہ ٹھہرایا، اس کی وجہ بھی یہی ہے۔ حاصل کلام یہ کہ اسلام میں صلوٰۃ باجماعت حصول معرفت ہی کا سرچشمہ نہیں اس کی قدر و قیمت کچھ اس سے بھی بڑھ چڑھ کر ہے۔ صلوٰۃ باجماعت سے اس تمنا کا اظہار بھی مقصود ہے کہ ہم ان سب امتیازات کو مٹاتے ہوئے جو انسان اور انسان کے درمیان قائم ہیں، اپنی اس وحدت کی ترجمانی جو گویا ہماری خلقت میں داخل ہے اس طرح کریں کہ ہماری عملی زندگی میں اس کا اظہار سچ مچ ایک حقیقت کے طور پر کرنے لگے۔'' (۱۴)

''خُدا کے وجود کو عقلی طور پر ثابت کرنے کے لیے جو دلیلیں فلسفیوں نے پیش کر رکھی ہیں، ان کی تردید بھی عقل یا منطق کے اصول ہی کر دیتے ہیں۔ جہاں تک ایمان بالغیب کا تعلق ہے اس پر عقلی بحث ممکن نہیں، اس ضمن میں اقبال دو دلیلیں پیش کرتے ہیں۔'' (۱۵)

''ایک تو نہایت ہی ذاتی دلیل ہے جس کی بنیاد انھوں نے عشق (وجدان یا عرفان) پر اُستوار کر رکھی ہے۔ اقبالؒ کے نزدیک وجدان یا عرفان عقل ہی کی ایک لطیف یا اعلیٰ صورت ہے۔ اقبالؒ کہتے ہیں کہ عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے خُدا کا وجود ثابت ہوتا ہے۔ وہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو انسان کامل سمجھتے تھے۔ فرماتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے دشمن بھی امین تسلیم کرتے تھے۔ پس اگر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کہہ دیا کہ خُدا

ہے تو میرے لیے خُدا کے وجود کو ثابت کرنے کی خاطر یہی دلیل کافی ہے۔ ان کی دوسری دلیل فلسفیانہ ہے۔
اقبال کے نزدیک اگر عقل، مشاہدہ اور وجدان کو بیک وقت استعمال میں لایا جائے تو خُدا کا وجود ثابت ہوتا ہے،
(یعنی تینوں ذرائع علم ایک دوسرے کی تائید یا تصدیق بیک وقت استعمال میں لایا جائے تو خُدا کا وجود ثابت ہوتا
ہے)۔ اقبال نے یہ دلیل شاید فکرِ رومی سے متاثر ہو کر قائم کی ہے۔ مولانا رومی فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک ہر
وہ بات، جسے صرف میرا دماغ (عقل) یا میرے حواسِ خمسہ (مشاہدہ) قبول کریں اور میرا دل (وجدان) قبول
نہ کرے، جھوٹ ہے، حق وہی ہے جسے میرے دماغ اور حواس تو کیا میرا دل بھی قبول کرے۔'' (۱۶)

''ظاہر ہے باری تعالیٰ کے وجود کو تسلیم کرنے کے لیے اقبالؒ کے نزدیک کسی انسان کامل سے عشق
اشد ضروری ہے۔ خُودی محدود کا استحکام عشق کا جذبہ اپنانے سے ہوتا ہے اور جب عشق، عشق رسول ﷺ کی
صورت اختیار کر لے تو خُودی محدود کے لیے خُودی مطلق کا ادراک عین ممکن ہے۔ اگر خُودی محدود عشق کے اس
بلند یا اعلیٰ معیار تک پہنچ سکنے کے قابل نہیں جو اقبال نے قائم کر رکھا ہے تو اس ضمن میں انسان تینوں ذرائع تحصیل
علم کو بیک وقت استعمال میں لانے سے خُدا کے وجود کا قائل ہو سکتا ہے۔'' (۱۷)

اقبالؒ اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت قرآن مجید کی سورۂ نُور کی آیت ۳۵ کی روشنی میں کرتے ہیں۔
اللہ تعالیٰ اپنی ذات کے متعلق قرآن مجید میں فرماتے ہیں:

''اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے مثال اس نُور کی ایک طاق کی سی ہے، جس میں ایک چراغ کا شعلہ روشن ہو، ایسا
چراغ جو ایک شیشے کی قندیل میں پڑا ہوا اور قندیل گویا ایک چمکتا ہوا ستارہ ہو۔'' (۱۸)

''پس اقبال کے نزدیک اللہ کو ''شخصیت خالص'' ہونے کی حیثیت سے محدود کہنا درست نہیں۔
البتہ اسے جسم کے بغیر ایک مخصوص اور متعین وجود کہا جا سکتا ہے۔ اس سے گلہ شکوہ کیا جا سکتا ہے۔ اس سے جھگڑا
کیا جا سکتا ہے۔ اس سے گڑ گڑا کر مانگا جا سکتا ہے، وہ سب سنتا ہے، دیکھتا ہے اور دیتا ہے۔ اقبال کے ہاں
انسان کے راندۂ درگاہ ہونے کا تصور تو موجود ہے مگر منکر خُدا کا تصور موجود نہیں۔ اقبالؒ کے نزدیک خُدا، کائنات
وحیات کی تخلیق کے لیے جواہرِ خُودی کو عدم سے وجود میں لاتا چلا جا رہا ہے۔ اس اعتبار سے کائنات وحیات
بے حس وحرکت یا ناقابل تغیر و تبدل نہیں بلکہ اس میں مزید اضافے کے ذریعے وسعت کی گنجائش ہے۔'' (۱۹)

اقبالؒ کے خیال میں کائنات وحیات کا ہر جوہر دراصل خُودی ہی کی پست و بالا صورت ہے۔ مادے
کے ذرّات بقول خُودی کی پست یا ادنیٰ صورت ہے، جس میں سے خُودی کی بالا یا اعلیٰ صورت ذات انسانی میں
اپنے معراج کمال کو پہنچ جاتی ہے۔ ہر لحظہ نئے نئے جواہر عدم سے وجود میں لائے جاتے ہیں اور کائنات وحیات

میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اس جوہری عمل کی ذہنی تصویر قائم کر سکنا ممکن نہیں۔ اقبالؒ اپنے اس تصور کی تائید کے
لیے قرآنی سورہ الحجر ۲۱ پیش کرتے ہیں، جس میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

''یہاں ایک ہی چیز نہیں بلکہ ہمارے یہاں خزانے بھرے پڑے ہیں اور ہم ان کو نازل نہیں
کرتے مگر ایک مقررہ حد تک۔'' (۲۰)

''یہ کہا جا سکتا ہے کہ کائنات وحیات کی تشکیل کے متعلق اقبال کا تصور جوہری یا اٹامک ہے۔ ان
سے پیشتر اسلامی فلسفے میں اشاعرہ نے کچھ اسی قسم کا تصور پیش کر رکھا ہے۔ پس اشاعرہ، لائب منٹس اور اقبال کا
تخلیق کائنات وحیات کا نظریہ عہد حاضر کے طبعی علوم میں موجودہ رجحانات سے زیادہ قریب ہے۔'' (۲۱)

''فکرِ اقبال کا ایک دلچسپ پہلو انسان کی تخلیق اور خُدا سے اس کا تعلق ہے۔ اقبال کا انسان مسلسل
پیچ و تاب کھاتا ہوا، متجسس بے تاب، بے چین اور بے قرار رہتا ہے۔ اقبالؒ اسے خُدا کی طرح مگر محدود حد تک
ایک تخلیقی فعلیت سمجھتے ہیں، اس کی خُودی محدود کا اصل مقصد بھی انکشاف ذات یا جو ہر خُودی کی نمود ہے، اس لیے
لازم ہے کہ مسلسل تحقیق، تخلیق، اختراع اور ایجاد کے عمل میں منہمک رہے۔ اگر ایسا نہیں اور اس کی خُودی بے نمود
ہے تو اقبالؒ کے نزدیک اس کا وجود نہ ہونے کے برابر یا مشتبہ ہے۔'' (۲۲)

''اقبال انسان کی تخلیق کے متعلق قرآنی تفصیل کی اپنی تفسیر پیش کرتے ہیں اور یوں انجیل میں بیان
کردہ اس واقعہ سے امتیاز بھی واضح ہوتا ہے۔ مسیحی تعلیمات کے مطابق حوا کو آدم کی پسلی سے تخلیق کیا گیا۔
بعد ازاں حوا نے شیطان کی ترغیب پر آدم کو ممنوع پھل کھانے پر اُکسایا اور یوں خُدا کے حکم کی نافرمانی کرنے پر
دونوں بہشت سے نکال دیے گئے، پس انسان کی تخلیق کی ابتدا ہی گناہ ازلی کے ساتھ ہوئی۔ قرآنی تفصیل مختلف
ہے، یہاں ایسا کوئی ذکر نہیں کہ حوا کو آدم کی پسلی سے تخلیق کیا گیا۔ نہ یہ ذکر ہے کہ حوا نے شیطان کی ترغیب پر آدم
کو ممنوعہ پھل کھانے پر اکسایا۔'' (۲۳)

''اقبالؒ فرماتے ہیں کہ آدم کی نافرمانی اس کا پہلا ایسا فعل تھا جس میں اس نے اپنے اختیار انتخاب
کا حق استعمال کیا اور خُدا سے معافی مانگی جو قبول ہوئی۔ چوں کہ انسان اختیار انتخاب کے امتحان سے گزر چکا تھا
اس لیے خُدا نے اسے بلند مقام سے نچلے مقام پر آباد ہونے کی تلقین کی تاکہ وہ اپنی زندگی خُدا کے عطا کردہ علم
کے مطابق، اپنی قوت ارادہ کے بل بوتے پر اور نیکی و بدی کے معاملے میں اختیار و انتخاب کے حق کو استعمال
کرنے کی ذمہ داری کے ساتھ گزار سکے، سو انسان اس دنیا میں گناہ ازلی کی سزا کے طور پر نہیں آیا بلکہ روح ارضی
اس کا استقبال کرتی ہے اور توقع رکھتی ہے کہ وہ انکشاف ذات کے عمل کو جاری رکھے گا کیوں کہ اس کے وجود میں

لائے جانے کا مدعا ہی اس کی خُودی کی نمود ہے۔ اقبالؒ انسان کے تخلیقی عمل کو بہت اہمیت دیتے ہیں، یہاں تک کہ گناہ وثواب، بدی اور نیکی سب تخلیقی عمل کی کسوٹی ہی پر پرکھے جاسکتے ہیں۔'' (۲۴)

''اقبال کے ہاں انسان کا خُدا کی ذات میں فنا ہونے کا کوئی تصور نہیں۔ ایسا تصور صرف نفی ذات کے ذریعے یا وحدت وجود ہی میں ممکن ہے جس کے تحت قطرے کا منتہائے نظر سمندر میں گر کر فنا ہو جانا ہے۔ وحدت شہود کی صورت میں انسان کی خُدا تک رسائی ہی ممکن نہیں، یہ تصور بھی اقبال کو قبول نہیں۔ ان کے ہاں خُودی مطلق اور خُودی محدود میں من وتو کا امتیاز استغراقی کیفیت کے باوجود قائم رہتا ہے، جیسے آفتاب کی کرنوں کی ضیا موم بتی کے شعلے پر حاوی ضرور ہے مگر اسے فنا نہیں کرتی یا سمندر کی آغوش میں پانی کا قطرہ موتی کی صورت میں اپنا امتیاز قائم رکھتا ہے۔ اقبال کا انسان اپنی صلاحیتوں اور اپنے گرد ونواح کی قوتوں یا وسائل کے ذریعے کائنات کی تقدیر متشکل کرسکتا ہے نیز اس بتدریج تغیر پذیر سلسلہ عمل میں وہ خُدا کا معاون اور ہم کار بن سکنے کی اہلیت رکھتا ہے اور چوں کہ وہ ایک بہتر اور خوب تر عالم کا تصور کرسکتا ہے اس لیے موجود کو مطلوب میں بدلنے کی صلاحیت اور قدرت رکھتا ہے۔'' (۲۵)

''قرآن مجید نے انسان کو خلیفہ ارض اور نائب حق قرار دیا ہے، علامہ اقبالؒ کے نزدیک عظمت انسانی کے تصور کا سرچشمہ یہی قرآنی حقیقت ہے۔'' (۲۶)

''علامہ اقبالؒ کے افکار کے عمیق مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ان کے فکر کا مرکز ومحور تعمیر آدمیت ہے، ظاہر ہے کوئی نظام فکر، انسان کے بغیر نہ تو عملی صورت اختیار کرسکتا ہے اور نہ اعلیٰ ترین مقاصد حاصل کرسکتا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے اپنے فلسفہ خُودی کے ذریعے انسان کو کائنات میں اس کے مقام اور مرتبے سے آگاہ کیا اور اس بات کا احساس دلایا کہ انسان کائنات میں اللہ تعالیٰ کا خلیفہ بن کر آیا ہے۔ لہٰذا اسے انسانی عظمت کے بلند مرتبے کو قائم رکھنے اور اس کے تمام تقاضے پورے کرنے کے لیے اپنی تمام تر کوششوں کو بروئے کار لانا چاہیے۔'' (۲۷)

''اللہ تعالیٰ نے کن اور فیکون کے عمل سے ساری کائنات تخلیق فرمائی پھر اس کائنات میں اپنا نائب مقرر کرنے کے لیے آدم کو تخلیق کیا اور ساری کائنات کو اس کا مطیع کر دیا۔ انسان کا دل چاہے تو کائنات کی ہر شے پر دسترس حاصل کرسکتا ہے کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کے سینے میں علم حقائق الاشیا منتقل کر دیا جس کے بغیر وہ خلافت الٰہی کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ نہیں ہوسکتا تھا۔ علم ہی انسانی خُودی کا وہ کرشمہ ہے جس کے باعث اس کی قوتوں اور تصرفات کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔'' (۲۸)

علامہ اقبال نظام کائنات میں انسان کا اعلیٰ وارفع مقام متعین کرنے کے باوجود ذوقِ تحسین کے تحت اس قسم کے خیالات کے ذریعے انسانی ارتقا پر روشنی ڈالتے ہیں:

کوئی اب تک نہ یہ سمجھا کہ انساں
کہاں جاتا ہے، آتا ہے کہاں سے؟
(۲۹)

خِرد مندوں سے کیا پوچھوں کہ میری ابتدا کیا ہے
کہ میں خود اس فکر میں رہتا ہوں، میری انتہا کیا ہے
(۳۰)

اگر مقصودِ کل میں ہوں تو مجھ سے ماورا کیا ہے؟
مرے ہنگامہ ہائے نو بہ نو کی انتہا کیا ہے؟
(۳۱)

علامہ اقبال کے نزدیک کائنات کی تخلیق محض اس مقصد کے پیش نظر ہوئی ہے کہ انسانی خُودی کے ظہور اور اس کی تکمیل کے لیے زمین تیار کی جائے۔

''بقول ''جگن ناتھ آزاد'' کائنات اگر ایک تمثیل ہے تو انسان اس تمثیل کا عظیم ترین کردار۔ انسان ایک ایسی کتاب ہے جس میں کائنات کی حیثیت محض ایک دیباچے کی ہے۔ انسان کے بغیر کائنات بالکل ایسی ہی ہے جیسے ہملٹ پرنس آف ڈنمارک کے بغیر۔'' (۳۲)

''اللہ تعالیٰ نے مادے سے کائنات کو تخلیق کیا اور انسان بھی مادے سے جہانِ دیگر تخلیق کرتا ہے اور کائنات کو مکمل کرتا ہے، انسان جس قدر کائنات کے غیر منظم حصّہ میں ربط پیدا کرتا ہے اس حد تک اس کو عمل تخلیق میں شامل قرار دیا جاسکتا ہے۔'' (۳۳)

''خُدا نے انسان کو کائنات میں سب سے زیادہ اہمیت دی ہے کیوں کہ خُدا کا مخاطب بھی انسان ہے اور خُدا کا مطلوب ومقصود بھی انسان ہے۔ کائنات تو صرف ایک ذریعہ ہے ان منزلوں کو طے کرنے کا جن کی تکمیل کے بعد انسان خُدا تک پہنچتا ہے یا یوں کہہ لیجیے کہ انسان کائنات کے راز ہائے سربستہ میں سے اپنی کوشش اور ذوق جستجو کے ذریعے خُدا کو تلاش کرسکتا ہے۔'' (۳۴)

''خُدا اور انسان کے درمیان یہی خاص تعلق علامہ اقبالؒ کے فلسفہ خُودی یا فلسفہ حیات کا بنیادی نکتہ

ہے کہ خُدا جو کائنات کا مالک و خالق ہے، انسان سے، جو کائنات کا اہم ترین حصہ ہے، اس کی تقدیر کے بارے پوچھے لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ انسان اپنے مقام سے بھی آگاہ ہو اور اپنی صلاحیتوں کو عالم رنگ و بو تک محدود کرنے کے بجائے جہاں دیگر تلاش کرے اور پیدا بھی کرے۔'' (۳۵)

''مختصر یہ کہ انسان نظام کائنات میں ایک اہم ترین ہستی ہے اور ساری کائنات اس کی دسترس میں ہے اسے چاہیے کہ اپنی تخلیق کے مقاصد کو پورا کرنے کے لیے اپنی شخصیت یا انا یا خُودی کو مضبوط کرے اور اس مضبوط اور طاقت ورخُودی کے زور سے تکمیل کائنات اور تسخیر کائنات کے عمل کو مکمل کرتا ہوا اُس ذات مطلق تک رسائی حاصل کرے، جس نے انسان کو دنیا میں اپنا نائب بنا کر بھیجا، نیابت الٰہی کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے انسان کو عشق، مقاصد آفرینی اور سخت کوشی جیسے فضائل کا حامل ہونا چاہیے۔ اسی طرح وہ امن وسکون جیسے اہم مقاصد حاصل کر کے اتحاد عالم کو یقینی بنا سکتا ہے اور انسانی ترقی اور بقا کے امکانات کو وسیع تر کر سکتا ہے اور تسخیر کائنات سے علامہ اقبال کا وسیع تر مدعا بھی یہی ہے، یہ صورت حال پیدا ہو جائے تو علامہ اقبال کے خیالات میں انسان عظمت و فضیلت سے ہم کنار ہوتا ہے۔'' (۳۶)

''اقبال فرماتے ہیں کہ خُدا اور انسان کا رابطہ فنا و اتحاد سے نہیں، بلکہ نماز و دعا سے قائم ہوتا ہے، دعا و نماز خالق اور مخلوق کے درمیان فاصلے کو ختم کر دیتی ہے اور انسانی رُوح نہ صرف ایک تخلیقی تقدیر سے بہرہ مند ہوتی ہے بلکہ حضورِ خُداوندی میں اپنی استواری اور پائیداری بھی دکھا سکتی ہے۔'' (۳۷)

ڈاکٹر سیّد عبداللہ ''مطالعۂ اقبالؒ کے چند نئے رخ'' میں رقمطراز ہیں:

''افراد صاحب یقین و اعتماد تبھی بن سکتے ہیں جب انھیں اپنے منصب کا گہرا شعور ہو، وہ تعلق باللہ کی گہری تصدیق قلبی رکھتے ہوں اور مقدس تکون (خُدا، کائنات اور انسان) کے باہمی ربط کو ناگزیر سمجھ کر زندگی کو تفریق و تجزیہ کے بجائے اسے سالم اور کل کے طور پر دیکھتے ہوں۔ وہ یومنون بالغیب ہوں اور دنیا کو اس کے تابع، با مقصد اور بامعنی بناتے ہوں، وہ خُدا کو مکلّف اور ذمہ دار مانتے اور کائنات کو خُدا کی کتاب سمجھ کر عقبیٰ و آخرت میں اعتقاد رکھتے ہوں اور خُدا کی حکمتوں کے عملی شارح اور اوصاف خُداوندی کا عمل نمانہ بن جائیں۔ اس منزل کی طرف رہنمائی عقل محض نہیں کر سکتی، اس کے لیے ذوقی و رُوحانی تجربہ (ایمان) درکار ہے جو تصدیق کے بعد ذکر و فکر سے جلا پاتا ہے۔ قرآن مجید کی رہنمائی یہی آیات اس کی گواہی دیتی ہیں۔'' (۳۸)

إِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ
لَاٰيَاتٍ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى

جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ رَبَّنَا مَا
خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ . (آل عمران:۱۹۰، ۱۹۱)

ترجمہ: بے شک آسمان اور زمین کی پیدائش اور رات دن کے بدل بدل کر آنے جانے میں عقل والوں کے لیے نشانیاں ہیں جو کھڑے اور بیٹھے اور لیٹے (ہر حال میں) خُدا کو یاد کرتے اور آسمان اور زمین کی پیدائش میں غور کرتے (اور کہتے) ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! تو نے اس مخلوق کو بے فائدہ نہیں پیدا کیا۔ تو پاک ہے، تو ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچائیو!

خُدا اور کائنات سے انسان کا رابطہ

''قرآن مجید کا حقیقی مقصد تو یہ ہے کہ انسان اپنے اندر گوناگُوں روابط کا ایک اعلیٰ اور برتر شعور پیدا کرے جو اس کے اور کائنات کے درمیان قائم ہیں۔ اقبالؒ کہتے ہیں کہ گوئٹے بھی اس بات کا قائل تھا کہ اسلام کا یہ نظامِ انتہائی ترقی یافتہ اور جامع و مکمل ہے جو کبھی ناکام نہیں رہ سکتا۔ قرآن مجید نے دین و دُنیا، مذہبی عقاید اور تہذیب و تمدن کے درمیان روابط کو واضح اور متعین کیا اور ان دونوں کے درمیان پیدا کیے ہوئے اختلاف اور تضاد کو ختم کر دیا۔ کائنات کو انسان کے لیے مسخّر و مملوک اور تابع و خادم بنا دیا۔ انسان کو عظمت عطا کی اسے نیابتِ الٰہیہ کا منصب دیا اور اسے شوق ارتقا دے کر خلاّقی و قہاری و جبّاری و غفّاری اور تقدیس کردار پیدا کر کے اپنے آپ کو معراج کی بلندیوں تک پہچانے کی راہ سمجھا دی۔'' (۳۹)

''اقبالؒ کہتے ہیں کہ اسلام کے نزدیک عالم رُوحانی عالم مادی سے بے تعلق نہیں ہے اور انفس و آفاق ایک حقیقت کے دو رُخ ہیں۔ ''ھو الظاھر وھو الباطن'' وہ ظاہر بھی ہے اور باطن بھی، خارجی قوتیں بھی رُوحانی قوتوں کے مظاہر ہیں اور ان میں کوئی اختلاف یا تضاد نہیں ہے۔ خارجی عالم سے بے تعلقی کا نتیجہ ترک دنیا اور رہبانیت کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے جو انسانی مقاصد کے خلاف ہے۔ اس سے ارتقائے انسانی میں رکاوٹ اور حیات متحرکہ میں جمود پیدا ہوتا ہے۔

قرآن مجید کے مطابق یہ کائنات عبث تخلیق نہیں کی گئی۔ یہ کوئی بے مقصد اور فضول کھیل تماشا نہیں بلکہ زندگی ایک با مقصد چیز ہے اور انسان کو علم اشیاء، شعور ذات، عرفان حق اور ذوق ارتقا کے ساتھ نیابت الٰہی کا منصب عظیم عطا کیا گیا ہے اور اسے کائنات کو اپنے مقاصد جلیلہ کے لیے استعمال کرنے کی قوت دی گئی ہے۔

اقبالؒ کہتے ہیں کہ خُداوند تعالیٰ نے انسان کو ایسی قوتیں عطا کی ہیں جو اس پوری کائنات میں کسی

اورمخلوق کے پاس نہیں ہیں اوراس وجہ سے انسان کے کندھوں پرغیر معمولی ذمہ داری آپڑتی ہے۔

"قرآن پاک نے انسان کی ابتداتو بتائی ہےلیکن اس کی کوئی انتہا مقرر نہیں کی۔وہ ایمان اورعمل سے عالمِ ہستی کا ایک مستقل اور ابدی حصہ بن سکتا ہے اور اس کا عمل پیہم اور جہدِ مسلسل اسے لازوال بنا سکتا ہے۔جب انسان کواپنی حقیقت معلوم ہوجائے اوراس پراس کی خُودی روشن ہوجائے تو اس کے اندرغیر معمولی صلاحیتیں اُبھرتی ہیں اوراس کی رُوح سے زیادہ طاقتورکوئی اور چیز نہیں ہوتی۔

اقبالؒ کے نزدیک کائنات کومسخر کرنے اور نیابت الٰہی کے منصب پر فائز ہونے کے لیے حسی ادراک اوررُوحانی وجدان کے ذریعےقوت تسخیر وتخلیق پیدا کرنا انسان کا فرض منصبی ہے۔

''اقبالؒ کہتے ہیں کہ مادی قوتوں پرغلبہ حاصل کرنا ہی انسان کامقصود نہیں ہے بلکہ اس طرح اسے ایسی بلندی حاصل ہوتی ہےاوروہ ایسی ماورائی قوتوں کا عرفان حاصل کرلیتا ہے کہ اس کا اگلا قدم خود بخود رُوحانی عظمتوں کے حصول کی طرف اٹھتا ہے''تخلقو باخلاق اللہ'' کے مطابق وہ اپنے اندر خُدائی صفات پیدا کرنے کی سعی کرتا ہےاورعبدرہتے ہوئے وہ اللہ کا ہاتھ بن جاتا ہے۔''(۴۰)

اقبالؒ''زبورعجم''میں لکھتے ہیں:

چناں با ذات حق خلوت گزینی　　ترا اُو بیند و او را تو بینی
بخود محکم گزر اندر حضورش　　مشو ناپید اندر بحرِ نُورش
چناں در جلوہ گاہِ یار می سوز　　عیاں خود را نہاں او را بر افروز

(۴۱)

اقبال فرماتے ہیں کہ اے انسان! اللہ تعالیٰ سے اس قدرخلوت حاصل کرلے اورحق سے اس قدر قریب ہوجا کہ تجھے وہ دیکھے اورتو اس کے حسن کا نظارہ کرےلیکن حق پیوستگی کا یہ مطلب نہیں کہ اپنی ہستی کوفنا کر دے بلکہ خُدا کے حضور اپنی خُودی کو قائم رکھ اور اس کے نُور سے منوّر ضرور ہولیکن اس کے نُور کے سمندر میں ڈوب نہ جانا(جس طرح موج سمندر میں رہ کر اپنا وجود برقرار رکھتی ہے)اس طرح نُور کے سمندر میں اپنا وجود برقرار رکھے۔خُدا کی جلوہ گاہ میں اپنے آپ کواس طرح جلا کرنُورحق کی شمع بھی جل اُٹھے اورخود تیری لوبھی ٹمٹماتی رہے،ذرے میں چمک نہ ہوتوسورج کی ضوفشانی بےکار ہے۔

حواشی

۱۔نواب عالم بارہوی،کرنل،سیّد،بصیرت اقبالؒ(راولپنڈی:پیپ بورڈ پرنٹرز ۱۹۹۰ء)ص:۱۰۱

۲۔محمداقبال،علامہ،کلیاتِ اقبال(لاہور:غلام علی پبلشرز،۱۹۷۵ء)ص۔۳۱۹

۳۔نواب عالم بارہوی،کرنل،سیّد،بصیرت اقبالؒ(راولپنڈی:پیپ بورڈ پرنٹرز ۱۹۹۰ء)ص:۱۰۲

۴۔محمداقبال،علامہ،کلیاتِ اقبال(لاہور:غلام علی پبلشرز،۱۹۷۵ء)ص۔۵۱۷

(۵)۔علامہ اقبال کے بنیادی افکارونظریات،کورس کوڈ:۷۰۲

(اسلام آباد:علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی،۲۰۰۴ء)ص:۴۴

(٦)۔علامہ اقبال کے بنیادی افکارونظریات،کورس کوڈ:۷۰۲

(اسلام آباد:علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی،۲۰۰۴ء)ص:۴۴

(۷)۔نذیر نیازی،سیّد،تشکیل جدیدالٰہیات اسلامیہ،(لاہور:بزم اقبال،۲۰۱۰ء)ص:۱۱۸

(۸)۔نذیر نیازی،سیّد،تشکیل جدیدالٰہیات اسلامیہ،(لاہور:بزم اقبال،۲۰۱۰ء)ص:۱۲۱

(۹)۔۔نواب عالم بارہوی،کرنل،سیّد،بصیرت اقبالؒ(راولپنڈی:پیپ بورڈ پرنٹرز ۱۹۹۰ء)ص:۱۰۳

(۱۰)۔نذیر نیازی،سیّدتشکیل جدیدالٰہیات اسلامیہ،(لاہور:بزم اقبال،جون ۲۰۱۲ء)ص:۳۸

(۱۱)۔نذیر نیازی،سیّدتشکیل جدیدالٰہیات اسلامیہ،(لاہور:بزم اقبال،۲۰۱۰ء)ص:۱۲۷،۱۲۸

(۱۲)۔نذیر نیازی،سیّد،تشکیل جدیدالٰہیات اسلامیہ،(لاہور:بزم اقبال،۲۰۱۰ء)ص:۱۳۵

(۱۳)۔نذیر نیازی،سیّد،تشکیل جدیدالٰہیات اسلامیہ،(لاہور:بزم اقبال،۲۰۱۰ء)ص:۱۴۰

(۱۴)۔نذیر نیازی،سیّد،تشکیل جدیدالٰہیات اسلامیہ،(لاہور:بزم اقبال،۲۰۱۰ء)ص:۱۴۷تا۱۴۹

(۱۵)۔جاویداقبال،ڈاکٹر،افکاراقبال(لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۵ء)ص:۵۷

(۱٦)۔جاویداقبال،ڈاکٹر،افکاراقبال(لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۵ء)ص:۵۸

(۱۷)۔جاویداقبال،ڈاکٹر،افکاراقبال(لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۵ء)ص:۵۸

(۱۸)۔جاوید اقبال، ڈاکٹر، افکار اقبال (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء)ص:۵۹
(۱۹)۔جاوید اقبال، ڈاکٹر، افکار اقبال (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء)ص:۶۰
(۲۰)۔جاوید اقبال، ڈاکٹر، افکار اقبال (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء)ص:۶۱
(۲۱)۔جاوید اقبال، ڈاکٹر، افکار اقبال (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء)ص:۶۱
(۲۲)۔جاوید اقبال، ڈاکٹر، افکار اقبال (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء)ص:۶۱
(۲۳)۔جاوید اقبال، ڈاکٹر، افکار اقبال (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء)ص:۶۲
(۲۴)۔جاوید اقبال، ڈاکٹر، افکار اقبال (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء)ص:۶۲
(۲۵)۔جاوید اقبال، ڈاکٹر، افکار اقبال (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء)ص:۶۳
(۲۶)۔عبدالشکور احسن، اقبال کی فارسی شاعری کا تنقیدی جائزہ (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۰۰ء)ص:۲۹۶
(۲۷)۔منیر احمد یزدانی، پروفیسر، شعور اقبال (لاہور: ادبستان، جولائی ۲۰۰۱ء)ص:۱۴۸
(۲۸)۔منیر احمد یزدانی، پروفیسر، شعور اقبال (لاہور: ادبستان، جولائی ۲۰۰۱ء)ص:۱۴۸
(۲۹)۔محمد اقبال، علامہ، کلیات اقبال (اردو) (لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۷۹ء)ص:۹۹
(۳۰)۔محمد اقبال، علامہ، کلیات اقبال (اردو) (لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۷۹ء)ص:۳۴۷
(۳۱)۔محمد اقبال، علامہ، کلیات اقبال (اردو) (لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۷۹ء)ص:۶۹۲
(۳۲)۔رسالہ نقوش اقبال نمبر شمارہ:۲۱ ستمبر ۱۹۷۷ء، ص:۲۷۷ بحوالہ شعور اقبال، ص:۱۵۴
(۳۳)۔رسالہ نقوش اقبال نمبر شمارہ:۲۱ ستمبر ۱۹۷۷ء، ص:۲۷۷ بحوالہ شعور اقبال، ص:۱۵۴
(۳۴)۔عبدالحکیم، خلیفہ، فکر اقبال (لاہور: بزم اقبال، ۱۹۶۸ء)ص:۴۴۴
(۳۵)۔منیر احمد یزدانی، پروفیسر، شعور اقبال (لاہور: ادبستان، جولائی ۲۰۰۱ء)ص:۱۵۷
(۳۶)۔منیر احمد یزدانی، پروفیسر، شعور اقبال (لاہور: ادبستان، جولائی ۲۰۰۱ء)ص:۱۵۸
(۳۷)۔این میری شمل، ڈاکٹر، شہپر جبریل، مترجم محمد ریاض، ڈاکٹر (لاہور: گلوب پبلشرز، ۱۹۸۵ء)ص:۳۸۲
(۳۸)۔عبداللہ، سیّد، ڈاکٹر، مطالعۂ اقبال کے چند نئے رخ (لاہور: بزم اقبال: نومبر ۱۹۹۹ء)ص:۹۱
(۳۹)۔نذیر نیازی، سیّد، تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، (لاہور: بزم اقبال، ۲۰۱۰ء)ص:۴۵
(۴۰)۔نواب عالم بارہوی، کرنل، سیّد، بصیرت اقبالؒ (راولپنڈی: پیپ بورڈ پرنٹرز ۱۹۹۰ء)ص:۱۰۵،۱۰۶
(۴۱)۔حمید اللہ شاہ ہاشمی، پروفیسر، شرح کلیات اقبال فارسی (لاہور: مکتبہ دانیال۔ن۔د)ص:۶۳۰

علامہ اقبالؒ اور عشقِ ختم المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

کی محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

حکیم الامت، امام العصر، مجددِ عصر، نباض زمانہ، حسان الہند، مفکرِ ملّت علامہ اقبالؒ جنھوں نے اپنی فقید المثال کلام سے اور ایمان افروز فکرِ اجتہاد سے بالعموم مسلمانانِ عالم کو اور بالخصوص مسلمانانِ ہند کو خواب غفلت سے بیدار کیا۔ علامہ اقبالؒ نے اپنی شاعری کے ذریعے گری ہوئی انسانیت کو اُبھارا اور اسے نئی جلا بخشی۔ شاعرانہ خوبیاں اللہ تعالیٰ کی دین ہیں۔ ہر عالم شاعر نہیں ہوتا اور نہ ہی ہر شاعر مفکر ہوتا ہے۔

علامہ اقبالؒ اپنے کلام کے ہر شعر میں زندگی آمیز اور زندگی آموز پیغام رکھتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ان کا پیغام بُت کدوں میں توحید کی آواز بن کر گونجتا ہے۔ علامہ اقبالؒ فلسفی شاعر ہیں۔ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے اقبالؒ کے عشق کی بنا ذہنی قرب تھا۔ علامہ اقبالؒ کا کوئی بھی مجموعہ ملاحظہ کرلیں ان کے مکاتیب پر نظر دوڑا لیں، ان کے ملفوظات کا مطالعہ کرلیں، ان کے پاس اٹھنے بیٹھنے والوں سے ان کے شب و روز کے بارے میں پوچھیں تو ہمیں ان کی محسنِ انسانیت مولائے کل، آقائے دو جہاں سرور کائنات ختم المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے والہانہ عقیدت و عشق کی مختلف صورتیں نظر آتی ہیں۔ اقبالؒ کی شاعری میں کمالِ انسانی کا اعلیٰ ترین مظہر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیست ہے۔

''علامہ اقبالؒ کی شاعری کا مرکز انسانی فضیلت کی تفسیر و تعبیر ہے اور اس تفسیر و تعبیر کی اساس کلام الٰہی کے اس ارشاد پر ہے کہ انسان کائنات کا بلند ترین مظہر ہے۔ علامہ اقبالؒ بار بار فرمایا کرتے تھے کہ وہ

مسائل جن کو حکما اور فلسفیوں نے سالوں کے اندر غور و فکر سے حل کیا ہے اُن کو محمد عربی ﷺ کے وجدان نے لمحوں اور ثانیوں میں سمجھ لیا ہے۔ ڈاکٹر صاحبؒ جو خود مشرقی اور مغربی فلسفہ کے بحرِ محیط کے شناور تھے اور ہر ایک مسئلہ کو عقل کے ترازو میں تولتے تھے، عرب کے بادیہ نشین کے وجدان پر جو سیاسی اور بین الاقوامی، معاشرتی اور ثقافتی، فنی اور علمی مسائل کی گتھیوں کو لمحے بھر میں اپنے وجدان سے سُلجھا کر رکھ دیتا تھا۔

"No thing in the World shocked the mind of Prophet (Peace Be Upon Him)"

جُوں جُوں عمر گزرتی گئی اقبالؒ کا پیغمبر ﷺ سے عشق کا جذبہ بھی ترقی کرتا گیا اور زندگی کے آخری دور میں تو یہ حالت ہو گئی تھی کہ وہ سوزِ دروں سے پارے کی طرح بے قرار رہتے تھے۔ ان کا ادراک، عقل، ذہنی بلندی اور غور و فکر سب جذبہ عشقِ محمد ﷺ کے سامنے سرنگوں ہو چکے تھے اور ان کی کیفیت ہو بہو یہی تھی۔''

ذکر و فکر و علم و عرفانم توئی
کشتی و دریا و طوفانم توئی

ترجمہ: ''اے میرے آقا ﷺ! میرا ذکر، فکر، علم اور عرفان سب کچھ آپ ﷺ ہیں۔ میری منزل تک پہنچانے والی کشتی، دریا، طوفان اور منزل بھی آپ ﷺ ہی ہیں۔''

''علامہ اقبالؒ کے ہاں ہمیں نعت کا روایتی انداز نہیں ملتا، ''شکوہ'' اور ''جوابِ شکوہ'' میں نعت کا انداز بہت ہی جداگانہ ہے۔ اس طرح اس زمانے کی تخلیق ''حضورِ رسالت مآب ﷺ میں'' ایک اعلیٰ تاثیر کی حامل منفرد نظم ہے۔ یہ اگرچہ نعت نہیں مگر حُبِّ رسول ﷺ کے جذبے سے سرشار دلوں کو تڑپانے والی شاعری ہے۔ بیسویں صدی کے دُوسرے عشرہ میں جب طرابلس پر اٹلی نے حملہ کیا تو بہت سے مُسلمان شہید ہوئے۔ اس سے برصغیر کے مسلمانوں کے دلوں میں زبردست تحریک ہوئی۔ اقبالؒ نے بھی اس سے گہرا اثر لیا چناں چہ نظم کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

گراں جو مجھ پہ ہنگامۂ زمانہ ہوا
جہاں سے باندھ کے رختِ سفر روانہ ہوا
قیودِ شام و سحر میں بسر تو کی لیکن
نظامِ کہنۂ عالم سے آشنا نہ ہوا
فرشتے بزمِ رسالت میں لے گئے مجھ کو
حضورِ آیہ رحمت ﷺ میں لے گئے مجھ کو

چناں چہ شاعر جب دنیا سے رخصت ہو کر عالمِ خیال و تصور میں دربارِ رسالت ﷺ میں پہنچتا

ہے۔ تو حضور ﷺ اس سے پوچھتے ہیں:

نکل کے باغِ جہاں سے برنگِ بُو آیا
ہمارے واسطے کیا تُحفہ لے کے تُو آیا

اقبالؒ جواباً عرض کرتے ہیں:

حضور ﷺ! دہر میں آسودگی نہیں ملتی
تلاش جس کی ہے وُہ زندگی نہیں ملتی
ہزاروں لالہ و گل ہیں ریاضِ ہستی میں
وفا کی جس میں ہو بُو، وہ کلی نہیں ملتی
(۱)

مولانا عبدالسّلام ندوی ''اقبالِ کامل'' میں لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر صاحب کی شاعری محبت وطن اور محبت قوم سے شروع ہوتی ہے اور محبتِ الٰہی اور محبتِ رسول ﷺ پر اس کا خاتمہ ہوا۔''(۲)

مولانا عبدالمجید سالک ''ذکرِ اقبال'' میں رقمطراز ہیں:

''وہ مشرق و مغرب کے علوم و معقول پر حاوی تھے۔ یورپ میں فلسفہ کے متعلق کوئی قابل ذکر تصنیف شائع ہوئی ہوتی تو فوراً اُن کی خدمت میں پہنچ جاتی تھی۔ مذہب و تاریخ اور عمرانیات کا کوئی مسئلہ ایسا نہ تھا جس پر انھوں نے انتہائی دقتِ نظر صرف نہیں کی۔ لیکن اس کے باوجود ان کے گداز قلب اور رقتِ احساس کا یہ عالم تھا کہ جہاں حضور سرورِ کون و مکان کی رفاقت و رحمت یا حضور ﷺ کی سروری کائنات کا ذکر آتا، علامہ اقبالؒ کی آنکھیں اشکبار ہو جاتی تھیں اور دیر تک طبیعت نہ سنبھلتی تھی۔ وہ حضور ﷺ کی ذات کو سب سے اعلیٰ سمجھتے تھے اور حقیقتاً اس حقیقت کو مانتے تھے۔ آپ ایسی سیر حاصل بحث فرماتے کہ کسی مخالفت کو بھی ان کے انسان کامل ہونے پر کوئی گنجائش باقی نہ رہتی تھی۔''(۳)

قُوّتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دے
دہر میں اسمِ محمد ﷺ سے اجالا کر دے

علامہ اقبالؒ کی شاعری میں عشقِ رسول ﷺ کا جذبہ بھی موجزن نظر آتا ہے اسی پیکر ہدایت کا درس اقبالؒ نے اپنی اردو اور فارسی شاعری میں دہرایا ہے انھی کے اُسوہ حسنہ کا سہارا لیا ہے۔ اسی دُرِ نایاب کی

دمک سے اپنے اشعار کو چمکایا ہے اسی کی پُرسوز لے میں ملّت اسلامیہ کو اپنے نغمات سنائے ہیں اور اسی کی تقلید میں اقبالؒ نے مخلوق خُدا سے بھی محبت کا اظہار کیا ہے

خُدا کے عاشق تو ہیں ہزاروں بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے
میں اس کا بندہ بنوں گا جس کو خُدا کے بندوں سے پیار ہو گا
(نظم۔ مارچ ۱۹۰۷ء۔ بانگ درا)

فقیر سیّد وحید الدین ''روزگارِ فقیر'' حصہ اوّل میں لکھتے ہیں:

''ذات رسالت مآب کے ساتھ انھیں جو والہانہ عقیدت تھی اس کا اظہار ان کی چشم نمناک اور دیدۂ تر سے ہوتا تھا۔''(۴)

فقیر سیّد وحید الدین کی گواہی ہے کہ

''ڈاکٹر صاحب کا دل عشق رسول ﷺ نے گداز کر دیا تھا۔ زندگی کے آخری زمانے میں تو یہ کیفیت ہو گئی تھی کہ آنحضرت ﷺ کا ذکر آ جاتا تھا تو ڈاکٹر صاحب کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلتے تھے۔''(۵)

''علامہ اقبالؒ کے انتقال سے چند دن پہلے مولانا غلام مرشد زیارت کے لیے گئے تو دیکھا کہ علامہ کے لبوں سے حضور ﷺ کا ورد جاری تھا اور ان کی نگاہیں اشک بار تھیں۔''(۶)

'' فقیر سیّد وحید الدین لکھتے ہیں کہ ایک دفعہ انھیں مضطرب دیکھ کر حکیم احمد شجاع نے وجہ دریافت کی تو انھوں نے کہا: ''احمد شجاع میں یہ سوچ کر اکثر مضطرب اور پریشان ہو جاتا ہوں کہ کہیں میری عمر رسول اللہ ﷺ کی عمر سے زیادہ نہ ہو جائے'' خُدا نے اس عاشق رسول ﷺ کی اس تمنا اور دعا کو قبول فرمایا یعنی اقبالؒ 61 برس کی عمر میں فوت ہوئے۔''(۷)

''باعثِ تخلیقِ دو جہاں ﷺ سے عشق و محبت کا یہ جذبہ اقبالؒ کے رگ و پے میں یوں سرایت کر گیا تھا کہ حضور ﷺ کی تعریف کرتے کرتے تو روتے ''سرکار کا ذکر سنتے تو کیفیت طاری ہو جاتی اور پروفیسر یوسف سلیم چشتی کہتے ہیں کہ جب عاشقان رسول ﷺ کا تذکرہ آتا تو اس وقت بھی آبدیدہ ہو جاتے۔''(۸)

فقیر سیّد وحید الدین کہتے ہیں کہ جب علامہ اقبالؒ گول میز کانفرنس سے واپس آئے تو میرے والد نے انھیں کہا کہ کیا ہی اچھا ہوتا کہ واپسی پر روضۂ اطہر کی زیارت سے بھی آنکھیں نُورانی کر لیتے یہ سنتے ہی ان کی حالت دِگرگوں ہو گئی۔ چہرے پر زردی چھا گئی اور آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ چند لمحے تک یہی کیفیت

رہی پھر کہنے لگے۔ ''فقیر میں کس منہ سے روضہ اطہر پر حاضر ہوتا۔''(۹)

کبھی اقبالؒ اپنے آپ سے نظر ہٹا کر سرکار کے کرم پر نگاہ کرتے ہیں تو دراقدس پر حاضری کی تمنا کو زبان دے دیتے ہیں۔ سیّد غلام میراں شاہ کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں کہ ''میں تو اس قابل نہیں ہوں کہ حضور ﷺ کے روضہ اطہر پر یاد بھی کیا جاؤں تاہم حضور ﷺ کے اس ارشاد سے جرات ہو جاتی ہے کہ فرمایا الطالح لی (گنہگار میرے لیے ہے)۔''(۱۰)

میر غلام بھیک نیرنگ علامہ اقبالؒ کے سرکار سے قلبی تعلق کے پیشِ نظر اور حضور ﷺ کے ذکر میں ان کی دگرگوں حالت کے حوالے سے کہتے ہیں:

''میں نے اس کے سامنے تو نہیں مگر خاص لوگوں سے بطور راز ضرور کہا کہ اگر حضور ﷺ کے مرقدِ پاک پر حاضر ہوں گے تو زندہ واپس نہیں آئیں گے وہیں جان بحق ہو جائیں گی۔''(۱۱)

''پس چہ باید کرد اے اقوام شرق'' میں علامہ محمد بند سیّد لوھیریؒ کے حوالے سے اقبالؒ بارگاہ رسول مقبول ﷺ میں صحت طلبی کے لیے لب کھولتے ہیں۔

چوں بصیری از تو می خواہم کشود
تا بہ من باز آید آں روزی کہ بود

''بال جبریل'' میں اقبال فلسفۂ معراج پر خامہ فرسائی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

سبق ملا ہے یہ معراج مصطفیٰ ﷺ سے مجھے
کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں

علامہ اقبالؒ میں عشق رسول ﷺ کے جذبے کی شدت جب انتہا کو چھوتی ہے تو یہ انداز اختیار ہوتا ہے۔

تیری اُلفت کی اگر نہ ہو حرارت دل میں — آدمی کو بھی میسر نہیں انسان ہونا
یہ شہادت گہِ اُلفت میں قدم رکھنا — لوگ آسان سمجھتے ہیں مُسلماں ہونا
قابِ قوسین بھی، دعویٰ بھی عبودیت کا — کبھی چلمن کو اٹھانا، کبھی پنہاں ہونا
یہ اسلام ہے میرا، یہی ایماں میرا — تیرے نظارۂ رخسار سے حیراں ہونا

راہِ مصطفیٰ ﷺ سے ہٹ کر اہلِ اسلام کے لیے دنیا میں عزت و آبرو کے ساتھ زندہ رہنا ممکن نہیں۔ علامہ اقبالؒ بار بار یہی تو کہتے ہیں کہ میں نے تقدیر کے چہرے سے پردہ ہٹا دیا ہے اے مسلمانوں نا اُمید نہ ہو اور راہِ مصطفیٰ اختیار کرو یعنی گر آقا و مولیٰ کی راہ اختیار کی جائے نا اُمید ہونے کا کوئی جواز نہیں۔ علامہ

اقبالؒ نے آقا و جہاں کی تعریف وثنا کو اپنا اشعار بنایا جس کے بغیر نہ خُدا کی ربوبیت کا اظہار ہوتا نہ قرآن نازل ہوتا نہ فروغِ وادیِ سینا کا ذکر چھڑتا۔

وہ دانائے سُبل ختم الرُسل مولائے کل جس نے
غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادیِ سینا
نگاہِ عشق و مستی میں وہی اوّل وہی آخر
وہی قرآں، وہی فرقاں، وہی یٰسیں، وہی طٰہٰ

علامہ اقبال اپنی تصنیف ''جاوید نامہ'' میں جرمن فلاسفر نطشے کا ذکر کرتے ہوئے افسوس کرتے ہیں کہ یہ بدقسمت شخص ''لا'' کے مقام تک رسائی حاصل کر چکا ہے مگر الا اللہ تک نہیں پہنچ سکتا اور مقام عبدہ سے بیگانہ رہا۔

علامہ اقبالؒ آئین مصطفیٰ میں افضل الخلائق بعد الانبیا حضرت صدیق اکبرؓ کی روش کے عامل ہیں اور جب رفیق نبوت کی زبان سے یہ نعرہ حق سنتے ہیں تو اس کو حرزِ جاں بنا لیتے ہیں کہ

پروانے کو چراغ ہے بلبل کو پھول بس
صدیقؓ کے لیے ہے خُدا کا رسول بس

اقبالؒ فرماتے ہیں کہ عشقِ رسول ﷺ ہی کے کرشمے ہیں کہ بلالِ حبشیؓ کا نام آج تک بڑے بڑے باجبروت شہنشاہ، خُدا کے سارے دوست اور اسلام کے سارے فرزند عزت و احترام سے لیتے ہیں۔

اقبالؒ! کس کے عشق کا یہ فیضِ عام ہے
رومی فنا ہوا، حبشی کو دوام ہے

مولانا عبدالسلام ندوی ''اقبال کامل'' میں لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر صاحب نے نعتیہ شاعری کو بالکل قومی شاعری بنا دیا ہے اور موجودہ دور میں مسلمان جن مصیبتوں میں مبتلا ہیں ان کو ایک ایک کر کے رسول ﷺ کی خدمت مبارک میں پیش کیا ہے:

ہنوز این چرخِ نیلی کج خرام است
ہنوز این کاروان دور از مقام است
زکارِ بی نظام اُو چہ گویم
تو میدانی کہ ملّت بی امام است
(۱۲)

''ڈاکٹر صاحب کو رسول ﷺ کی نبوت پر اعتقاد ہی نہ تھا بلکہ آپ کے ساتھ انتہا درجہ کا عشق تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب حضور ﷺ کا نامِ مبارک کسی کی زبان پر آجاتا تو ان کی آنکھیں بے اختیار اشک آلود ہو جاتیں۔''(۱۳)

علامہ اقبالؒ کے نزدیک مسلمانوں کے ہر قومی مرض کا واحد علاج عشق رسول ﷺ میں پنہاں ہے۔

وہ فاقہ کش کہ موت سے ڈرتا نہیں ذرا
رُوحِ محمد ﷺ اس کے بدن سے نکال دو

علامہ اقبالؒ جانتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ دوسروں کو اس حقیقت کا ادراک ہو جائے کہ اسمِ محمد ﷺ تمام مسلمانوں کے ایمان کی جان ہے۔ یہی نام ہے جو زبان پر جاری ہو، دل میں جاگزیں ہو۔ اقبالؒ نے اپنے پیغام میں خُدا اور رسول ﷺ کی تعلیمات کی روشنی میں ہمیں کائنات کی تسخیر کی اہمیت کا احساس دلایا اور رسول کریم ﷺ کی حیات طیبہ سے استفادہ کرنے کی ہدایت کی۔

ایک واقعہ

''علامہ اقبالؒ بتاتے ہیں کہ میرا لڑکپن کا زمانہ تھا، بلکہ آغازِ شباب۔ ایک روز ایک بھکاری ہمارے گھر کے دروازے پر آیا اور اونچی اونچی آواز میں بھیک مانگنے لگا۔ میں نے چاہا کہ وہ ٹل جائے، وہ اڑیل فقیر ٹلنے کا نام نہ لیتا تھا مگر وہ پیہم صدا بلند کرتا رہا۔ مجھے غصہ آ گیا اور جوشِ جذبات میں اچھے بُرے کی تمیز نہ رہی۔ اسے دو تین تھپڑ دے مارے۔ اُس نے ادھر ادھر سے بھیک مانگ کر جو کچھ بھی جمع کیا تھا وہ اُس کی جھولی سے زمین پر گر گیا۔ والد صاحب یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ میری اس حرکت سے بے حد آزردہ ہوئے، چہرہ مرجھا گیا اور ان پر افسردگی چھا گئی۔ ان کے لبوں سے ایک جگر سوز آہ نکلی اور دل سینے میں تڑپ اُٹھا۔ ستارے جیسا ایک آنسو نکلا، پلکوں پر چمکا اور گر گیا۔ یہ دیکھ کر مجھے سخت ندامت ہوئی کہ میں نے والد صاحب کو سخت تکلیف پہنچائی۔ اس کیفیت میں والد ماجد کہنے لگے: ''قیامت کے دن جب رسول اللہ ﷺ کے گرد غازیانِ اسلام، حکماء، شہدا، زہاد، صوفیہ، علما اور عاصیانِ شرمسار جمع ہوں گے تو اس مجمع میں اس مظلوم گدا کی فریاد آنحضور ﷺ کی نگاہِ مبارک کو اپنی طرف مرتکز کر لے گی اور آنحضور ﷺ مجھ سے پوچھیں گے کہ تیرے سپرد ایک مسلم نوجوان کیا گیا تھا تاکہ تو اس کی تربیت ہمارے وضع کردہ اصولوں کے مطابق کرے لیکن یہ آسان کام بھی تجھ سے نہ ہو سکا کہ اس خاک کے تودے کو انسان بنا دیتا، تو تب میں اپنے آقا و مولا کو کیا جواب دوں گا؟ بیٹا! اس مجمع

کا خیال کر اور میری سفید ڈاڑھی دیکھ اور دیکھ، میں خوف اور اُمید سے کس طرح کانپ رہا ہوں، باپ پر اتنا ظلم نہ کر اور خدارا میرے مولا ﷺ کے سامنے مجھے یوں ذلیل نہ کر۔ تو تو محمد ﷺ کے چمن کی ایک کلی ہے، اس لیے اسی چمن کی نسیم سے پھول بن کر کھل اور اسی چمن کی بہار سے رنگ و بو پکڑ تا کہ آنحضور ﷺ کے اخلاق کی خوشبو تجھ سے آسکے۔'' (۱۴)

اقبالؒ کے قلب و ذہن میں آخرت میں جواب دہی کے احساس و شعور کو بیدار کیا اور اُن کے نیک طینت والد نے اپنی دل سوز اور دردمندانہ گفتگو اور پند و نصیحت کے ذریعے، ان کے دل میں محبت رسول ﷺ کا بیج بو دیا۔ اقبالؒ کی شاعری اور شخصیت میں یہ بیج ایک تن آور اور بلند و بالا اور اطراف میں خوب پھیلی ہوئی شاخوں والا گھنا درخت بن کر نمودار ہوا۔'' (۱۵)

''علامہ اقبالؒ کے عشقِ رسول کے اس پہلو کا کمال یہ ہے کہ وہ خالق کائنات سے التجا کرتے ہیں اگر روز محشر میرا حساب کتاب بہت ہی ضروری ہوا اور اگر رہائی کی کوئی صورت نہ ہو تو خُدا فرد عمل دیکھ لے اور جو چاہے سزا بھی سنا دے مگر حضور پرنُور ﷺ کے سامنے ندامت کا موقع نہ آئے۔ (علامہ اقبالؒ اللہ کے حضور میں دعا گو ہیں کہ روزِ محشر میں بھی ان کے عشق کی حفاظت کرنا تا کہ ان کو آنحضرت ﷺ کے سامنے شرمسار نہ ہونا پڑے)۔''

تو غنی از ہر دو عالم، من فقیر
رُوزِ محشر عذر ہائے من پذیر
ور تو می بینی حسابم ناگزیر
از نگاہِ مصطفیٰ پنہاں بگیر
(۱۶)

یہ رُباعی علامہ اقبالؒ کی ہے مگر ان کی کسی کتاب میں موجود نہیں ہے۔ علامہ اقبالؒ نے یہ رُباعی اپنی کتاب ارمغانِ حجاز کے لیے منتخب کر رکھی تھی اور بعد میں محمد رمضان عطائی، ڈیرہ غازی خان کی نذر کر دینے کے بعد ایک نئی رُباعی کہی جو ارمغانِ حجاز (فارسی) میں شامل ہے۔

بہ پایان چُون رسد این عالم پیر   شَوَد بی پردہ ہر پوشیدہ تقدیر
مکن رسوا حضور(ﷺ) خواجہ ما را   حساب من زچشم او نہان گیر

(کلیاتِ اقبال فارسی۔ ص:۱۰۲۰)

اے میرے رب! روزِ قیامت مجھے پیر و مرشد حضرت محمد ﷺ کے سامنے رُسوا نہ کرنا۔ میرا حساب اُن کی آنکھوں سے چھپا لینا تا کہ اُمت محمدی ﷺ سے بے دخل نہ کر دیا جائے۔

خُدا کرے ہم اقبال کے اس درس کو رُوح و جاں میں بسا لیں اور کائنات کو عشق کے اس پیغام سے منوّر کر دیں۔ آمین!

حواشی

(۱)۔ عنایت علی، اقبالؒ بچوں اور نوجوانوں کے لیے (جہلم: بک کارنر، جولائی ۲۰۱۹ء) ص: ۵۸، ۵۹
(۲)۔ عبدالسلام ندوی، مولانا، اقبال کامل۔ ص: ۲۶۸
(۳)۔ عبدالمجید سالک، مولانا، ذکر اقبال۔ ص: ۲۶۳
(۴)۔ فقیر سیّد وحیدالدین، ''روز گار فقیر''۔ حصہ اول۔ ص: ۹۴
(۵)۔ مرتبہ شمیم حیات سیال، اقبال بڑا اُپدیشک۔ ص: ۴۷
(۶)۔ فکر و نظر اسلام آباد، اقبال نمبر، حصہ دوم۔ ۱۹۷۸ء۔ ص: ۶۴
(۷)۔ فقیر سیّد وحیدالدین، روز گار فقیر۔ جلد دوم۔ ص: ۷۲
(۸)۔ بصیر کراچی۔ مئی ۱۹۷۲ء: ص ۷ ۴
(۹)۔ فقیر سیّد وحیدالدین، روز گار فقیر جلد اول ص: ۳۲۔ ۳۷
(۱۰)۔ عطااللہ، شیخ، اقبال نامہ، حصہ اول، ص: ۲۲۸
(۱۱)۔ اقبال لاہور، اکتوبر ۱۹۵۷ء۔ ص: ۲۰
(۱۲)۔ محمد اکرم سعید، پروفیسر، اقبال کا خصوصی مطالعہ (لاہور: عبداللہ برادرز۔ ن۔ د) ص: ۴۳۲
(۱۳)۔ عبدالسلام ندوی، مولانا، (لاہور: الفیصل، آر آر پرنٹرز، فروری، ۲۰۰۸ء) ص: ۶۶
(۱۴)۔ جاوید اقبال، ڈاکٹر، زندہ رُود (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، بار سوم ۲۰۱۲ء) ص: ۸۸
(۱۵)۔ رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر، علامہ اقبال شخصیت اور فکر و فن (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۱۰ء) ص: ۲۷
(۱۶)۔ محمد اکرم سعید، پروفیسر، اقبال کا خصوصی مطالعہ (لاہور: عبداللہ برادرز۔ ن۔ د) ص: ۴۳۲، ۴۳۳

علامہ اقبالؒ اور قرآن

شاعرِ مشرق، مفکرِ ملّت علامہ اقبالؒ ہمہ جہت شخصیت کے حامل تھے۔ علامہ اقبالؒ کا کلام بے مثال اور انمول ہے۔ آپ نے اپنی سحر انگیز شاعری کی بدولت اہلِ مشرق اور اہلِ مغرب کے دلوں میں وہ مرتبہ حاصل کیا جو آپ کے معاصرین بھی نہ پا سکے۔ کلامِ اقبالؒ زمان و مکاں کی حدود و قیود سے قطعی ماورا ہے۔ شاندار ماضی کی جھلک دیکھنی ہو یا تابناک مستقبل کا پرتو یا عصرِ حاضر کی بے چینی و بے یقینی سب کے بہترین نمونے کلامِ اقبال میں موجود ہیں۔ دراصل اقبالؒ کے کلام کا ماخذ قرآن مجید ہے۔ یہ ایک دستاویز ہے جو ہر عہد میں انسان کی رہنمائی ایک جدید عہد کی طرف کرتی ہے۔

محمد ﷺ بھی ترا، جبریل بھی، قرآن بھی تیرا
مگر یہ حرف شیریں ترجمان تیرا ہے یا میرا؟
(۱)

قرآن انسان کے مستقبل کا آئین ہے جو تا قیامت قائم و دائم رہے گا۔ قرآن پاک کا ایک خاص وصف ہے کہ پڑھنے والے کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے اور اس پر بے پناہ اثر انداز ہوتا ہے۔ اس کے ظاہری و باطنی، غور و فکر اور اس کے اقوال اور اعمال پر غلبہ حاصل کرتا ہے۔ علامہ اقبالؒ بھی قرآن کے اسی تیر نظر کے گھائل تھے۔ ان کے فکر پر قرآنی افکار کی گہری چھاپ تھی:

قرآن کو بازیچۂ تاوِیل بنا کر
چاہے تو خود اک تازہ شریعت کرے ایجاد
(۲)

علامہ اقبالؒ نے قرآن حکیم سے ایسی دلی وابستگی اختیار کی کہ زندگی کے ہر شعبے میں قرآن مجید سے رہنمائی حاصل کرنا معمول بن گیا۔ اقبالؒ نے اپنے کلام کے توسط سے خوابِ غفلت کے نشے سے چُور اُمتِ مُسلمہ کو جھنجوڑا، اُسے اس کے اصل مقصدِ تخلیق کی طرف لوٹنے کی رہنمائی کی اور اس مشکل اور صبر آزما کام کا بیڑا اُٹھایا۔ شاندار ماضی کی جھلک دکھائی، روشن مستقبل کے لیے راہ بھی متعین کی اور نشاۃ ثانیہ کی واضح تصویر بھی پیش کی۔ حکیم الاُمت علامہ اقبالؒ کا آفاقی اور بے نظیر کلام ہمیشہ مسلمانوں کے لیے مشعلِ راہ رہے گا کیوں کہ علامہ اقبالؒ نے قرآن حکیم سے رہنمائی حاصل کی اور قرآن حکیم کے احکامات و ارشادات کے موتیوں کو اپنے کلام کی مالا میں پرو دیا ہے۔

قرآن میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلماں
اللہ کرے تجھ کو عطا جدت کردار (۳)

علامہ اقبالؒ نے اپنے کلام کے لیے ہمیشہ قرآن پاک سے رہنمائی لی ہے۔ علامہ اقبالؒ اپنے کلام ''رموزِ بےخُودی'' میں اللہ عز و جل سے مخاطب ہو کر عاجزانہ عرض کرتے ہیں:

روز محشر خوار و رُسوا کُن مرا
بی نصیب از بوسہ پا کُن مرا
گر درِ اسرارِ قرآں سفتہ ام
با مسلمانان اگر حق گفتہ ام (۴)

مجھے قیامت میں خوار اور رسوا کیا جائے اور اپنی پابوسی سے محروم کر دیا جائے اگر میں قرآن مجید کے علاوہ کچھ اور کہوں تو مجھے ختم کر دیا جائے اور قوم کو میرے شر سے محفوظ رکھا جائے۔ اتنی بڑی التجا اقبالؒ جیسا مرد قلندر ہی کر سکتا ہے۔ حضرت علّامہ اقبالؒ کی پوری زندگی قرآن سے شیفتگی اور عشقِ رسول ﷺ سے عبارت ہے۔ آپ اپنی اور دوسرے مُسلمانوں کی زیست قرآن کی روشنی میں گزارنے کی تلقین کرتے رہے۔ فرماتے ہیں:

گر تُو می خواہی مسلمان زیستن
نیست ممکن جز بقرآن زیستن

ترجمہ: ''اگر تو مسلمان کی حیثیت سے زندگی گزارنا چاہتا ہے تو یہ قرآن کے بغیر ناممکن ہے۔'' (۵)

خالد نظیر صوفی ''درون خانہ'' (حصّہ اوّل) میں رَقم کرتے ہیں:

''علامہ اقبالؒ کی آواز بڑی صاف، بلند، پُرسوز اور پروقار تھی۔علی الصبح قرآن حکیم کی تلاوت ان کا روز کا معمول تھا۔وہ اس قدر خوش الحان تھے کہ سننے والے مسحور ہو جاتے۔دل چاہتا کہ وہ یونہی تلاوت کیے جائیں اور آدمی سنتا رہے۔قرآن مجید کی تلاوت کے دوران ان پر اس قدر رقت طاری ہو جاتی کہ وہ زار و قطار رونے لگتے اور بعض اوقات اس قدر روتے کہ قرآن پاک کے صفحات تر ہو جاتے۔''(۶)

علامہ اقبالؒ پر قرآن ہی کا اثر تھا کہ کسی کے ساتھ ناانصافی پسند نہ کرتے تھے اور معاملات کے فیصلے کے لیے بھی اُن کی نظر قرآن ہی کی طرف اُٹھتی تھی۔

فقیر سیّد وحید الدین نے ایک واقعہ بیان کیا ہے:''علامہ اقبالؒ کی چھوٹی بہن کی شادی وزیر آباد کے ایک گھرانے میں ہوئی تھی۔غالباً اس لیے کہ اُن کے یہاں شادی کے بعد دو تین سال کوئی اولاد نہیں ہوئی، اُن کی ساس نے سسرال میں انھیں رہنے نہ دیا۔تلخی بڑھی اور بات یہاں تک پہنچی کہ وہ مجبوراً میکے چلی آئیں اور کئی سال وہیں رہیں۔ان کی ساس نے بیٹے کی دوسری شادی کر دی۔پھر نہ معلوم کیا واقعات پیش آئے کہ وہ اپنی دوسری بہو پر بھی سوکن لے آئیں۔علامہ اقبالؒ کے بہنوئی ایک سعادت مند بیٹے کی طرح اپنی والدہ کی زندگی بھر خدمت اور اطاعت کرتے رہے۔ماں نے جو کہا، اس کی تعمیل کی لیکن اُن کی وفات کے بعد انھوں نے اپنی پہلی بیوی کو گھر لے جانا چاہا اور کئی مہینے تک کوشش جاری رکھی۔وہ بار بار علامہ اقبالؒ کے والد کے پاس طرفین کے رشتے داروں کو مصالحت کے لیے بھیجتے رہے۔پہلے تو ادھر سے انکار ہوتا رہا۔پھر کچھ سوچ بچار کے بعد علامہ اقبالؒ کے والد اور والدہ دونوں رضامند ہو گئے۔خُسر اور خوش دامن کی رضامندی کا سہارا پا کر علامہ اقبالؒ کے بہنوئی کچھ عزیزوں کو ساتھ لے کر اپنے سسرال آ گئے۔اتفاق کی بات کہ اُن دنوں علامہ اقبالؒ بھی لاہور سے سیالکوٹ گئے ہوئے تھے۔انھیں جب اس بات کا علم ہوا کہ ان کے بہنوئی مصالحت کی غرض سے آئے ہوئے ہیں تو ان کی برہمی کی کوئی حد نہ رہی۔والد صاحب نے بہت سمجھایا مگر علامہ اقبالؒ یہی کہتے رہے کہ مصالحت نہیں ہو سکتی، ہرگز نہیں ہو سکتی۔آنے والوں کو واپس کر دیا جائے۔ان کے والد نے جب دیکھا کہ اقبالؒ کسی طرح رضامند نہیں ہوتے تو انھوں نے خاص انداز میں کہا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں ''والصلح خیر'' (اور صلح خوب چیز ہے) فرمایا ہے اتنا سننا تھا کہ علّامہ اقبالؒ خاموش ہو گئے۔اُن کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا، جیسے کسی نے سلگتی ہوئی آگ پر برف کی سِل رکھ دی ہو۔اُن کے والد نے قدرے توقف کے بعد علّامہ اقبالؒ سے پوچھا کہ پھر کیا فیصلہ کیا جائے؟ علّامہ اقبالؒ نے جواب دیا ''وہی جو قرآن کہتا ہے'' چناں چہ مصالحت ہو گئی اور اُن کے بہنوئی اپنی بیوی یعنی علامہ اقبالؒ کی چھوٹی بہن کو رُخصت کرا کے اپنے گھر لے گئے۔''(۷)

علامہ اقبالؒ کے والد بہت پرہیزگار، متقی اور درویش صفت انسان تھے۔اقبالؒ کی تربیت پہ اُن کی خاص نظر تھی۔انھوں نے علامہ اقبالؒ کو ہمیشہ بڑے سلیقے اور قرینے سے قرآن فہمی کا درس دیا۔

''علامہ اقبالؒ کے والد کا یہ معمول تھا کہ جب بھی اُنھیں کسی بات سے ٹوکتے یا اُن کو کچھ کرنے سے منع کرتے تو ہمیشہ قرآن مجید یا اسوۂ رسول ﷺ کی سند سے پند و نصیحت فرماتے۔اقبالؒ اُن کے منہ سے جب قرآن مجید کی آیت یا حدیث سنتے تو چہرے پر کسی قسم کی ناگواری کا اظہار کیے بغیر خاموش ہو جاتے۔''(۸)

''اقبالؒ خود بیان کرتے ہیں کہ جب وہ سیالکوٹ میں پڑھتے تھے تو روزانہ صبح اُٹھ کر نماز فجر کے بعد تلاوتِ قرآن کیا کرتے۔مگر اُن کے والد صاحب اپنے درود و وظائف سے فرصت پا مسجد سے کر گھر آتے اور مجھ تلاوت کرتا دیکھ کر، اپنے کمرے میں چلے جاتے۔۔ایک روز نمازِ فجر کے بعد حسبِ معمول تلاوت میں مصروف تھا کہ والد صاحب میرے پاس سے گزرے۔فرمایا: کبھی فرصت ملی تو میں تمھیں ایک بات بتاؤں گا۔کچھ مدت بعد اسی طرح مسجد سے آ کر میرے پاس بیٹھ گئے۔میں تلاوت کرتے کرتے رُک گیا۔وہ فرمانے لگے: تم کیا پڑھ رہے ہو؟، مجھے ان کے اس سوال پر تعجب ہوا اور کچھ ملال بھی، کیوں کہ انھیں معلوم تھا کہ میں قرآن مجید کی تلاوت کر رہا ہوں۔بہرحال میں نے بڑے ادب سے جواب دیا: قرآن مجید۔کہنے لگے، تم جو کچھ پڑھتے ہو، اسے سمجھتے بھی ہو؟ کہا: کیوں نہیں، کچھ نہ کچھ سمجھ لیتا ہوں۔والد صاحب خاموش ہوئے اور اٹھ کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔مَیں سوچتا رہا: اس سوال جواب کا مقصد کیا تھا؟ چند دن گزر گئے۔بات آئی گئی ہو گئی۔اس واقعے کو چھٹا روز تھا۔مَیں حسبِ دَستوُر قرآن مجید کی تلاوت کر رہا تھا کہ والد صاحب مسجد سے آئے اور جب میں نے تلاوت ختم کر لی تو مجھے بلایا اور اپنے پاس بٹھا کر بڑی نرمی سے کہنے لگے: بیٹے! قرآن مجید وہ شخص سمجھ سکتا ہے جس پر اس کا نزول ہو۔جب تک تم یہ نہ سمجھو کہ قرآن مجید تمھارے قلب پر بھی اسی طرح اُتر رہا ہے جیسے رسول ﷺ اللہ کے قلبِ اقدس پر نازل ہوا تھا تو تلاوت کا مزہ نہیں اور تم قرآن مجید کو پوری طرح سمجھ بھی نہیں سکتے ہو۔اگر تم تلاوت اس طرح کرو جیسے یہ تم پر نازل ہو رہا ہے یعنی اللہ تعالیٰ خود تم سے ہم کلام ہے تو یہ تمھاری رگ و پے میں سرایت کر جائے گا۔اقبالؒ کہتے ہیں کہ والد صاحب کی باتوں سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ قرآن مجید دل کے راستے بھی انسانی شعور میں داخل ہوتا ہے۔''(۹)

بالِ جبریل کا یہ شعر، اسی واقعے کی یاد دلاتا ہے:

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی، نہ صاحبِ کشّاف (۱۰)

مولوی مصلح الدین لکھتے ہیں کہ ''شاعرِ اعظم قرآن مجید کی تلاوت کے وقت وجد میں آ جاتا تھا۔ اقبالؒ اپنی نظموں کو ترنم کے ساتھ پڑھا کرتے تھے پھر یہ کیوں کر ہوسکتا تھا کہ خُدا کے کلام کو سنوار کر نہ پڑھتے۔ یہ وہ وقت ہوتا تھا کہ قال حال بن جاتا تھا اور شاعر پر ایک خاص عالم طاری ہوجاتا تھا، اقبالؒ راتوں میں جاگتے تھے اور سحر خیزی ان کی چہیتی چیز تھی، پھر قرآن کو تو ان اوقات کے ساتھ خاص لگاؤ ہے لہٰذا شغف قرآن، قرآن کے نُورانی صفحات ان کے سامنے کر دیتا تھا اور یہ بلبلِ ہزار داستان بڑی خوش الحانی کے ساتھ تلاوتِ قرآن میں مصروف نظر آتا تھا۔ کہا جاسکتا ہے اقبالؒ کچیم شحیم تھے مگر رقیق القلب ایسے تھے کہ دورانِ تلاوت روتے روتے ہچکیاں بندھ جاتی تھیں۔''

''محمد اقبالؒ سلمانی نے ڈاکٹر صاحب کی تلاوتِ قرآن کے متعلق ایک نہایت مؤثر واقعہ بیان کیا ہے۔ "انھوں نے لکھا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے انتقال کے بعد ان کی وصیت کے مطابق ان کی تمام کتابیں اسلامیہ کالج لاہور کی لائبریری کو دے دی گئیں۔ ان ہی کتابوں میں ڈاکٹر صاحب کی تلاوت کا خاص قرآنِ مجید از روئے وصیت ان کے لختِ جگر جاوید کو ملا، اور اس مصحف کے متعلق ڈاکٹر صاحب کے خاص خاص احباب کا بیان ہے کہ وہ بلا ناغہ صبح کے وقت اس کی تلاوت ایسے ذوق وشوق، ایسے درد ومحبت اور ایسے سوز وگداز کے ساتھ کیا کرتے تھے کہ آنسوؤں کا تار بندھ جاتا تھا، روتے جاتے تھے اور پڑھتے جاتے تھے، یہاں تک کہ کتابِ عزیز کے اوراق بھیگ جاتے۔ جب تلاوت ختم ہوجاتی تو اسے اٹھا کر دھوپ میں رکھ دیتے تاکہ صفحے خشک ہوجائیں۔ مدت العمر تک ان کا یہی دستور رہا، حتیٰ کہ زندگی کے آخری دنوں میں جب بیماری کا تسلط بڑھ گیا، اور گلا خراب ہوجانے کی وجہ سے ان کی آواز میں پتی لگ گئی تو ڈاکٹروں کے روکنے پر آپ کا یہ طریق تلاوت چُھوٹ گیا۔ جس کا ان کو نہایت رنج تھا چناں چہ سیّد نذیر نیازی صاحب لکھتے ہیں کہ ''انھیں غم تھا تو صرف احتباسِ صوت کا، بچپن ہی سے ان کی عادت تھی کہ قرآن مجید کی تلاوت بلند آواز سے کرتے۔ ظاہر ہے کہ اب یہ فریضہ اس رنگ میں ہمیشہ کے لیے چھوٹ گیا تھا، اس کا اُنھیں بے حد قلق تھا۔''(۱۱)

علامہ اقبالؒ قرآن کو ایک عملی چیز تصور کرتے تھے، اُن کی نگاہ میں یہ فرمان خُداوندی نافذ کرنے کے لیے تھا۔ زندگی کے ہر معاملے میں قرآن کو ہی رہبر و رہنما مانتے تھے۔ تمام جسمانی اور رُوحانی امراض کے لیے تعلیمات قرآن تریاق کا درجہ رکھتی ہیں۔ اقبالؒ کی فقط شاعری نہیں بلکہ خود بھی قرآن کا پیام تھے اور ساری دُنیا کے لیے قرآن پاک کو ہی ضابطہ حیات اور دستور العمل سمجھتے تھے۔

علامہ اقبالؒ نے نئی نسل کے لیے بصیرت کے کتنے گوشے وا کیے تھے۔ مسلم یونیورسٹی سٹوڈنٹس

یونین علی گڑھ سے ۲۹ نومبر ۱۹۲۹ء کے سپاسنامہ کے جواب میں علامہ اقبالؒ نے ایک پُر مغز تقریر میں فرمایا:

''میں گزشتہ بیس برس سے قرآن شریف کا بغور مطالعہ کرتا ہوں، ہر روز تلاوت کرتا ہوں مگر میں ابھی یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ اس کے کچھ حصّوں کو سمجھ گیا ہوں۔''(۱۲)

علامہ اقبالؒ نے سیّد سلیمان ندویؒ اور سر راس مسعود کے ہمراہ ستمبر ۱۹۳۳ء میں افغانستان کا سفر شاہِ افغانستان نادر شاہ کی دعوت پر کیا۔ سلام و پیام کے بعد اقبالؒ نے فرمایا کہ ''اعلیٰ حضرت مَیں نے کوئی تُحفہ اور ہدیہ حضور شاہانہ میں پیش کرنے میں بہت تفکّر و تدبّر سے کام لیا، دُنیا کی ہر چیز مجھے ہیچ نظر آئی۔ میں نے خیال کیا کہ بحیثیت ایک جلیل القدر تاجدار نامدار افغانستان آپ کو سب نعمتیں حاضر ہیں۔ لہٰذا میں حمائل شریف اعلیٰ حضرت کی خدمت میں تقدیم کرتا ہوں، جس کے کلام الملوک، ملوک الکلام (شاہوں کا کلام، کلام کا شہنشاہ) ہونے میں کوئی ریب وشک نہیں۔ اہلِ حق کی یہی دولت ہے۔ اسی کے باطن میں حیاتِ مطلق کے چشمے بہتے ہیں۔ یہ ہر ابتدا کی انتہا اور ہر کام کی تکمیل ہے۔ اس کی بدولت مومن خیبر شکن بنتا ہے۔ میرے کلام میں تاثیر اور میرے دل کا سوز وگداز سب اسی کا فیضان ہے''۔ نادر شاہ تعظیماً اُٹھ کھڑے ہوئے۔ حمائل شریف کو بوسہ دے کر دونوں ہاتھوں سے سر وچشم پر رکھا اور فرمایا ''ڈاکٹر صاحبؒ آپ نے یہ ہدیہ مبارک دے کر دونوں جہان کی بادشاہی دی ہے۔ اس عطیۂ بزرگانہ کے تشکر کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں، دُعا فرمائیے اللہ تعالیٰ مجھے عمل کی توفیق دے۔''

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے کس قدر سچ لکھا ہے:

''مغربی تعلیم وتہذیب کے سمندر میں قدم رکھتے وقت وہ جتنا مسلمان تھا، اس کے منجدھار میں پہنچ کر اس سے زیادہ مسلمان پایا گیا۔ اس کی گہرائیوں میں جتنا اترتا گیا اتنا ہی زیادہ مسلمان ہوتا گیا، یہاں تک کہ اس کی تہ میں پہنچا تو دنیا نے دیکھا کہ وہ قرآن میں گم ہو چکا ہے اور قرآن سے الگ اس کا کوئی فکری وجود باقی نہیں رہا۔ وہ جو کچھ سوچتا تھا قرآن کے دماغ سے سوچتا تھا، جو کچھ دیکھتا تھا قرآن کی نظر سے دیکھتا تھا۔''

اسی بنا پر علامہ اقبالؒ نے اپنے عقائد کی بنیاد تمام تر قرآن مجید پر رکھی۔ چناں چہ اُنہوں نے ایک موقع پر خود فرمایا: ''میں اعتقادی امور میں صرف قرآن پر انحصار رکھتا ہوں۔''(۱۴)

یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن
قاری نظر آتا ہے، حقیقت میں قرآن! (۱۵)

دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے علامہ اقبالؒ جب لاہور سے روانہ ہو کر ۹ ستمبر ۱۹۳۱ء

کو دہلی پہنچے تو ریلوے اسٹیشن پر آپ کے استقبال کے لیے صبح صبح تین ہزار سے زائد کا مجمع تھا جس میں اکابرینِ شہر، انجمن رفیق المسلمین، انجمن تیموریہ، صوبائی مسلم کانفرنس دہلی، سنٹرل مسلم یوتھ لیگ طلبہ و اساتذہ اور سیّد احمد بخاری امام جامع مسجد دہلی موجود تھے۔ ان سے مختصراً خطاب کرتے ہوئے:

''جہاں تک سیاسی مسائل کا تعلق ہے مَیں آپ کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ نہ میرے ساتھ کوئی پرائیویٹ سیکریٹری ہے جو میرے لیے ضروری مواد فراہم کرے۔ نہ میرے پاس سیاسی لٹریچر کا کوئی پلندہ ہے جس پر مَیں اپنی بحثوں کی اساس قائم کروں بلکہ میرے پاس حق و صداقت کی ایک جامع کتاب (قرآن مجید) ہے جس کی روشنی میں مسلمانانِ ہند کے حقوق کی ترجمانی کرنے کی کوشش کروں گا۔'' (۱۶)

علامہ اقبالؒ کو اس بات کا انتہائی دُکھ ہے کہ ہندوستان میں کوئی حکمت دین کا سمجھانے والا نہیں۔ بدقسمتی کی انتہا ہے کہ یہاں کے لوگ قرآن سے بدلتے نہیں بلکہ خود قرآن بدل دیتے ہیں

خود بدلتے نہیں، قرآں کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بےتوفیق!
(۱۷)

ریاست حیدر آباد دکن کے وزیر مہاراجہ سرکشن پرشاد، علّامہ اقبالؒ کے بہت اچھے دوست تھے۔ علّامہ اقبالؒ سے اُن کی خط و کتابت رہتی تھی۔ وہ اکثر علامہ اقبالؒ سے دُعا کے طلبگار رہتے تھے۔ چناں چہ علامہ اقبالؒ اپنے ایک مکتوب میں ۱۱ جون ۱۹۱۸ء مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر کو لکھتے ہیں:

''ان شاءاللہ کل صبح کی نماز کے بعد دعا کروں گا۔ کل رمضان کا چاند یہاں دکھائی دیا۔ آج رمضان المبارک کی پہلی ہے۔ بندۂ روسیاہ کبھی کبھی تہجد کے لیے اٹھتا ہے اور بعض دفعہ تمام رات بیداری میں گزر جاتی ہے۔ سو خُدا کے فضل و کرم سے تہجد سے پہلے اور بعد بھی دعا کروں گا کہ اس وقت عبادت الٰہی میں بہت لذت حاصل ہوتی ہے، کیا عجب ہے کہ دُعا قبول ہو جائے۔'' (۱۸)

علامہ اقبالؒ کی پوری زیست قرآن کا پیغام اور رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات کو عام کرنے میں گزری۔ علالت کی آخری رات بھی اُن کی مصروفیات میں اس کی جھلک نمایاں ہے۔ ۲۱۔ اپریل ۱۹۳۸ء کو صبح تقریباً پانچ بجے علامہ اقبالؒ خالقِ حقیقی سے جا ملتے ہیں مگر ۲۰۔ اپریل کو رات آٹھ بجے شدید علالت میں بھی فاطمہ بیگم، پرنسپل اسلامیہ کالج برائے خواتین لاہور سے تقریباً ڈیڑھ گھنٹے تک کالج میں خواتین / بچیوں کے لیے درس قرآن کے انتظامات اور ترتیب سے متعلق بات چیت ہوتی رہی۔'' (۱۹)

علامہ اقبالؒ کے بہت سے اشعار ایسے ہیں جن میں آپ نے کسی آیت کے حصے کو ہی اشعار کا حصہ بنایا۔

اَے مسلماں! ہر گھڑی پیشِ نظر
آیہ لَا یُخْلِفُ الْمِیْعَاد رکھ
یہ 'لِسان العصرؒ' کا پیغام ہے
''اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ یاد رکھ''
(۲۰)

علم کا ''موجود'' اور فقر کا ''موجود'' اور
اَشْهَدُ اَنْ لَآ اِلٰه، اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰه!
(۲۱)

چشمِ اقوام یہ نظّارہ ابد تک دیکھے
رفعتِ شانِ ''رَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ'' دیکھے
(۲۲)

علامہ اقبالؒ اُمت مسلمہ کے حقیقی نباض تھے۔ انھوں نے اسلامی تاریخ کے دریچوں سے مُسلمانوں کے زوال و پستی کا بغور تجزیہ کیا۔ ان کے نزدیک مسلمانوں کے زوال کی بنیادی اور بڑی وجہ اسلام کی حقیقی رُوح سے بیگانگی اور قرآن پاک سے قطع تعلقی ہے۔ مُسلمانوں کا طرز زندگی اسلامی نہیں اور کردار و اعمال میں مناسبت ہی نہیں۔ گفتار کے غازی مگر کردار سے گئے گزرے ہیں فقط نام کے مسلمان ہیں۔ اقبالؒ کہتے ہیں کہ پہلے کے مسلمان قرآن پاک سے مضبوط تعلق کی بنا پر صدیوں تک حکومت کرتے رہے اور جیسے ہی اس لافانی کتاب (قرآن مجید) سے ترک تعلق کیا تو ذلت و خواری کی پستیوں میں گر گئے۔

وہ زمانے میں معزّز تھے مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر (۲۳)

حواشی

۱۔محمد اقبالؒ،کلیات اقبال (اُردو) بال جبریل (لاہور:الفیصل ناشران،فروری۲۰۰۶ء)ص:۳۶۲

۲۔محمد اقبالؒ،کلیات اقبال (اُردو)،ضرب کلیم (لاہور:الفیصل ناشران،فروری۲۰۰۶ء)ص:۶۱۴

۳۔محمد اقبالؒ،کلیات اقبال (اُردو)،ضرب کلیم (لاہور:الفیصل ناشران،فروری۲۰۰۶ء)ص:۶۸۱

۴۔حمید اللہ شاہ ہاشمی، پروفیسر،شرح کلیات اقبال (فارسی) (لاہور: مکتبہ دانیال،ن۔د)ص:۲۵۳، ۲۵۴

۵۔عنایت علی، اقبال بچوں اورنوجوانوں کے لیے (لاہور:جہلم، بک کارنر، جولائی ۲۰۱۹ء)ص:۵۲

۶۔خالد نظیر صوفی ''درون خانہ'' (حصہ اوّل) (لاہور:اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۱۲ء)ص:۲۷

۷۔فقیر سیّد وحید الدین، روزگار فقیر (حصّہ دوم)ص:۱۵۴۔۱۵۵

۸۔عنایت علی، اقبال بچوں اورنوجوانوں کے لیے (لاہور:جہلم، بک کارنر، جولائی ۲۰۱۹ءص:۴۵

۹۔جاوید اقبال، ڈاکٹر، زندہ رُود (لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز، بارسوم ۲۰۱۲ء)ص:۸۸

۱۰۔محمد اقبالؒ،کلیات اقبال (اُردو)، بال جبریل (لاہور:الفیصل ناشران،فروری۲۰۰۶ء)ص:۴۴۶

۱۱۔عبدالسّلام ندوی،مولانا،اقبالِ کامل (لاہور؛الفیصل ناشران،فروری۲۰۰۸ء)ص:۸۷

۱۲۔عنایت علی، اقبال بچوں اورنوجوانوں کے لیے (لاہور:جہلم، بک کارنر، جولائی ۲۰۱۹ءص:۵۶

۱۳۔عنایت علی،''اسفار اقبال''۔ص؛۲۳۶

۱۴۔عبدالسّلام ندوی،مولانا،اقبالِ کامل (لاہور؛الفیصل ناشران،فروری۲۰۰۸ء)ص:۶۴

۱۵۔محمد اقبالؒ،کلیات اقبال (اُردو)،ضرب کلیم (لاہور:الفیصل ناشران،فروری۲۰۰۶ء)ص:۶۱۲

۱۶۔عنایت علی، اقبال بچوں اورنوجوانوں کے لیے (لاہور:جہلم، بک کارنر، جولائی ۲۰۱۹ءص:۵۵

۱۷۔محمد اقبالؒ،کلیات اقبال (اُردو)،ضرب کلیم (لاہور:الفیصل ناشران،فروری۲۰۰۶ء)ص:۶۱۴

۱۸۔خالد نظیر صوفی، اقبال درون خانہ (دوم) (لاہور:اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۱۲ء)ص:۲۰

۱۹۔جاوید اقبال، ڈاکٹر، زندہ رُود (لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز، بارسوم ۲۰۱۲ء)ص:۱۸۷

۲۰۔محمد اقبالؒ،کلیات اقبال (اُردو)، بانگ درا (لاہور:الفیصل ناشران،فروری۲۰۰۶ء)ص:۳۴۴

۲۱۔۔محمد اقبالؒ،کلیات اقبال (اُردو)، بال جبریل (لاہور:الفیصل ناشران،فروری۲۰۰۶ء)ص:۴۴۵

۲۲۔محمد اقبالؒ،کلیات اقبال (اُردو) بانگ درا (لاہور:الفیصل ناشران،فروری۲۰۰۶ء)ص:۲۵۷

۲۳۔محمد اقبالؒ،کلیات اقبال (اُردو) بانگ درا (لاہور:الفیصل ناشران،فروری۲۰۰۶ء)ص:۲۵۲

علامہ اقبالؒ کا تصورِ خُودی و بےخُودی

تری خُودی میں اگر انقلاب ہو پیدا
عجب نہیں ہے کہ یہ چار سُو بدل جائے
(کلیات اقبال،ضرب کلیم،صفحہ نمبر۶۷۶)

علامہ اقبالؒ کے فلسفہ حیات میں تصور خُودی کو مرکزی اور بنیادی مقام حاصل ہے۔خُودی اور بےخُودی کے بارے میں علامہ اقبالؒ کے افکار و نظریات فلسفہ عجم ۱۹۰۸ء، اسرار خُودی 1915ء اور رموز بےخُودی 1918ء میں ملتّے ہیں۔علامہ اقبالؒ نے تاریخ عالم کا گہرا مطالعہ کیا اور اس نتیجہ پر پہنچا کہ اُنیسویں اور بیسویں صدیوں میں مسلمانوں کے سیاسی اور معاشی زوال کا سبب ان کا اسلامی تعلیمات سے انحراف تھا۔اس کی وجہ قوائے عملی کو مفلوج کر دینے والا افلاطونی فلسفہ وحدت الوجود اور ایرانی شاعروں کی رومانوی شاعری تھی۔علامہ اقبالؒ نے افلاطونی نظریے کو رد کر کے ڈیکارٹ کے افکار کی تائید کی جن کے مطابق انسانی وجود ایک حقیقت تھا اور کائنات فریب نظر نہیں تھی۔علامہ اقبالؒ کے مطابق خُودی کو مضبوط کر کے انسان یزداں کے دھارے کا رُخ اپنی مرضی کے مطابق موڑ سکتا ہے۔

ترے دریا میں طوفاں کیوں نہیں ہے
خُودی تیری مسلماں کیوں نہیں ہے
عبث ہے شکوۂ تقدیرِ یزداں
تو خود تقدیرِ یزداں کیوں نہیں ہے؟
(کلیات اقبال،ضرب کلیم،صفحہ نمبر۷۳۴)

فلسفہ خُودی میں خود بینی اور خُدا بینی دونوں لازم و ملزوم ہیں۔خُودی کا تصور علامہ اقبالؒ کی شاعری کا

بنیادی تصور ہے جس کے بغیر ہم علامہ اقبالؒ کی شاعری کا تصور بھی نہیں کر سکتے، یہ اقبالؒ کے فلسفہ حیات کی بنیادی اینٹ ہے۔ خُودی کا لفظ علامہ اقبالؒ کے فلسفہ حیات میں تکبر و غرور کے معنی میں استعمال نہیں ہوا ہے بلکہ اقبالؒ کے نزدیک خُودی حیات کا دوسرا نام ہے، خُودی عشق کے مترادف ہے، خُودی معرفت نفس ہے، خُودی احساس نفس کا نام ہے، خُودی سرچشمہ جِدّت و نُدرت ہے، خُودی یقین کی گہرائی ہے۔

هزار چشمے ترے سنگ راہ سے پُھوٹے
خُودی میں ڈُوب کے ضربِ کلیم پیدا کر
(کلیات اقبال، ضرب کلیم، صفحہ نمبر ۵۰۳)

علامہ اقبالؒ کے نزدیک غیرت مندی، جذبہ خوداری، خُودی اور اپنی دنیا آپ پید کرنے کے لیے کائنات کی قوتوں کے ساتھ برسر پیکار رہنے کا نام ہے۔ علامہ اقبالؒ کو مکمل یقین تھا کہ اس کرۂ ارض کا انسان اگر فلسفہ خُودی پر عمل کر لے تو بلندیوں اور عظمتوں کی انتہاؤں کو چھو سکتا ہے اور لامکاں تک اس کی رسائی کو روکنا کسی بھی انسان کے لیے ممکن نہ ہوگا۔ علامہ اقبالؒ نے خود شناسی، خُود آگاہی، احساس ذات اور عرفانِ ذات کو خُودی سے تعبیر کیا ہے۔ دراصل انسانی زندگی کے تین اہم مقاصد ہیں اوّل خود شناسی، دوم جہاں شناسی اور سوم خُدا شناسی، اس لیے ضروری ہے کہ ہر فرد خود شناسی کی منزلوں کو طے کر کے اپنے خالق و مالک سے تعلق پیدا کرے اور معاشرتی اور تمدنی اصولوں پر بھی دسترس حاصل کرے۔ جو اقوام و افراد عقلِ سلیم سے بہرہ مند ہوتے ہیں وہ کبھی ان فرائض زندگی سے غفلت سے نہیں برتتے۔

خُودی وہ بحر ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں
تو آب جُو اسے سمجھا اگر تو چارہ نہیں
خُودی میں ڈوبتے ہیں پھر اُبھر بھی آتے ہیں
مگر یہ حوصلۂ مرد ہیچ کارہ نہیں
(کلیات اقبال، بال جبریل، صفحہ نمبر ۴۰۷)

''مثنوی اسرار خُودی علامہ نے ۱۹۱۰ء میں لکھنا شروع کی تھی۔ بعد میں یہ ۱۹۱۵ء میں پہلی مرتبہ شائع ہوئی، اس کی تصنیف سے ان کا مقصد سوئی ہوئی قوم کو، جو اس وقت انگریزوں کی غلامی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی تھی بیدار کرنا تھا۔ اس مثنوی کے مطالعہ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ انھیں اس بات کی بے حد آرزو تھی کہ ان کے حیات افروز پیغام کو قوم پوری طرح سمجھے اور اس پر عمل پیرا ہو کر جہاں اپنی آزادی کے لیے

جدوجہد کرے وہاں اس سے ایک نئے اور بامقصد معاشرے کی تخلیق ہو، چناں چہ ان کے اس جذبہ صادق کا قوم پر خاصا اثر ہوا اور اس نے بیدار ہو کر ایک غاصب قوم سے اپنی چھینی ہوئی آزادی واپس لی۔''(۱)

''خُودی'' کا لفظ، اقبال کے پیغام یا فلسفۂ حیات میں تکبر و غرور یا اردو فارسی کے مروجہ معنوں میں استعمال نہیں ہوا، خُودی اقبال کے نزدیک نام ہے، احساس غیرت مندی کا، جذبہ خودداری کا، اپنی ذات و صفات کے پاس و احساس کا، اپنی انا کو جراحت و شکست سے محفوظ رکھنے کا، حرکت و توانائی کو زندگی کی ضامن سمجھنے کا، مظاہرات فطرت سے برسر پیکار رہنے کا اور دوسروں کا سہارا تلاش کرنے کے بجائے اپنی دنیا آپ پیدا کرنے کا۔ یوں سمجھ لیجیے کہ اقبال کے نقطۂ نظر سے "خُودی" زندگی کا آغاز، وسط اور انجام سبھی کچھ ہے۔''(۲)

''بےخُودی کا لفظ فارسی میں اب بھی آپے سے باہر ہونے یا بے ہوش ہونے کے معنوں میں استعمال ہو رہا ہے، لیکن اقبال کے ہاں اس کا مفہوم خُودی سے باہر آنا یعنی اپنی انفرادیت کو اجتماعیت سے بدلنا ہے، دنیا کے کئی نظاموں میں کہیں تو فرد زیادہ اہم ہے اور کہیں معاشرہ، مگر اسلامی نقطۂ نظر بہت متوازن ہے کہ فرد کی نشوونما کی جائے، اسے مفید سہولتوں اور آزادیوں سے بہرہ مند رکھا جائے پھر اس کی توانائیوں اور صلاحیتوں سے معاشرے میں کام کیا جائے۔''(۳)

''روایتاً خُودی سے مراد ہے تکبر یا غرور، لیکن اقبال کے ہاں خُودی کے معنی ہیں اپنے آپ کو جاننا اور اپنی ذات کی تکمیل کے لیے تگ و دو کرنا۔''

''بےخُودی کے روایتی معنی ہیں کہ کسی نہ کسی نشے یا سکر کی کیفیت میں اپنے آپ کو بھلا دینا۔
مگر اقبال کے ہاں بےخُودی سے مراد ہے اپنی ذات کو قوم کے اجتماعی مفاد پر قربان کر دینا۔''(۴)

اقبالؒ نے منشی سراج الدین کو ایک مکتوب میں تحریر فرمایا:

''یہ مثنوی (اسرار خُودی) گزشتہ دو سال کے عرصے میں لکھی گئی مگر اس طرح کہ کئی کئی ماہ کے وقفوں کے بعد طبیعت مائل ہوتی رہی، چند اتوار کے دنوں اور بعض بے خواب راتوں کا نتیجہ ہے۔ موجودہ مشاغل وقت نہیں چھوڑتے اور جوں جوں اس پروفیشن (بیرسٹری) میں زمانہ زیادہ ہوتا جاتا ہے کام بڑھتا جاتا ہے۔ لٹریری مشاغل کے امکانات کم ہوتے جاتے ہیں اگر مجھے فرصت ہوتی تو غالباً اس موجودہ صورت سے یہ مثنوی بہتر ہوتی۔''(۵)

''مثنوی اسرار خُودی میں علامہ اقبال نے ایک مکمل ضابطۂ حیات پیش کیا ہے جس کا محور و مرکز ''خُودی'' ہے۔''(۶)

اقبالؒ کے تصورِ خُودی کو سمجھنے کے لیے اس بات سے باخبر ہونا از حد ضروری ہے کہ جہاں علامہ اقبال نے اپنی شاعری میں بہت سی اصطلاحات اور تلمیحات کو نیا مفہوم دیا وہاں ''خُودی'' کا مفہوم بھی روایتی مفہوم سے بالکل مختلف ہے۔

خُودی کیا ہے؟ رازِ درُونِ حیات!
خُودی کیا ہے ؟ بیداریِ کائنات!
خُودی کا نشیمن ترے دل میں ہے
فلک جس طرح آنکھ کے تِل میں ہے
(۷)

''خُودی کی دو اقسام ہیں۔ ایک شیطانی اور دوسری یزدانی خُودی۔ شیطانی خُودی وہ ہے جس کا نمونہ روزِ اوّل شیطان مردود نے حکم خُداوندی سے انکار کی صورت میں پیش کیا، غرور و تکبر کے باعث اس نے اپنی اور آدم علیہ السلام کی تخلیق میں امتیازات قائم کیے اور اس کی انانیت نے اسے آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے کی توفیق نہ دی اور وہ اللہ تعالیٰ کے دربار میں مجرم ٹھہرا۔ شیطانی خُودی رکھنے والا انسان غرور و تکبر کا پتلا بن جاتا ہے اور وہ اپنے قائم کردہ امتیازات کی وجہ سے ایسی گمراہی و ضلالت میں مبتلا ہو جاتا ہے جو اسے نہ صرف فرائض زندگی کی منزلوں سے دور لے جاتی ہے بلکہ آخرت میں اس کے جہنم کا ایندھن بننے کا باعث بھی بنتی ہے۔'' (۸)

مثنوی اسرارِ خُودی کے پہلے ایڈیشن میں علامہ اقبال نے اردو میں ایک دیباچہ بھی لکھا تھا جس میں علامہ اقبال نے خُودی کے مفہوم کو واضح کیا ہے۔ لکھتے ہیں: ''لفظ خُودی کے متعلق ناظرین کو آگاہ کر دینا ضروری ہے کہ یہ لفظ اس نظم میں بمعنی غرور استعمال نہیں کیا گیا جیسا کہ عام طور اردو میں مستعمل ہے۔ اس کا مفہوم احساس نفس یا تعین ذات ہے۔'' (۹)

تو رازِ کن فکاں ہے اپنی آنکھوں پر عیاں ہو جا
خُودی کا رازداں ہو جا، خُدا کا ترجماں ہو جا
(۱۰)

نقطۂ نُورے کہ نام او خُودی است
زیرِ خاکِ ما شرارِ زندگی است
(۱۱)

''علامہ اقبالؒ نے اپنے مضمون ''مثنوی اسرارِ خُودی کی فلسفیانہ بنیاد'' میں تربیت خُودی کے تین مراحل بیان کیے ہیں۔'' (۱۲)

اسرارِ خُودی کے اشعار میں بھی تربیت خُودی کے عنوان کے تحت تینوں مراحل پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے:

مرحلہ اوّل: اطاعت — مرحلہ دوم: ضبطِ نفس — مرحلہ سوم: نیابت الٰہی

مرحلہ اول: اطاعت

علامہ اقبالؒ کے نزدیک خُودی کا پہلا مرحلہ ''اطاعت'' ہے۔ اطاعت کے مختلف مدارج ہیں۔ پہلا درجہ اطاعت الٰہی اور دوسرا درجہ اطاعت رسول ﷺ ہے۔ طاعت الٰہی سے مراد آئین خُداوندی (کتاب و سنت) کی صورت میں جو ضابطۂ حیات فراہم کیا گیا ہے اس پر صمیم قلب سے عمل پیرا ہوا جائے اور دوسرا درجہ اطاعت رسول ﷺ سے مراد سنت نبوی ﷺ پر عمل کرنا۔ علامہ اقبال کے نزدیک صرف اسلامی نظام حیات ہی بنی نوع انسان کے لیے سب سے زیادہ کامیاب اور بہترین نظام ہے۔

علامہ اقبالؒ مرحلہ اوّل ''اطاعت'' کا تصور اُونٹ کی مثال سے واضح کرتے ہوئے کہتے ہیں:

خدمت و محنت شعار اشتر است — صبر و استقلال کارِ اشتر است
گام او در راہ کم غوغا ستے — کارواں را ز ورقِ صحرا ستے
نقشِ پایش قسمت ہر بیشۂ — کم خُورد کم خواب و محنت پیشہ
مست زیر بارِ محمل می رود — پاے کُوباں سُوے منزل می رود
سر خود از کیفیت رفتار خویش — در سفر صابر تر از اسوارِ خویش
تو ہم از بارِ فرائض سر متاب — بر خوری از عندہ حسن المآب
(۱۳)

محنت اور خدمت اونٹ کا شیوہ ہے اور وہ اپنا یہ کام نہایت صبر و تحمل اور ثابت قدمی سے کرتا ہے۔ دبے پاؤں سفر طے کرتا ہے۔ کسی کو تنگ نہیں کرتا اور نہ ہی کسی کام میں خلل ڈالتا ہے۔ اسے ریگستان کی کشتی اور جہاز کہا جاتا ہے۔ ہر صحرا میں اس کے پاؤں کے خوب صورت نقش ملتے ہیں۔ کم کھانا، کم سونا اور محنت و مشقت میں جتے رہنا اس کی عادت ہے۔ اپنی پشت پر لدے کجاوے کے بوجھ تلے سرمستی کے عالم میں ناچتا

اور جھومتا ہوا اپنی منزل کی جانب گامزن رہتا ہے اور دورانِ سفر اپنے سوار سے زیادہ صبر وتحمل اور مُستقل مزاجی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ اونٹ کی ان تمام خوبیوں کا تذکرہ کرنے کے بعد علامہ اقبالؒ حضرت انسان سے ہم کلام ہوتے ہیں اور اسے بھی ناصحانہ انداز میں سمجھاتے ہیں کہ اے مومن تو بھی اپنے فرائض تندہی اور لگن سے سرانجام دے اور ان کی بجا آوری میں کوتاہی نہ کر اور خوش اسلوبی سے زیست کا سفر طے کرتا کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں بہترین اور اعلیٰ مقام کا حقدار ٹھہر سکے۔

مرحلہ دوم: ضبطِ نفس

ضبطِ نفس خودشناسی کی اعلیٰ ترین صورت ہے، اس سے مراد اپنے نفس پر ضبط کرنا ہے یعنی ہر اس بری خواہش سے پرہیز کیا جائے جو منافی آئین یعنی منافی اسلام ہو۔ اپنی خواہشات کو احکام الٰہی کے تابع کر دیا جائے کیوں کہ اسی طرح اطاعت کا عمل مکمل ہو سکتا ہے۔ علامہ اقبالؒ مرحلہ دوم ''ضبطِ نفس'' کے سلسلہ میں بھی اونٹ ہی کی مثال دیتے ہیں:

نفس تو مثلِ شتر خود پرور است — خود پرست و خود سوار و خود سر است
مرد شو آور زمام او بکف — تا شوی گوہر اگر باشی خزف
ہر کہ بر خود نیست فرمانش رواں — می شود فرماں پذیر از دیگراں
(۱۴)

علامہ اقبالؒ کہتے ہیں کہ اونٹ کی طرح تیرا نفس اپنی پرورش میں مست رہتا ہے اور اسی وجہ سے وہ انا پرست، خودسوار اور انتہائی سرکش ہے۔ تجھے چاہیے کہ دلیر مرد بن اور اس کی باگ کو اپنے ہاتھ میں لے تاکہ اگر کنکر بھی ہو تو وہ تیرے سامنے گوہر ہو جائے۔ جو اپنا حاکم نہیں اسے دوسروں کی غلامی اور حکم بجا آوری کرنا پڑتی ہے۔

ضبطِ نفس کے بارے میں علامہ اقبالؒ لکھتے ہیں:

''ضبطِ نفس افراد میں ہو تو خاندان کی تعمیر ہوتی ہے۔ قوم میں ہو تو سلطنتیں قائم ہوتی ہیں۔'' (۱۵)

نفس کو قابو میں رکھنا مشکل ہے لیکن علامہ اقبالؒ نے خُودی کو نفس سے زیادہ طاقت ور قرار دیا ہے۔ فرماتے ہیں:

یہ موجِ نفس کیا ہے؟ تلوار ہے!
خُودی کیا ہے؟ تلوار کی دھار ہے! (۱۶)

مرحلہ سوم: نیابتِ الٰہی

نیابتِ الٰہی سے مراد یہ ہے کہ انسان کو اللہ عزوجل نے اپنا نائب بنایا ہے۔ لہٰذا جس مقصد کے لیے زمین پر بھیجا گیا ہے وہ مقصد پورا کرے اور جنگ و جدل ختم کر کے امن قائم کرے۔ صلح و محبت اور انصاف کا پیغام عام کرے۔

گر شتر بانی جہانبانی کنی — زیبِ سر تاجِ سلیمانی کنی
تا جہاں باشد جہاں آرا شوی — تاجدارِ ملک لا یبلیٰ شوی
نائبِ حق در جہاں بودن خوش است بر عناصر — حکمراں بودن خوش است
نائبِ حق ہمچو جانِ عالم است — ہستیِ او ظلِ اسمِ اعظم است
از رموزِ جزو و کل آگہ بود — در جہاں قائم بامر اللہ بود
(۱۷)

چوں عناں گیرد بدست آں شہسوار — تیز تر گردد سمندِ روزگار
خشک سازد ہیبتِ او نیل را — می برد از مصر اسرائیل را
از قمِ او خیزد اندر گورتن — مردہ جانہا چوں صنوبر در چمن
ذاتِ او توجیہ ذاتِ عالم است — از جلالِ او نجاتِ عالم است
(۱۸)

''اس طرح خُودی انسان کو عظیم تر بنانے کے علاوہ اسے زندگی کا سراغ بھی دیتی ہے اور علامہ اقبالؒ نے خُودی کی معراج بیان کر کے انسان کو اس کے اصل مقام اور اس کی اصلیت سے آگاہ کیا ہے۔'' (۱۹)

اقبال کے ہاں خُودی کا تصور درحقیقت قرآن کریم کے نیابتِ الٰہی کے تصور کا آئینہ ہے، خُدا کی ذات لامتناہی قوتوں کا سرچشمہ ہے، خُدا کی مشیت اور قرآن کے سامنے خاک و افلاک، ذرہ و خورشید سب سربسجود ہیں۔

''انسان کا نصب العین یہ ہے کہ شمس و قمر، شجر و حجر اور کائنات کی وہ قوتیں جنھیں ملائکہ کہتے ہیں، سب کے سب اس کے لیے مسخر ہوں اور یہ اسی طرح ہو سکتا ہے کہ وہ مشیت ایزدی کے عرفان سے اپنی خُودی کو اُستوار کرتا چلا جائے، اس کی قوتِ تسخیر کی کوئی حد نہ ہوگی، نباتات و حیوانات اور اجرام فلکیہ پر اقتدار حاصل

کرنے کے بعد وہ ملائکہ، انبیا اور آخر میں خُدا کے ساتھ ہم کنار ہو سکے گا۔'' (۲۰)

''علامہ اقبالؒ نے خُودی کی تکمیل جو کہ حیات انسانی کی ترجیح ہے، کے لیے عشق کو اولیت دی ہے۔ خُودی کی تکمیل کے لیے ایسی قوت ہونی چاہیے جس کی مدد سے انسان اللہ تعالیٰ کے قریب ہو جائے، انسان اپنے ارتقا کے محدود دائرے میں خُودی کے کل مراحل طے کر لینے کے باوجود ناقص و ناتمام ہی رہتا ہے اور خُودی کی انتہا پہنچنے کے بعد بھی اس ذات مطلق کی کشش اسے اپنی طرف کھینچتی ہے جو ہر طرح سے اکمل و اعلیٰ ہے۔ اسی کشمکش کا نام عشقِ حقیقی ہے اور جس دل کے اندر عشق اپنا گھر بنا لے وہ گویا اپنی خُودی کی تکمیل کو پا لیتا ہے، اس کا مطلب ہے کہ انسان اور اس کے خالق کے درمیان اصل رشتہ عشق و محبت کا ہے۔ یہی عشق انسانیت کی تکمیل ہے اور یہی عشق انسان کی خُودی کے ارتقا کے امکانات کو وسیع سے وسیع تر کرتا چلا جاتا ہے۔'' (۲۱)

عشق بتاں سے ہاتھ اٹھا، اپنی خُودی میں ڈوب جا
نقش و نگارِ دیر میں خون جگر نہ کر تلف
(کلیاتِ اقبال، بالِ جبریل، صفحہ نمبر ۴۰۱)

''مثنوی ''اسرارِ خُودی'' میں اقبال نے جہاں خُودی کی ماہیت واضح کی ہے، وہاں یہ بھی بتایا ہے کہ اعلیٰ مقاصد رکھنے اور جذبۂ عمل و عشق سے کام لینے سے خُودی کمزور ہو جاتی ہے، اقبال نے اس تصور کو دین و دنیا کا ایک جامع تصور بنانے کے لیے اطاعت اور ضبطِ نفس کو اس کے لازمی مرحلے بتایا۔'' (۲۲)

''خُودی ایک حقیقت ہے جو اگر ایک عمیق اور پختہ تر شخصیت پیدا کر لی جائے تو ثبات و استحکام حاصل کر سکتی ہے۔'' (۲۳)

''فلسفہ خُودی علامہ اقبالؒ کے ذہن میں یورپ کے دوران قیام ہی میں پرورش پانے لگا تھا۔'' (۲۴)

زندگی نام ہے تلاش و جستجو کا، عشق الٰہی اور محبت رسول ﷺ سے خُودی مضبوط اور مستحکم ہوتی ہے اور اغیار سے سوال کرنے یا ان کے دست نگر اور محتاج ہونے سے خُودی کمزور اور ضعیف ہو جاتی ہے، اس لیے خوددار انسان کو کسی کا احسان نہیں اٹھانا چاہیے۔ ''جب عشق و محبت سے خُودی مستحکم ہو جاتی ہے تو پھر انسان کائنات کی ظاہری اور مخفی قوتوں کو مسخر کرتا ہے اور ان سے اپنی خدمت لے سکتا ہے۔'' (۲۵)

پیکر ہستی ز آثار خُودی است
ہر چہ می بینی ز اسرارِ خُودی است
(۲۶)

چوں حیات عالم از زورِ خُودی است
پس بہ قدرِ استواری زندگی است
(۲۷)

زندگی در جستجو پوشیدہ است
اصل او در آرزو پوشیدہ است
(۲۸)

ما ز تخلیقِ مقاصد زندہ ایم
از شعاع آرزو تابندہ ایم
(۲۹)

''حضرت سیّد مخدوم علی ہجویری کی زبانی اقبال اہل ملّت کو نصیحت کرتے ہیں کہ اپنے آپ کو کمزور و ناتواں نہ سمجھیں بلکہ قوی سے قوی دشمن کے مقابلے کے لیے تیار ہو جائیں۔ جب پتھر خود کو شیشے کی مانند کمزور سمجھنے لگتا ہے تو واقعی شیشہ بن کر ٹوٹنے لگتا ہے۔

تم اپنے آپ کو محض پانی اور مٹی کب تک سمجھتے رہو گے، اپنی خاک سے شعلۂ طور پیدا کرو۔ حیوان کی طرح کھانا اور سونا زندگی کا مقصد نہیں ہے۔ جب انسان اپنے آپ کو خُودی کی بنا پر مضبوط کر لیتا ہے اور سخت محنت و مشقت کرتا ہے تو اس سے دونوں جہاں روشن ہو جاتے ہیں اور وہ کائنات کی قوتوں کو مسخر کرتا ہے۔ زندگی کی آبرو سختی اور طاقت میں مضمر ہے۔ ناتواں اور کمزور ہونا بے چارگی اور ناتجربہ کاری پر دلالت کرتا ہے۔'' (۳۰)

یہ ذکر نیم شبی، یہ مراقبے، یہ سرور
تری خُودی کے نگہباں نہیں تو کچھ بھی نہیں
(۳۱)

انسان اعمال کا جواب دہ اور ذمہ دار اس لیے ہے کہ اسے آزادیِ عمل حاصل ہے۔ جس قدر کوئی انسان اللہ کا اطاعت گزار ہو اللہ تعالیٰ اسی قدر اسے آزادیِ عمل عطا کرتا ہے لیکن خُودی کی حدود و قیود کا تعین کر کے علامہ اقبالؒ نے ایک طرف انسان کو اپنی تقدیر آپ پیدا کرنے کی تحریک دی ہے۔

سمجھے گا زمانہ تری آنکھوں کے اشارے
دیکھیں گے تجھے دُور سے گردُوں کے ستارے
ناپید ترے بحرِ تخیل کے کنارے
پہنچیں گے فلک تک تری آہوں کے شرارے
تعمیرِ خُودی کر، اثرِ آہِ رسا دیکھ!
(۳۲)

ڈاکٹر سیّد عابد حسین کہتے ہیں کہ:

''خُودی کی غیر محدود قوت تعمیر و تخریب دونوں کام کرسکتی ہیں۔ خُودی سے تعمیر کا کام لینے کے لیے توسیع کے ساتھ ساتھ اس کی تادیب و تربیت بھی ضروری ہے۔ بے قید و بے تربیت خُودی کی مثال شیطان ہے جس کے متعلق اقبال کا نظریہ نہایت دلچسپ ہے وہ بھی گوئٹے کی طرح اسے خُودی اور تخلیق کی عظیم الشان قوت سمجھتے ہیں جو محبت اور اطاعت کی راہ مستقیم سے بھٹک گئی۔'' (۳۳)

اقبالؒ خُودی کی تعلیم کی جس کو ایک چوتھائی صدی تک وہ بار بار دہراتے رہے اور جو اُن کے پیام کا اہم ترین جُزو ہے۔ ان کے نزدیک مسلمانوں کی پستی اور ذلت کا بڑا سبب یہی ہے کہ وہ اپنے آپ کو بھول گئے ہیں اور اپنی پوشیدہ قوتوں سے واقف نہیں ہیں۔ اس پر وہ اس شد و مد کے ساتھ یقین رکھتے ہیں کہ منکرِ خُودی کو وہ منکرِ خُدا سے بڑھ کر کافر سمجھتے ہیں۔

منکر حق نزدِ ملا کافر است
منکر خود نزدِ من کافر تر است

اس طرح اقبالؒ نے مسلمانوں کے دلِ و دماغ سے احساس کمتری کو دور کرنے کی کوشش کی اور یہی مثنوی ''اسرار خُودی'' کا مرکزی موضوع ہے۔'' (۳۴)

''علامہ اقبالؒ نے خُودی کے لفظ کو ایک نیا رنگ و آہنگ دیا ہے۔ بعینہ بے خُودی کو بھی بالکل نئے معانی پہنائے ہیں۔ اگر خُودی سے علامہ کی مراد اثبات و تعین ذات ہے تو بے خُودی سے مراد فرد کا جماعت میں انضمام ہے، فرد جماعت کی محبت میں اپنے اختیار سے خُود دست بردار ہو جاتا ہے۔'' (۳۵)

''انسان کی نظر باطن سے پہلے خارج پر پڑتی ہے، آنکھ خارج کی ہر شے کو دیکھتی ہے لیکن اپنے آپ کو نہیں دیکھ سکتی۔ کہتے ہیں کہ عرفان کی تین قسمیں ہیں۔ دُنیا شناسی، خُدا شناسی اور خُود شناسی!''

اقبالؒ نے بھی جب انسان کی بے بضاعتی کے متعلق خُدا سے شکایت کی تو یہی کہا کہ کیا یہ تیرے ہنر کا شہکار ہے جو نہ خود بیں ہے، نہ خُدا بیں ہے اور نہ جہاں بیں؟ انسان مادی اور حیوانی حیثیت میں اپنے ماحول سے دست و گریباں ہوتا ہے۔ گرد و پیش کی اشیا اور حوادث کی ماہیت کو سمجھنا اس کے لیے تنازع للبقا میں ناگزیر ہوتا ہے۔'' (۳۶)

''بے خُودی میں ڈھلنے کے بعد خُودی ایک معاشرے کو صورت دیتی ہے۔ خُودی اور بے خُودی کے فلسفے کا لب لباب جسے اقبال نے دنیا کے سامنے ایک مفکر شاعر کی حیثیت سے پیش کیا اور جسے اقبال کا فلسفۂ حیات کہا جاتا ہے، فرد کو اپنی خُودی کی حفاظت و تربیت اس طور پر کرنی چاہیے کہ وہ ترقی کی انتہائی منزلوں تک پہنچ کر خُدا کا نائب حتیٰ کہ خُدا کی توجہ کا مرکز اور اس کے مدمقابل بن جائے۔'' (۳۷)

فارغ تو نہ بیٹھے گا محشر میں جنوں میرا
یا اپنا گریباں چاک یا دامنِ یزداں چاک
(۳۸)

''دوسری طرف وہ فرد کی خُودی کو ملّت کی خُودی میں ضم کر دینے یا ملّت پر قربان کر دینے کا مشورہ دیتے ہیں یعنی پہلے تو فرد کو خُودی کا درس دیا پھر اس کے بالکل متضاد، بے خُودی کا درس دیا اور اس طرح اپنے فلسفۂ حیات کو اجتماع ضدیّن بنا دیا۔ اعتراض جیسا کہ شیخ عبدالقادر مدیر مخزن نے اس کا جواب دیا ہے کہ ناقدین کی غلط فہمی پر مبنی ہے، اول تو یہ صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ اقبال نے ''رموز بے خُودی'' میں ان اصولوں سے کہیں انحراف نہیں کیا جو ''اسرار خُودی'' میں اصول زندگی قرار دیے گئے تھے اور دوسرے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ جہاں افراد کے لیے خُودی و خودداری کو ذریعۂ استواری ٹھہرایا گیا ہے وہیں یہ بتایا گیا ہے کہ انفرادی زندگی کے جزو کو قومی زندگی کے کل میں شامل کر دینا قومی ترقی و استحکام کے لیے ازبس ضروری ہے۔

''اس کا نام ''بے خُودی'' ہے اور یہ وہ بے خُودی ہے جیسا کہ اقبال نے رموز بے خُودی میں بار بار اس کی صراحت کی ہے جو انفرادی خودداری و خود شناسی کے بعد پیدا ہوتی ہے اور جو فرد و قوم دونوں کے لیے حد درجہ نفع بخش ہے۔'' (۳۹)

خود علامہ نے اکبر آلہ آبادی کو ایک خط میں لکھا ہے کہ:

''آپ مجھے تناقض کا ملزم گردانتے ہیں یہ بات درست نہیں، میں اس خُودی کا حامی ہوں جو سچی بے خُودی سے پیدا ہوتی ہے مگر ایک اور بے خُودی ہے جس کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ جو عاشقانہ شاعری کے

پڑھنے سے پیدا ہوتی ہے، یہ اس قسم سے ہے جو افیون و شراب کا نتیجہ ہے، دوسری وہ بےخُودی ہے جو بعض صوفیا اسلامیہ اور تمام ہندو جوگیوں کے نزدیک ذاتِ انسانی کو ذاتِ باری میں فنا کر دینے سے پیدا ہوتی ہے اور یہ فنا ذات باری میں ہے نہ احکام باری میں، پہلی قسم کی بےخُودی تو ایک حد تک مفید ہو سکتی ہے مگر دوسرے قسم کی بےخُودی تمام مذاہب و اخلاق کی جڑ کاٹنے والی ہے، میں ان دو قسموں کی بےخُودی پر معترض ہوں اور بس، حقیقی اسلامی بےخُودی میرے نزدیک اپنے ذاتی اور شخصی میلانات و رجحانات و تخیلات کو چھوڑ کر اللہ کے احکام کے پابند ہو جانا ہے، یہی اسلامی تصوّف کے نزدیک فنا ہے، البتہ عجمی تصوّف فنا کے کچھ اور معنی جانتا ہے۔'' (۴۰)

مثنوی مولانا رومؒ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ '' ہست قرآن در زبان پہلوی'' بالکل اسی طرح اقبالؒ نے اس بات کا دعویٰ کیا ہے کہ جزئیات میں بعض حکمائے مشرق و مغرب سے کہیں کہیں مماثلت رکھنے کے باوجود اُن کا فلسفہ خُودی و بےخُودی یا پیغام، قرآن حکیم کے مطالب سے ماخوذ ہے، رموز بےخُودی کے آخر میں، انھوں نے قسم کھا کر بڑی دردمندی سے بحضور رحمت اللعالمین ﷺ بیان کیا ہے کہ اگر اُن کا فلسفۂ حیات قرآنی تعلیم کی تفسیر کے سوا کچھ اور ہو تو انھیں اپنی رحمت سے محروم رکھیں۔'' (۴۱)

کافر بیدارِ دل، پیش صنم

بہ ز دین دارے کہ خفت اندر حرم

ظاہر ہے کہ یہ اندازِ فکر، اقبال کے مزاج اور ان کے فلسفۂ خُودی و بےخُودی کے عین مطابق ہے۔'' (۴۲)

"اقبالؒ کہتا ہے کہ زندگی کا اصل متحرک اثبات خُودی کا جذبہ ہے جو انسان میں ودیعت ہے۔ زندگی ایک مسلسل حرکت ہے جو نت نئی خواہشوں کی تخلیق کرتی ہے اور اس طرح اپنی توسیع و بقا کا سامان مہیا کرتی ہے۔ وہ پیہم عمل اور کش مکش سے لازوال ہو جاتی ہے۔ خُودی کی تکمیل میں سب سے بڑی رکاوٹ فطرت ہے جس پر غلبہ پانا ضروری ہے، انسانی خُودی مثل ایک سمندر کے ہے جس کا اور چھور نہیں اس کی وسعتیں اتنی ہی ہیں، جتنی خود انسان کی ہمت ہے۔" (۴۳)

"خُودی ایک واقعی حقیقت ہے، وہ وجود رکھتی ہے اور اپنے طور پر وجود رکھتی ہے۔ ہم وجدانی طور پر جانتے ہیں کہ وہ سب سے زیادہ حقیقی ہے ہم اس کی حقیقت کا براہ راست وجدان کر سکتے ہیں۔ اس طرح خُودی کا وجدان ہمیں اپنے ذاتی تجربے کی حقیقت کا غیر متزلزل ایقان مہیا کرتا ہے، نیز وجدان نہ صرف خُودی کی حقیقت کا اثبات کرتا ہے بلکہ اس کی ماہیت اور جوہر کو بھی ہم پر آشکارا کر دیتا ہے، خُودی جیسی کہ وہ وجدان میں منکشف ہوتی ہے۔" (۴۴)

''خُودی جو نام ہے ایک نقطہ نُوری کا، وہ کس طرح پھیل کر ثقافت کی وسعتوں پر محیط ہو جاتی ہے، اقبال کے نزدیک فرد اپنے اعمال کا بذات خود بھی محافظ اور ذمے دار ہے، اور اجتماع کا باشعور حصہ بن کر وہ اجتماع کے مقاصد کا بھی محافظ و معاون ہے اور اپنی خُودی کو اجتماع کی بےخُودی سے ہم آہنگ کر دیتا ہے۔'' (۴۵)

علامہ اقبالؒ نے خُودی کے متعلق کیا خوب اشعار لکھے ہیں،:

خُودی کی شوخی و تندی میں کبر و ناز نہیں

جو ناز ہو بھی تو بےلذت نیاز نہیں

(کلیات اقبال، بال جبریل، صفحہ نمبر ۳۹۹)

یہ پیام دے گئی ہے مجھے باد صبح گاہی

کہ خُودی کے عارفوں کا ہے مقام پادشاہی

(کلیات اقبال، بال جبریل، صفحہ نمبر ۴۰۷)

تیری زندگی اسی سے، تیری آبرو اسی سے

جو رہی خُودی تو شاہی، نہ رہی تو روسیاہی

(کلیات اقبال، بال جبریل، صفحہ نمبر ۴۰۸)

خُودی میں گم ہے خُدائی، تلاش کر غافل!

یہی ہے تیرے لیے اب صلاح کار کی راہ

(کلیات اقبال، بال جبریل، صفحہ نمبر ۴۰۹)

خُودی ہو علم سے محکم تو غیرت جبریل

اگر ہو عشق سے محکم تو صور اسرافیل

(کلیات اقبال، بال جبریل، صفحہ نمبر ۴۲۸)

"Iqbal points out that the centre of experience, i.e. the mind or self is the only reality in this world. And this is not the mere "thought" of Hegel ,or the "Experiences" (Sense-Perception) of Bradley, but the whole of personality, and that, too, "in a state of tension". This means: in personality is a self, carrying not only the impressions of its part responses to outside stimuli during its present life, but in addition all its inherited

responses since creation. It is an "attitude" poised like a Knife-edge to recieve stimuli, to Judge the same, and to take action." (46)

''بےخُودی میں ڈھلنے کے بعد خُودی ایک معاشرے کو صورت دیتی ہے، اقبال کا پسندیدہ معاشرہ وہی تھا جو اس کے اکابر نے اسلامی شورائیت کی شکل میں متشکل کیا تھا۔ یہ شورائیت بادشاہت اور ڈکٹیٹر شپ سے دور دور کا رشتہ بھی نہیں رکھتی تھی، اس کے تمام نہیں تو اکثر راستے جمہوریت کی طرف جاتے ہیں مگر اقبال نے عمومی جمہوری تماشوں پر ہمیشہ طنز کیا۔

اسرارِ خُودی سے بہت سے قارئین نے دھوکا کھایا اور سمجھا کہ یہ قوت اور تکبر کی تعلیم ہے اور اس میں انسان کی خُودی کو خُدا بنا دیا گیا ہے، اسرارِ خُودی میں خُدا کہیں نمایاں معلوم نہیں ہوتا: انسانی خُودی وہاں خلاق بن گئی ہے۔ ان نقادوں کو یہ علم نہ تھا کہ اقبال اس سے اچھی طرح آشنا تھا کہ بےخُودی بھی زندگی کا ایک پہلو ہے۔ اگرچہ بےخُودی کا مفہوم بھی اس کے نزدیک روایتی تصورات کا فقط ایک پہلو اسرارِ خُودی میں پیش ہوا تھا۔ اس کی تکمیل کے لیے دوسرے پہلو کو پیش کرنا لازمی تھا۔ رموزِ بےخُودی، اسرارِ خُودی کا تکملہ ہے، اقبال کے نظریاتِ حیات میں بحیثیت مجموعی ایک توازن موجود ہے۔ اگرچہ کلام کے بعض حصوں کو الگ الگ کر کے دیکھیں تو بعض اوقات فقط ایک پہلو کسی قدر شدت اور مبالغے کے ساتھ نظر کے سامنے آتا ہے۔''(۴۷)

''اسی کو خُودی کہتے ہیں اور اسی کا نام زندگی ہے۔ جماعت کے اندر گم ہو کر، یعنی بےخُودی اپنے آپ کو اُستوار کرتی ہے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آئین کے جبر نے اختیارِ فرد کو سوخت کر دیا ہے لیکن محبت اسی کا نام ہے کہ محب، محبوب کی ذات سے ہم آہنگ ہو جائے۔ خود شناسی سے کس طرح خُودی مضبوط ہوتی ہے؟ استدلال کے لیے یہ نکتہ آسانی سے قابلِ فہم نہیں، اس میں بظاہر تضاد معلوم ہوتا ہے۔''(۴۸)

''جب خُودی میں سے خوف و حزن کے عناصر ناپید ہو جائیں تو اس قسم کی بےخُودی کی حالت مستی و مدہوشی کے مماثل نہیں ہوتی بلکہ حوادث کے مقابلے میں ناقابلِ شکست حصہ مدافعت بن جاتی ہے، خُودی اور بےخُودی میں کوئی تضاد نہیں رہتا۔''(۴۹)

''اسی خیال کو حکایت شیر و شہنشاہ عالمگیر میں ایک تاریخی واقعے سے اُستوار کیا ہے۔ نمازِ عاشقاں میں ایک بےخُودی کی کیفیت ہوتی ہے کیوں کہ نفسِ انسانی اپنے تئیں کلیتاً خُدا کے سپرد کر دیتا ہے۔ اس سپردگی کی بدولت اس میں بےحد قوت اور بےنیازی پیدا ہو جاتی ہے۔ شیر نے عالمگیر پر دورانِ نماز میں حملہ کیا۔ کوئی معمولی انسان خوف زدگی میں شیر کا شکار ہو جاتا یا بےاختیار فرار کی کوشش کرتا لیکن عالمگیر کی بےخُودی میں خُودی

کی طاقت دیکھیے:

دست شہ نادیدہ خنجر بر کشید
شیرزہ شیری را شکم از ہم درید
دل بخود راہی نداد اندیشہ را
شیر قالین کرد شیر بیشہ را
(۵۰)

خُودی کی تکمیل کے لیے ایسی قوت ہونی چاہیے جس کی مدد سے انسان، اللہ تعالیٰ کے قریب ہو جائے۔ علامہ اقبالؒ نے انسان کی عظمت کو تصورِ خُودی سے مربوط کیا اور بتایا کہ اطاعتِ الٰہی اور ضبطِ نفس کے مراحل سے گزر کر اپنی خُودی کو اس قدر مضبوط کر لو کہ نیابتِ الٰہی کے بلند مرتبے کی غرض و غایت پوری کر سکو تا کہ اللہ تعالیٰ کا خلیفہ ہونے کا حق ادا ہو سکے۔ علامہ اقبالؒ نے خود بھی قلندرانہ اور فقیرانہ زندگی بسر کی ہے اور اپنی قوم میں بھی یہی صفات دیکھنا چاہتے تھے۔ اس طرح ایک خوددار ملّت وجود میں آ سکتی ہے۔

دیارِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر — نیا زمانہ، نئے صبح و شام پیدا کر
خُدا اگر دلِ فطرت شناس دے تجھ کو — سکوتِ لالہ و گل سے کلام پیدا کر
مرا طریق امیری نہیں، فقیری ہے — خُودی نہ بیچ، غریبی میں نام پیدا کر
(۵۱)

انسان دنیا کی سب سے اشرف ہستی ہے جس طرح کائنات کی خُودی چیزوں کو اپنے اندر جذب کرتی ہے۔ اسی طرح انسان بھی اپنے اندر قوت جاذبہ رکھتا ہے۔ انسان تو پوری کائنات کو اپنے اندر جذب کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ یہ خُودی کی اکمل صورت ہے یعنی خُودی کا عرفان حاصل کرنے کے بعد انسان کے لیے تسخیرِ فطرت بہت آسان ہو جاتی ہے کیوں کہ:

خُودی کی جلوتوں میں مُصطفائی
خُودی کی خلوتوں میں کبریائی
زمین و آسمان و کرسی و عرش
خُودی کی زد میں ہے ساری خُدائی
(۵۲)

علامہ اقبالؒ خُودی کے ضمن میں پوری مسلمان قوم کو متحد ہو کر بہ حیثیت قوم مستحکم و مضبوط دیکھنا چاہتے ہیں۔

خُودی کا سِرّ نہاں لَا اِلٰہ اِلّا اللّٰہ
خُودی ہے تیغ فَساں لَا اِلٰہ اِلّا اللّٰہ
یہ دَور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے
صَنَم کدہ ہے جہاں، لَا اِلٰہ اِلّا اللّٰہ
(۵۳)

حواشی

۱۔حمید یزدانی، خواجہ، ڈاکٹر، شرح اسرار و رموز (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء) ص: ۳

۲۔فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اقبال سب کے لیے (لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء) ص: ۹۱، ۹۲

۳۔علامہ اقبال کے بنیادی افکار و نظریات، کوڈ ۲۰۷ (اسلام آباد: علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، ۲۰۰۴ء) ص: ۲۵

۴۔جاوید اقبال، ڈاکٹر، افکار اقبال (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء) ص: ۲۵

۵۔غلام رسول مہر، مولانا، مطالب اسرار و رموز (لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز لمیٹڈ۔ن۔د) ص: ۳

۶۔عبدالشکور احسن، ڈاکٹر، اقبال کی فارسی شاعری کا تنقیدی جائزہ (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۰۰ء) ص: ۱۵

۷۔محمد اقبال، علامہ، کلیات اقبال (اردو) (لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۷۹ء) ص: ۴۱۹

۸۔منیر احمد یزدانی، پروفیسر، شعور اقبال (لاہور: ادبستان ریٹی گن روڈ، ۲۰۰۱ء) ص: ۱۸۱

۹۔عبدالواحد معینی، سیّد، مرتبہ مقالات اقبال (لاہور: آئینہ ادب، ۱۹۸۸ء) ص: ۱۹۹

۱۰۔محمد اقبال، علامہ، کلیات اقبال (اردو) (لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۷۹ء) ص: ۲۷۳

۱۱۔محمد اقبال، علامہ، کلیات اقبال (فارسی) (لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۷۹ء) ص: ۱۸

۱۲۔یوسُف سلیم چشتی، پروفیسر، شرح اسرار خُودی (لاہور: عشرت پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۷۹ء) ص: ۱۱۹

۱۳۔حمید اللہ شاہ ہاشمی، پروفیسر، شرح کلیات اقبال فارسی (لاہور: مکتبہ دانیال۔ن۔د) ص: ۷۳

۱۴۔حمید اللہ شاہ ہاشمی، پروفیسر، شرح کلیات اقبال فارسی (لاہور: مکتبہ دانیال۔ن۔د) ص: ۷۵

۱۵۔محمد اقبال، علامہ، شذرات فکر اقبال، مترجم افتخار احمد صدیقی، ڈاکٹر (لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۳ء) ص: ۷۶، ۷۷

۱۶۔محمد اقبال، علامہ، کلیات اقبال (اردو) (لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۷۹ء) ص: ۴۱۹

۱۷۔حمید اللہ شاہ ہاشمی، پروفیسر، شرح کلیات اقبال فارسی (لاہور: مکتبہ دانیال۔ن۔د) ص: ۷۸

۱۸۔حمید اللہ شاہ ہاشمی، پروفیسر، شرح کلیات اقبال فارسی (لاہور: مکتبہ دانیال۔ن۔د) ص: ۸۰

۱۹۔منیر احمد یزدانی، پروفیسر، شعور اقبال (لاہور: ادبستان، ریٹی گن روڈ، ۲۰۰۱ء) ص: ۱۸۵

۲۰۔عبدالحکیم، خلیفہ، ڈاکٹر، فکر اقبال (لاہور: بزم اقبال، ۱۹۶۸ء) س: ۴۴۴

۲۱۔منیر احمد یزدانی، پروفیسر، شعور اقبال (لاہور: ادبستان، ریٹی گن روڈ، ۲۰۰۱ء) ص: ۱۸۶، ۱۸۷

۲۲۔علامہ اقبال کے بنیادی افکار و نظریات، کوڈ ۲۰۷ (اسلام آباد: علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، ۲۰۰۴ء) ص: ۲۳

۲۳۔نذیر نیازی، سیّد، تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ (لاہور: بزم اقبال، ۲۰۱۰ء) ص: ۱۵۴

۲۴۔عبدالشکور احسن، ڈاکٹر، اقبال کی فارسی شاعری کا تنقیدی جائزہ (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۰۰) ص: ۱۷

۲۵۔رضی الدین صدیقی، ڈاکٹر، اقبال کا تصور زمان و مکان اور دوسرے مضامین (لاہور: مجلس ترقی ادب، جولائی ۲۰۱۴ء) ص: ۶۲

۲۶۔محمد اقبال، علامہ، کلیات اقبال (اردو) (لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۷۹ء) ص: ۲۵

۲۷۔محمد اقبال، علامہ، کلیات اقبال (اردو) (لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۷۹ء) ص: ۳۰

۲۸۔محمد اقبال، علامہ، کلیات اقبال (اردو) (لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۷۹ء) ص: ۳۳

۲۹۔محمد اقبال، علامہ، کلیات اقبال (اردو) (لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۷۹ء) ص: ۳۷

۳۰۔رضی الدین صدیقی، ڈاکٹر، اقبال کا تصور زمان و مکان اور دوسرے مضامین (لاہور: مجلس ترقی ادب، جولائی ۲۰۱۴ء) ص: ۶۴

۳۱۔محمد اقبال، علامہ، کلیات اقبال (اردو) (لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۷۹ء) ص: ۴۹۶

۳۲۔محمد اقبال، علامہ، کلیات اقبال (اردو) (لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۷۹ء) ص: ۵۱۱

۳۳۔علامہ اقبال کا خصوصی مطالعہ، کورس کوڈ ۵۶۱۳، شعبہ اردو (اسلام آباد: علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی،

۲۰۰۴ء)ص:۲۵

۳۴۔رضی الدین صدیقی، ڈاکٹر، اقبال کا تصور زمان و مکان اور دوسرے مضامین (لاہور: مجلس ترقی ادب، جولائی ۲۰۱۴ء)ص:۶۹

۳۵۔عبدالشکوراحسن،ڈاکٹر،اقبال کی فارسی شاعری کاتنقیدی جائزہ(لاہور:اقبال اکادمی پاکستان،۲۰۰۰)ص:۵۳

۳۶۔عبدالحکیم،خلیفہ،ڈاکٹر،فکراقبال (لاہور: بزم اقبال۔ ۲ کلب روڈ، اپریل ۲۰۱۳ء)ص:۳۳۶

۳۷۔فرمان فتح پوری،ڈاکٹر،اقبال سب کے لیے(لاہور:الوقار پبلی کیشنز،۲۰۰۶ء)ص:۱۰۷

۳۸۔فرمان فتح پوری،ڈاکٹر،اقبال سب کے لیے(لاہور:الوقار پبلی کیشنز،۲۰۰۶ء)ص:۱۰۷

۳۹۔مخزن،(لاہور،ستمبر ۱۹۱۸ء)ص:۳

۴۰۔مرتب عطااللہ، شیخ،اقبال نامہ مجموعہ مکاتیب اقبال (لاہور: اقبال اکادمی، ۲۰۱۲ء)ص:۳۷۸،۳۷۹

۴۱۔فرمان فتح پوری،ڈاکٹر،اقبال سب کے لیے(لاہور:الوقار پبلی کیشنز،۲۰۰۶ء)ص:۱۱۲

۴۲۔فرمان فتح پوری،ڈاکٹر،اقبال سب کے لیے(لاہور:الوقار پبلی کیشنز،۲۰۰۶ء)ص:۱۲۰

۴۳۔یوسف حسین خان،ڈاکٹر،رُوح اقبال (لاہور:القمر انٹر پرائز ز، مارچ ۲۰۱۰ء)ص:۱۲۹،۱۳۰

۴۴۔عشرت حسن انُور، ڈاکٹر، اقبال کی مابعدالطبیعات،مترجم، شمس الدین صدیقی، ڈاکٹر (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان،۱۹۸۸ء)ص:۶۱

۴۵۔عبداللہ،سیّد،ڈاکٹر،مطالعہ اُقبال کے چند نئے رخ (لاہور: بزم اقبال۔ ۲ کلب روڈ،۱۹۹۹ء)ص:۱۵۷ تا ۱۵۸

46. M. Saeed Sheikh," Studies in Iqbal's thought and art" (Lahore: Bazam-i- Iqbal, 1987) Page No. 67

۴۷۔عبدالحکیم،خلیفہ،ڈاکٹر،فکراقبال (لاہور: بزم اقبال، اپریل ۲۰۱۳ء)ص:۴۶۴،۴۶۵

۴۸۔عبدالحکیم،خلیفہ،ڈاکٹر،فکراقبال (لاہور: بزم اقبال، اپریل ۲۰۱۳ء)ص:۴۶۷

۴۹۔عبدالحکیم،خلیفہ،ڈاکٹر،فکراقبال (لاہور: بزم اقبال، اپریل ۲۰۱۳ء)ص:۴۷۱

۵۰۔عبدالحکیم،خلیفہ،ڈاکٹر،فکراقبال (لاہور: بزم اقبال، اپریل ۲۰۱۳ء)ص:۴۷۱

۵۱۔محمد اقبال، علامہ،کلیات اقبال (اردو) (لاہور: الفیصل ناشران،فروری ۲۰۰۶ء)ص:۵۲۹

۵۲۔محمد اقبال، علامہ،کلیات اقبال (اردو) (لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز،۱۹۷۹ء)ص:۳۷۵

۵۳۔محمد اقبال، علامہ،کلیات اقبال (اردو) (لاہور: الفیصل ناشران،فروری ۲۰۰۶ء)ص:۵۶۸

علامہ اقبالؒ کا تصوّرِ شاہین

حکیم الامت، مردِ خود بیں وخود آ گاہ مفکرِ ملّت علامہ اقبالؒ نوجوانوں کی خُفتہ صلاحیتوں کو بیدار کرنے کے لیے ''شاہین'' کی علامت استعمال کرتے ہیں۔ وہ نوجوانوں کو شاہین بنانا چاہتے ہیں ''شاہین'' فارسی زبان کا لفظ ہے۔ یہ ایک سفید رنگ کے شکاری پرندے کا نام ہے۔ علامہ اقبالؒ نے شاہین کو طاقت،قوت بازو اور مردانہ صفات کے مفہوم میں استعمال کیا ہے۔ علامہ اقبالؒ کے نزدیک شاہین میں وہ خصوصیات موجود ہیں جو ایک مردِ مومن میں ہونی چاہییں۔

جوانوں کو سوزِ جگر بخش دے — مرا عشق، میری نظر بخش دے
مرے دیدۂ تر کی بے خوابیاں — مرے دل کی پوشیدہ بے تابیاں
اُمنگیں مری، آرزوئیں مری — اُمیدیں مریٔ جستجوئیں مری
یہی کچھ ہے ساقی متاعِ فقیر — اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر
مرے قافلے میں لُٹا دے اسے — لُٹا دئے ٹھکانے لگا دے اسے!

(۱)

شاہین علامہ اقبالؒ کی محبوب علامت ہے ان کے خیال میں شاہین ایک ایسا پرندہ ہے جو انتہائی تیز رفتار ہے۔ جیسے وہ باز، عقاب اور شہباز کے ناموں سے بھی ظاہر کرتے ہیں۔ اسی لیے علامہ اقبالؒ اُردو ادب کے پسندیدہ پرندے بُلبل پر شاہین کو ترجیح دیتے ہیں کیوں کہ بلبل، طاؤس اور قمری میں صرف جمال ہی جمال ہے۔ جبکہ علامہ اقبالؒ جمال سے بھی زیادہ جلال کو پسند کرتے ہیں۔ علامہ اقبالؒ کوایسے پرندوں سے کوئی دلچسپی نہیں جن کی اہمیت صرف جمالیاتی ہے جو حرکت کے بجائے سکون کے پیامبر ہیں۔

''شاہین ہی میں پرواز کی وُسعت کی صلاحیت ہے۔اس کے برخلاف دوسرے طیور نے اپنے
آپ میں جمال کی وہ خصوصیات پیدا کی ہیں جن کا تعلق حرکت سے نہیں بلکہ سکون سے ہے۔ایسا جمال نباتات کو
زیب دیتا ہے۔دوسرے طیور جوارتقا کی اندھیاری گلیوں میں کھو گئے، یہ نہیں جانتے کہ شاہین کی وسعتِ پرواز
اس کی نظر کو بھی وسعت دیتی ہے کہ اس دنیا کے مظاہر متجسّس نگاہ پر یوں کھل جاتے ہیں جیسے انسانِ کامل کی نظر پر
زندگی کے تمام احوال ومقامات کھلتے ہیں۔''(۲) علامہ اقبالؒ محض حُسن و جمال کے رسیا نہیں وہ جمال کے ساتھ
ساتھ مردِ مومن میں جلال پیدا کرنے کے بھی خواہاں ہیں۔آپ بلبل وطاؤس کی تقلید سے منع کرتے ہیں:

کر بُلبل و طاؤس کی تقلید سے توبہ
بلبل فقط آواز ہے، طاؤس فقط رنگ!
(۳)

علامہ اقبالؒ نے اپنی شاعری میں شاہین کو ایک خاص علامت کی حیثیت سے پیش کیا ہے اُن کا
محبوب پرندہ ہے۔اقبالؒ کے ہاں اس کی وہی اہمیت ہے جو شیلے کے لیے سکائی لارک اور کیٹس کے لیے بلبل کی
تھی۔ بلکہ ایک لحاظ سے شاہین کی حیثیت بلند ہے کیوں کہ شاہین میں بعض ایسی صفات جمع ہوگئی ہیں۔ جو
علامہ اقبالؒ کی بنیادی تعلیمات سے ہم آہنگ ہیں، یوں تو علامہ اقبالؒ کے کلام میں بلبل، پروانہ، جگنو، کبوتر، ہرن،
طاؤس وغیرہ کا ذکر آیا ہے۔لیکن ان سب پر شاہین کو وہ ترجیح دیتے ہیں۔علامہ اقبالؒ نے تشبیہات واستعارات
میں بلبل وقمری کے بجائے شاہین کو ترجیح دی ہے۔

ترا اندیشہ افلاکی نہیں ہے
تری پرواز لولاکی نہیں ہے
یہ مانا اصل شاہینی ہے تیری
تری آنکھوں میں بے باکی نہیں ہے (۴)

علامہ اقبالؒ کو اپنی بلند پروازی، تیز اور عمیق نظری، غیرت اور سخت کوشی کی وجہ سے شاہین پسند
ہے۔علامہ اقبالؒ کی شاعری میں تصورِ شاہین خاص اہمیت کا حامل ہے۔وہ اُمت مسلمہ کے ہر نوجوان میں شاہینی
صفات دیکھنے کے متمنی ہیں۔ایسا شاہین جس کی پرواز فلک کی وُسعتوں کو چیر دے۔جو پُورب سے پچھّم تک کے
آسمانوں پر بادشاہت کرے۔جو اپنے لیے جہانِ تازہ کی تلاش کرے اور اس کے لیے افکارِ تازہ کی نمو کرے۔
علامہ اقبالؒ کی سیرت کی جھلک ''بالِ جبریل'' کی نظم ''شاہین'' میں جو علامہ اقبالؒ کے دور میں خرد

پروری کی یادگار رہے، یوں نظر آتی ہے۔

کیا مَیں نے اِس خاک داں سے کنارہ — جہاں رزق کا نام ہے آب و دانہ
بیاباں کی خلوَت خوش نظر آتی ہے مجھ کو — ازل سے ہے فطرت مری راہبانہ
نہ بادِ بہاری، نہ گلچیں، نہ بُلبل — نہ بیماری نغمۂ عاشقانہ
(۵)

ڈاکٹر یوسف حسین خان لکھتے ہیں کہ
''اقبالؒ کے وجدان اور جذبات شعری کو جو چیز سب سے زیادہ متحرک کرتی ہے وہ مظہر ''قوت''
ہے یہی وجہ ہے کہ وہ بلبل اور قمری کی تشبیہوں کی بجائے باز اور شاہین کو ترجیح دیتا ہے۔''(۶)
شاہین کی علامتی اہمیت کے متعلق خود اقبالؒ لکھتے ہیں
''شاہین کی تشبیہ محض شاعرانہ تشبیہ نہیں ہے اس پرندے میں اسلامی فقر کی تمام خصوصیات پائی جاتی
ہیں۔خود دار اور غیرت مند ہے کہ اور کسی کے ہاتھ کا مارا ہوا شکار نہیں کھاتا، بے تعلق ہے کہ آشیانہ نہیں بناتا' بلند
پرواز ہے، خلوت نشین ہے، تیز نگاہ ہے۔''
خلوت پسندی صوفیوں کی اصطلاحی خلوت پسندی نہیں۔اس سے یہ مراد نہیں کہ انسان دُنیا ہی سے
کٹ جائے گا بلکہ یہ مراد ہے کہ دنیا سے بے نیاز ہو کر غور وفکر کرے۔ظاہر ہے کہ تدبر وتفکر خلوت کے بغیر ممکن
نہیں۔باقی رہی تیز نگاہی تو یہ بصیرت کی رمز ہے۔جس طرح تیز نگاہ جانور دُور تک دیکھتا ہے، اسی طرح اُمت
محمدی ﷺ کے افراد بھی اپنی بصیرت کی بنا پر اپنے کارناموں کے اثرات اس مستقبل میں مشاہدہ کرتے ہیں
جسے دورانِ خالص کہتے ہیں اور جس کا وقتِ مسلسل سے کوئی علاقہ نہیں۔یہی بصیرت انسان کو آنی وفانی مسرّتوں
سے بے نیاز کر کے اسے ترغیب دلاتی ہے کہ اپنی نظر مستقبل کے اس اُفق پر رکھے، جو ابدیت میں تحلیل ہو جاتا
ہے۔''
''عزیز احمد نے شاہین کی علامتی اہمیت کی توضیح وتوجیہ بہت اچھی طرح کی ہے۔وہ لکھتے ہیں کہ
شاہین' اقبالؒ کے کلام میں حرکت' رفعتِ پرواز اور قوّت کی رمز ہے۔

بہ پرواز او شاہینی بی آموز
تلاشِ دانہ در خاشاک تا کے

پھر عقلِ خود بیں اور عقلِ جہاں بیں کا فرق کرتے ہوئے علامہ اقبالؒ لکھتے ہیں

عقلِ خود بیں دگر و عقلِ جہاں بیں دگر است
بالِ بلبل دگر و بازوئے شاہیں دگر است
دگر است آنکہ برد دانۂ افتادہ ز خاک
آنکہ گیرد خورش از دانۂ پرویں، دگر است''
(۷)

علامہ اقبالؒ کے نزدیک بلندیوں میں پرواز سے شاہین میں تیز نگاہی کی صفت پیدا ہوتی ہے جتنا زیادہ بلند پرواز کرتا ہے۔ اتنا ہی زیادہ اس کی منزل کو وسعت اور زیادہ مشاہدے کا موقع ملتا ہے۔ بڑے بڑے مناظر اس کی نگاہ میں آتے ہیں اور چھوٹی چھوٹی چیزیں اس کے لیے قابل توجہ نہیں رہتیں۔ وہ کنویں کا مینڈک بن کر نہیں رہتا بلکہ وسیع دنیا پر بھرپور نظر ڈالتا ہے اور تمام مناظر اس کی نگاہ میں ہوتے ہیں۔ اس طرح اس کے مقاصد بلند اور وسیع ہو جاتے ہیں اور وہ وقت اور زمانے کا قیدی نہیں بنتا اسی طرح ایک کامل اور مومن انسان حال کا پابند ہو کر نہیں رہتا اور نہ زمین سے چپک کر رہتا ہے۔ اس کی پرواز کائنات کی وُسعتوں کو بھی اپنے لیے تنگ اور محدود پاتی ہے۔

وہ یہ تمنا کرتا ہے بلکہ اپنے خالق سے یہ تقاضا کرتا ہے کہ ''یا مجھے ہمکنار کر یا مجھے بے کنار کر۔''(۸)

خیابانیوں سے ہے پرہیز لازم
ادائیں ہیں ان کی بہت دلبرانہ
ہوائے بیاباں سے ہوتی ہے کاری
جواں مرد کی ضربتِ غازیانہ
حمام و کبوتر کا بُھوکا نہیں میں
کہ ہے زندگی باز کی زاہدانہ
(۹)

''علامہ اقبالؒ کو نوجوانوں سے توقعات نسبتاً زیادہ تھیں۔ اس کی وجہ ظاہر ہے، عمر کی پختگی بے شک تدبر اور فراست سے کام لیتی ہے لیکن سود و زیاں کا شعور پختگیِ فکر میں اتنا گہرا ہوتا ہے کہ اکثر ذوقِ عمل اس پریشانی میں مُردہ ہو جاتا ہے کہ اس کام کا انجام کیا ہوگا۔ بڑھاپا بہت سوچتا ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اتنا سوچتا ہے کہ کچھ کر نہیں پاتا۔ اس کے برخلاف جوانی اگرچہ تجربے اور تدبر سے کم و بیش عاری ہوتی ہے لیکن ذوقِ عمل کی

بے پناہ قوتیں اپنے اندر مخفی رکھتی ہے۔ پھر یہ بھی ہے نوجوانوں کو بوڑھوں کے مقابلے میں زندگی کی دلچسپیاں کم عزیز ہوتی ہیں اور زندگی سے کم پیار ہوتا ہے۔''(۱۰)

یہ نیل گوں فضا جسے کہتے ہیں آسماں
ہمّت ہو پَر کُشا تو حقیقت میں کچھ نہیں
بالائے سر رہا تو ہے نام اس کا آسماں
زیرِ پَر آ گیا تو یہی آسماں، زمیں!
(۱۱)

علامہ اقبالؒ کے شاہین کی صفات

علامہ اقبالؒ نے ''شاہین'' کی جن خوبیوں کا ذکر شاعری میں کیا ہے اور جن کی وجہ سے وہ ان کا منظورِ نظر پرندہ ٹھہرا۔ ان کے کلامِ اقبال کی روشنی میں ''تصورِ شاہین'' کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ علامہ اقبالؒ کے نزدیک شاہین میں مندرجہ ذیل صفات پائی جاتی ہیں۔ اقبالؒ یہی صفات اُمتِ مسلمہ اور خاص طور پر نوجوان نسل میں دیکھنا چاہتے ہیں۔

۱۔ آزادی

شاہین قید و بند کی صعوبتوں سے آزاد پرندہ ہے اور اس کی اُڑان ہمیشہ کُھلی فضاؤں میں ہوتی ہے اور نیل گوں آسمان کی وسعتوں میں آزادی اور خودمختاری سے محوِ پرواز ہوتا ہے۔ علامہ اقبالؒ آزادی کی صفت کے دل دادہ ہیں اور مسلمانوں میں بھی اسی صفت کے پیدا ہونے کے متمنی ہیں۔ اقبالؒ کا شاہین میر و سلطان کا پالا ہوا باز ہرگز نہیں ہو سکتا بلکہ اس کے لیے آزادی ضروری ہے۔ علامہ اقبالؒ جب ہندوستان کے مسلمانوں کی غلامانہ ذہنیت کو دیکھتے ہیں تو بے ساختہ پکار اُٹھتے ہیں کہ

وہ فریب خوردہ شاہیں کہ پلا ہو کرگسوں میں
اُسے کیا خبر کہ کیا ہے رہ و رسمِ شاہبازی
(۱۲)

پروفیسر عزیز احمد ''اقبال نئی تشکیل'' میں رقم طراز ہیں:

''اس وسعت پرواز کے باعث' حیات کی ایک اور بڑی قدر شاہین میں نمایاں ہوتی ہے، یہ آزادی ہے۔شاہین کی وسعت پرواز یا اس کی نشوونما محض آزادی کی حالت میں ممکن ہے ورنہ غلامی میں شاہین تذرو سے بھی زیادہ بزدل بن جائے گا۔غلامی شاہین کی آنکھوں کو اندھا کر دیتی ہے۔'' (۱۳)

فیضِ فطرت نے تجھے دیدۂ شاہیں بخشا
جس میں رکھ دی ہے غلامی نے نگاہِ خفّاش
(۱۴)

۲۔آشیانہ نہ بنانا

شاہین اپنا آشیانہ وٹھکانا بنانے سے قطعاً بے نیاز ہے۔جس طرح وہ کھلی اور آزاد فضاؤں میں اُڑانیں بھرتا ہے اسی طرح وہ کسی خاص جگہ کا پابند نہیں ہے بلکہ پوری دنیا و کائنات کو اپنا نشیمن تصور کرتا ہے۔اقبالؒ شاہین کی صفت کے بھی معترف ہیں کہ فقر و عاجزی میں زندگی بسر کرتا ہے۔اسی طرح مردِ مومن بھی جغرافیائی وعلاقائی حدود وقیود سے آزاد ہوجاتا ہے اور پوری دنیا اس کا وطن ومسکن ہے۔

گزر اوقات کر لیتا ہے یہ کوہ و بیاباں میں
کہ شاہیں کے لیے ذلّت ہے کارِ آشیاں بندی
(۱۵)

شاہین کی طرح درویش بھی سرمایہ جمع کرنے کو درویشی کے خلاف سمجھتا ہے۔

پرندوں کی دنیا کا درویش ہوں میں
کہ شاہیں بناتا نہیں آشیانہ
(۱۶)

علامہ اقبالؒ شاہین کو قصر سلطانی کے گنبد پر نہیں بلکہ پہاڑوں کی چٹانوں میں بسیرا کرنے کے لیے کہتے ہیں ان کے خیال میں جب نوجوانوں میں عُقابی رُوح بیدار ہوتی ہے تو انھیں اپنی منزل آسمانوں میں نظر آتی ہے۔

عقابی رُوح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں
نظر آتی ہے اُن کو اپنی منزل آسمانوں میں
نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر
تو شاہیں ہے، بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں (۱۷)

۳۔بلند پروازی

شاہین کی بہت سی خوبیوں میں سے ایک نمایاں خوبی بلند اُس کی بلند پروازی ہے۔سب پرندوں سے زیادہ بلند پرواز کرنے والا ہے۔یہی خوبی اسے تمام پرندوں سے ممتاز کرتی ہے۔اقبالؒ شاہین کی اس خوبی کو مردِ مومن کے لیے تجویز کرتے ہیں کیوں کہ وہ بلند پروازی سے مراد عزائم کی بلندی اور مختلف علوم وفنون میں نئے نئے انکشافات لیتے ہیں۔عزم و ہمت کی بلند پروازی تسخیر کائنات کے لیے نئے در وَا کرتی ہے اور نوجوان نسل کو تسخیر کائنات کی دعوت دیتی ہے۔غور وفکر کی بلندی انسانیت کے عروج کی کنجی ہے۔

تہی زندگی سے نہیں یہ فضائیں
یہاں سیکڑوں کارواں اور بھی ہیں
(۱۸)

قناعت نہ کر عالمِ رنگ و بو پر
چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں
تُو شاہیں ہے، پرواز ہے کام تیرا
ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں
(۱۹)

۴۔تیز نگاہی

شاہین تیز نگاہی کی صفت کی بدولت دیگر تمام پرندوں سے بڑھ کر ہے۔وسیع وعریض فضاؤں میں پرواز کرتے ہوئے ہر سُو نظر رکھتا ہے۔اقبالؒ اپنے شاہینوں میں بھی اس وسعت نگاہی اور بصیرت کے خواہاں ہیں کہ وہ اسی بصیرت اور دور اندیشی کی بدولت آنے والے وقت اور حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہ سکیں اور اپنے آپ کو بہترین ثابت کر سکیں۔

زاغ کہتا ہے نہایت بدنما ہیں تیرے پر
شپّرک کہتی ہے تجھ کو کور چشم و بے ہُنر

لیکن اَے شہباز! یہ مرغانِ صحرا کے اچُھوت
ہیں فضائے نیل گُوں کے پیچ و خم سے بےخبر
ان کو کیا معلوم اِس طائر کے احوال و مقام
رُوح ہے جس کی دمِ پرواز سر تا پا نظر!
(۲۰)

شاہین کی تیز نگاہ علامہ اقبالؒ کے نزدیک بصیرت کی علامت ہے۔شاہین کا مقابلہ کوئی اور پرندہ نہیں کرسکتا۔ایک جگہ علامہ اقبالؒ نے ''چیونٹی اور عقاب'' کے بارے میں اشعار لکھے ہیں۔چیونٹی کہتی ہے کہ

مَیں پائمال و خوار و پریشان و درد مند
تیرا مقام کیوں ہے ستاروں سے بھی بلند؟

اس کے جواب میں عقاب کہتا ہے کہ

تُو رزق اپنا ڈھونڈتی ہے خاکِ راہ میں
میں نُہ سِپہر کو نہیں لاتا نِگاہ میں!
(۲۱)

۵۔تجسّس

شاہین متجسس نگاہ کا مالک پرندہ ہے، جو اسے بلند سے بلند پرواز کی طرف جانے کو اکساتا ہے۔یہی خوبی علامہ اقبالؒ اپنے شاہینوں میں دیکھنا چاہتے ہیں کیوں کہ جستجو کا مادہ انسان کو بےکار و فضول نہیں رہنے دیتا بلکہ ہر گھڑی اسے نئے نئے رازوں سے پردہ اُٹھانے کے لیے مصروف رکھتا ہے۔اسی لیے علامہ اقبالؒ کے نزدیک ہمارے لیے یورپی ترقی اور علم وفن اہم نہیں جتنا تجسس کا ذوق ضروری ہے، کیوں کہ اس کی بدولت ہم تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر اہلِ مغرب کی ترقی کو بھی مات دے سکتے ہیں۔

چیتے کا جگر چاہیے، شاہیں کا تجسس
جی سکتے ہیں بےروشنی دانش و فرہنگ (۲۲)

علامہ اقبالؒ ملک کے نوجوانوں کو شاہین بچے قرار دیتے ہیں جو اگرچہ شاہین کی صفات رکھتے ہیں لیکن بدقسمتی سے ان کو مناسب تعلیم وتربیت نہیں دی جاتی۔آپ مروجہ تعلیم کے خلاف اللہ عزوجل سے شکایت کرتے ہوئے کہتے ہیں:

شکایت ہے مجھے یارب! خُداوندانِ مکتب سے
سبق شاہیں بچوں کو دے رہے ہیں خاکبازی کا
(۲۳)

اَسرارِ پیدا

اُس قوم کو شمشیر کی حاجت نہیں رہتی
ہو جس کے جوانوں کی خُودی صورتِ فولاد
شاہیں کبھی پرواز سے تھک کر نہیں گرتا
پُر دم ہے اگر تُو تو نہیں خطرۂ اُفتاد
(۲۴)

۶۔خلوت پسندی

شاہین تمام پرندوں سے بےگانہ اور الگ تھلگ رہتا ہے۔اس کا میل جول کوؤں اور کرگسوں سے ہرگز نہیں بلکہ وہ ان سے کنارہ کشی اختیار کرتا ہے۔اقبالؒ شاہین اس صفت ''خلوت پسندی'' کو پسند فرماتے ہیں اور اس سے مراد بری صحبت سے دوری اور کنارہ کشی لیتے ہیں اور اس صفت کو مردِ مومن میں بھی پروان چڑھانا چاہتے ہیں کہ وہ بری صحبت اور محفل سے دور رہے اور اپنی تمام تر توانائیوں کو کائنات کے اسرار و رموز پر غور وفکر اور ان کے عقدے کھولنے پر صرف کرے۔

اس کے برعکس بری صحبت کے اثرات اس کی تمام صلاحیتوں کو ماند کر دیتے ہیں اور ذہن کو مفلوج کر دیتے ہیں۔بری صحبت اختیار کرنے سے انسان میں برائیاں پیدا ہوجاتی ہیں۔اگر شاہین کا بچہ کوؤں کی صحبت اختیار کر لے تو اس کی عادات بگڑ جائیں گی اور اگر وہ کوؤں کو بلند پروازی کا سبق دینے لگے تو کوے کبھی بھی شاہین کی ریس نہیں کر سکیں گے۔

ہوئی نہ زاغ میں پیدا بلند پروازی
خراب کر گئی شاہیں بچے کو صحبتِ زاغ (۲۵)

پرواز ہے دونوں کی اسی فضا میں
کرگس کا جہاں اور ہے، شاہیں کا جہاں اور
(۲۶)

وہ فریب خوردہ شاہیں کہ پلا ہو کرگسوں میں
اُسے کیا خبر کہ کیا ہے رہ و رسمِ شاہبازی
(۲۷)

۷۔سخت کوشی

علامہ اقبالؒ جدوجہد اور سخت کوشی کے مبلغ ہیں یہ صفت بھی شاہین میں موجود ہے۔سخت کوشی/محنت اور جدوجہد کامیابی وکامرانی کی ضمانت دیتی ہے۔یہ خوبی شاہین میں موجود ہے کہ وہ محنت اور کوشش سے اپنا شکار کرتا ہے اور پیٹ بھرتا ہے۔مُردار یا دوسرے کا کیا ہوا شکار ہرگز نہیں کھاتا۔اقبالؒ نوجوان نسل میں اس خوبی کی پیداوار کے خواہش مند ہیں کہ تن آسانی سے قومیں تباہ و برباد اور نسلیں بے کار ہو جاتی ہیں جب کہ محنت، کوشش اور جدوجہد کی بدولت انھیں اپنی منزل آسمانوں میں نظر آتی ہے۔

بچۂ شاہیں سے کہتا تھا عقابِ سال خوردہ
اے ترے شہپر پہ آساں رفعتِ چرخِ بریں
ہے شباب اپنے لہو کی آگ میں جلنے کا نام
سخت کوشی سے ہے تلخِ زندگانی انگبیں
سخت کوشی دراصل لہو گرم رکھنے کا اک بہانہ ہے
جو کبوتر پر جھپٹنے میں مزا ہے اے پسر!
وہ مزا شاید کبوتر کے لہو میں بھی نہیں (۲۸)

جھپٹنا، پلٹنا، پلٹ کر جھپٹنا
لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ

یہ پورب، یہ پچھّم چکوروں کی دنیا
مرا نیلگوں آسماں بے کرانہ
(۲۹)

نوا پیرا ہو اَے بُلبل کہ ہو تیرے ترنُّم سے
کبوتر کے تنِ نازک میں شاہیں کا جگر پیدا
(۳۰)

۸۔غیرت وخُودداری

غیرت وخودداری درویش کی سب سے بڑی صفت ہے، اور یہی حال شاہین کا بھی ہے اس لیے وہ مرغ سرا کے ساتھ دانہ نہیں چگتا جو دوسروں کے احسان کے باعث ملتا ہے اور نہ کرگس کی طرح مردہ شکار کھاتا ہے۔درویش اور فلسفی میں یہی فرق ہے کہ گدھ اُونچا تو اُڑ سکتا ہے لیکن شکار زندہ یعنی حقیقت اس کے نصیب میں نہیں ہوتی۔

بلند بال تھا لیکن نہ تھا جسور و غیور
حکیم سرِ محبت سے بے نصیب رہا
پھرا فضاؤں میں کرگس اگرچہ شاہیں وار
شکارِ زندہ کی لذت سے بےنصیب رہا
(۳۱)

علامہ اقبالؒ کا خیال ہے کہ جس طرح شاہین میں غیرت موجود ہے، اسی طرح نوجوانوں میں بھی غیرت کا مادہ موجود ہونا چاہیے۔علامہ اقبالؒ کے نزدیک غیرت درحقیقت راہ طریقت ہے،

غیرت ہے طریقتِ حقیقی — غیرت سے ہے فقر کی تمامی
اے جانِ پدر! نہیں ہے ممکن — شاہیں سے تذرو کی غلامی
(۳۲)

۹۔فقر و استغنا

فقر و استغنا بھی علامہ اقبالؒ کے نزدیک مردِ مومن کی بڑی خصوصیت ہے۔جس طرح شاہین کو چکور اور کرگس کی صحبت سے گریز کرنا چاہیے۔زاغ و کرگس کی صحبت میں شاہین کی زندہ شکار حاصل کرنے کی صلاحیت مردہ ہو جائے گی اور وہ اُن ہی کی طرح لالچی بن کر فقر سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔اس طرح شاہین کی صفات پیدا کر کے فقیر بھی کسی کبوتر یا فاختہ کا شکار نہیں کھیلے گا بلکہ وہ فطرت و کائنات کی تسخیر کرے گا یا باطل کی قوتوں کا مقابلہ کرے گا۔

اس فقر سے آدمی میں پیدا — اللہ کی شان بے نیازی
کنجشک و حمام کے لیے موت — ہے اُس کا مقام شاہبازی
(۳۳)

۱۰۔قوت اور توانائی

علامہ اقبالؒ کو شاہین اس لیے پسند ہے کہ وہ طاقتور ہے قوت اور توانائی کے تمام مظاہر علامہ اقبالؒ کو بہت مرغوب ہیں۔اقبالؒ کو طاؤس، بلبل اور قمری اسی لیے پسند نہیں کہ محض جمال ہے۔کبوتر اور تیتر جیسے پرندے محض اپنی کمزوری کی وجہ سے شکار ہو جاتے ہیں۔اس بات کو علامہ اقبالؒ نے اپنی بال جبریل کی نظم ''ابوالعلامعرّی'' سے واضح کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ ابوالعلامعرّی (مشہور عربی شاعر، صوفی اخلاق کا درس دینے والا) کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ وہ کبھی گوشت نہیں کھاتا تھا۔ایک دوست نے ترغیب دینے کے لیے ایک بھنا ہوا تیتر اسے بھیجا۔بجائے اس کے کہ اس لذیذ پکوان کو دیکھ کر تیتر کی تعریف کرتا، اس نے اپنا فلسفہ چھانٹنا شروع کر دیا۔تیتر سے مخاطب کر کے کہا تجھے معلوم ہے کہ تو گرفتار ہو کر اس حالت کو کیوں پہنچا اور وہ کون سا گناہ ہے جس کی سزا تجھے موت کی صورت میں ملی ہے؟ سن!

افسوس، صد افسوس کہ شاہیں نہ بنا تو
دیکھے نہ تری آنکھ نے فطرت کے اشارات
تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے
ہے جُرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات! (۳۴)

علامہ اقبالؒ اپنی نظم ''جلال و جمال'' میں افلاطون کے تیز ادراک کے مقابلے میں زورِ حیدری کو زندگی کے لیے زیادہ اہم سمجھتے ہیں۔

مرے لیے ہے فقط زورِ حیدری کافی
ترے نصیب فلاطوں کی تیزیِ اِدراک
مری نظر میں یہی ہے جمال و زیبائی
کہ سر بسجدہ ہیں قُوت کے سامنے افلاک
(۳۵)

علامہ اقبالؒ شاہین کو بہت سی خوبیوں کی بنا پر پسند کرتے ہیں اور شاہین کے استعارے کے توسط سے مسلم نوجوانوں میں بھی شاہینی صفات بیدار کرنا چاہتے ہیں۔اسلامی فقر و غناء، خودداری اور غیرت مندی کے اصل معنی سمجھانا چاہتے ہیں۔ان کے نزدیک عزت و وقار اور سربلندی سے جینے کے لیے اپنے اندر شاہین کی سی صفات کا پیدا کرنا ضروری ہے۔علامہ اقبالؒ نوجوان نسل کو شاہین سے تعبیر کرتے ہیں۔وہ زمین کی پستیوں سے بلندیوں کی طرف بڑھیں، ملک و ملّت کی ترقی و خوشحالی کے لیے اپنی تمام تر کوششیں بروئے کار لائیں۔اپنے حقوق و فرائض کو سمجھیں اور انھیں بخوبی سرانجام دیں۔عزم و ہمت کا پیکر بنیں۔مصائب و مشکلات کا مقابلہ ڈٹ کر کریں اور کفر و الحاد کی جنگ میں سیسہ پلائی دیوار بن جائیں۔اپنے آپ کو پستیوں سے نکال کر آسمان کی بلندیوں کی طرف لے جائیں۔

جوانوں کو مری آہ سَحر دے — پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے
خُدایا! آرزو میری یہی ہے — مرا نُورِ بصیرت عام کر دے
(۳۶)

حواشی

۱۔محمد اقبال،کلیاتِ اقبال(اُردو)بالِ جبریل(لاہور:الفیصل ناشران،فروری۲۰۰۶ء)ص:۵۰۱،۵۰۲

۲۔عابد علی عابد،سیّد،شعرِ اقبال(لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز،۲۰۱۱ء)ص:۲۱۲

۳۔محمد اقبال،کلیاتِ اقبال(اُردو)بالِ جبریل(لاہور:الفیصل ناشران،فروری۲۰۰۶ء)ص:۴۴۴

۴۔محمد اقبال،کلیاتِ اقبال(اُردو)بالِ جبریل(لاہور:الفیصل ناشران،فروری۲۰۰۶ء)ص:۴۵۱

۵۔محمد اقبال،کلیاتِ اقبال(اُردو)بالِ جبریل(لاہور:الفیصل ناشران،فروری۲۰۰۶ء)ص:۵۴۷،۵۴۸

۶۔محمد اکرم سعید، پروفیسر،اقبال کا خصوصی مطالعہ(لاہور؛عبداللہ برادرز۔ن۔د)ص:۲۳۸

۷۔عابد علی عابد،سیّد،شعرِ اقبال(لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز،۲۰۱۱ء)ص:۲۱۲، ۲۱۳

۸۔نواب عالم بارہوی،سیّد،کرنل،بصیرتِ اقبال(راولپنڈی: پیپ بورڈ پرنٹرز(پرائیویٹ لمٹیڈ)۱۹۹۰ء)ص:۷۰،۷۱

۹۔محمد اقبال،کلیاتِ اقبال(اُردو)بالِ جبریل(لاہور:الفیصل ناشران،فروری۲۰۰۶ء)ص:۵۴۷،۵۴۸

۱۰۔عابد علی عابد،سیّد،شعرِ اقبال(لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز،۲۰۱۱ء)ص:۲۱۲

۱۱۔محمد اقبال،کلیاتِ اقبال(اُردو)ضربِ کلیم(لاہور:الفیصل ناشران،فروری۲۰۰۶ء)ص:۷۱۷

۱۲۔محمد اقبال،کلیاتِ اقبال(اُردو)بالِ جبریل(لاہور:الفیصل ناشران،فروری۲۰۰۶ء)ص:۳۷۵

۱۳۔۔محمد اکرم سعید، پروفیسر،اقبال کا خصوصی مطالعہ(لاہور؛عبداللہ برادرز۔ن۔د)ص:۲۴۶

۱۴۔محمد اقبال،کلیاتِ اقبال(اُردو)ضربِ کلیم(لاہور:الفیصل ناشران،فروری۲۰۰۶ء)ص:۶۳۳

۱۵۔محمد اقبال،کلیاتِ اقبال(اُردو)بالِ جبریل(لاہور:الفیصل ناشران،فروری۲۰۰۶ء)ص:۳۷۲

۱۶۔محمد اقبال،کلیاتِ اقبال(اُردو)بالِ جبریل(لاہور:الفیصل ناشران،فروری۲۰۰۶ء)ص:۵۴۷،۵۴۸

۱۷۔محمد اقبال،کلیاتِ اقبال(اُردو)بالِ جبریل(لاہور:الفیصل ناشران،فروری۲۰۰۶ء)ص:۴۹۶

۱۸۔محمد اقبال،کلیاتِ اقبال(اُردو)بالِ جبریل(لاہور:الفیصل ناشران،فروری۲۰۰۶ء)ص:۴۹۶

۱۹۔محمد اقبال،کلیاتِ اقبال(اُردو)بالِ جبریل(لاہور:الفیصل ناشران،فروری۲۰۰۶ء)ص:۴۹۶

۲۰۔محمد اقبال،کلیاتِ اقبال(اُردو)ضربِ کلیم(لاہور:الفیصل ناشران،فروری۲۰۰۶ء)ص:۷۱۰

۲۱۔محمد اقبال،کلیاتِ اقبال(اُردو)بالِ جبریل(لاہور:الفیصل ناشران،فروری۲۰۰۶ء)ص:۵۵۲

۲۲۔محمد اقبال،کلیاتِ اقبال(اُردو)بالِ جبریل(لاہور:الفیصل ناشران،فروری۲۰۰۶ء)ص:۴۴۴

۲۳۔محمد اقبال،کلیاتِ اقبال(اُردو)بالِ جبریل(لاہور:الفیصل ناشران،فروری۲۰۰۶ء)ص:۳۹۲

۲۴۔محمد اقبال،کلیاتِ اقبال(اُردو)ضربِ کلیم(لاہور:الفیصل ناشران،فروری۲۰۰۶ء)ص:۶۲۲،۶۲۳

۲۵۔محمد اقبال،کلیاتِ اقبال(اُردو)بالِ جبریل(لاہور:الفیصل ناشران،فروری۲۰۰۶ء)ص:۳۹۲

۲۶۔محمد اقبال،کلیاتِ اقبال(اُردو)بالِ جبریل(لاہور:الفیصل ناشران،فروری۲۰۰۶ء)ص:۵۳۹

۲۷۔محمد اقبال،کلیاتِ اقبال(اُردو)بالِ جبریل(لاہور:الفیصل ناشران،فروری۲۰۰۶ء)ص:۳۷۵

۲۸۔محمد اقبال،کلیاتِ اقبال(اُردو)بالِ جبریل(لاہور:الفیصل ناشران،فروری۲۰۰۶ء)ص:۴۹۶

۲۹۔محمد اقبال،کلیاتِ اقبال(اُردو)بالِ جبریل(لاہور:الفیصل ناشران،فروری۲۰۰۶ء)ص:۵۴۷،۵۴۸

۳۰۔محمد اقبال،کلیاتِ اقبال(اُردو)بانگِ درا(لاہور:الفیصل ناشران،فروری۲۰۰۶ء)ص:۳۲۸

۳۱۔محمد اقبال،کلیاتِ اقبال(اُردو)بالِ جبریل(لاہور:الفیصل ناشران،فروری۲۰۰۶ء)ص:۵۴۷

۳۲۔محمد اقبال،کلیاتِ اقبال(اُردو)ضربِ کلیم(لاہور:الفیصل ناشران،فروری۲۰۰۶ء)ص:۶۳۸

۳۳۔محمد اقبال،کلیاتِ اقبال(اُردو)ضربِ کلیم(لاہور:الفیصل ناشران،فروری۲۰۰۶ء)ص:۶۳۹

۳۴۔محمد اقبال،کلیاتِ اقبال(اُردو)بالِ جبریل(لاہور:الفیصل ناشران،فروری۲۰۰۶ء)ص:۵۴۰

۳۵۔محمد اقبال،کلیاتِ اقبال(اُردو)ضربِ کلیم(لاہور:الفیصل ناشران،فروری۲۰۰۶ء)ص:۶۶۹

۳۶۔محمد اقبال،کلیاتِ اقبال(اُردو)بالِ جبریل(لاہور:الفیصل ناشران،فروری۲۰۰۶ء)ص:۴۵۵

علامہ اقبالؒ کا نظریہ فن (ادب)

علامہ محمد اقبالؒ ایک فرد نہیں تھے بلکہ اپنی ذات میں ایک انجمن تھے، وہ ایک چراغ تھے جو زندگی کے ہر شعبے کو منوّر کر گئے۔ شعر و شاعری میں کوئی ثانی نہ رکھتے تھے۔ اُردو فارسی کلام بے مثال ہے اور نثری مضامین میں فن طاق رکھتے تھے۔ علامہ اقبالؒ اُردو و فارسی شعر و ادب میں نمایاں مقام پر فائز ہیں وہ ایک ایسے زیرک اور باکمال شاعر ہیں جو فکر و فلسفہ کو شعر و سخن کی مالا میں پرونے میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ علامہ اقبالؒ کے کلام میں حکمت و دانائی، ہیئت و شعری وسائل کی امتزاج سے اثر پذیری کی بے پناہ قوت کی حامل ہوگی۔ علامہ اقبالؒ خود بھی شاعر کہلوانے سے گریز کرتے ہوئے نظر آتے ہیں اور آپ نے تعلّی کی بجائے کسرِ نفسی سے کام لیتے ہوئے بہت سے مقامات پر خود کو شاعر بھی تسلیم نہیں کیا۔

خوش آگئی ہے جہاں کو قلندری میری
وگرنہ شعر مرا کیا ہے، شاعری کیا ہے!

(کلیاتِ اقبال، بالِ جبریل، ص: ۴۱۲)

تمام مضموں مرے پرانے، کلام میرا خطا سراپا
ہُنر کوئی دیکھتا ہے مُجھ میں تو عیب ہے میرے عیب جُو کا

(کلیاتِ اقبال، بانگِ درا، ص: ۱۷۵)

علامہ اقبالؒ ایک عظیم فن کار ہی نہیں ایک واضح نظریہ بھی رکھتے ہیں ان کی شاعری ان کے نظریے کی

ترجمان ہے۔ اس لیے علامہ اقبالؒ کی شاعری سمجھنے کے لیے ان کا نظریہ فن سمجھنا ضروری ہے۔ ہر بڑے شاعر کی طرح علامہ اقبالؒ فن کے بارے میں ایک مخصوص نظریہ رکھتے ہیں۔ ان کی تصانیف میں واضح طور پر نظر آتا ہے کہ اقبال کے نزدیک شاعری اور دیگر فنون بھی، زندگی کی اعلیٰ قدروں کے حصول کا ذریعہ ہیں۔ وہ فن برائے فن کے قائل نہیں بلکہ فن برائے زندگی کے قائل ہیں یہی وجہ ہے کہ اقبالؒ کے تصورِ فن میں مقصد کی بلندی کا درس ملتا ہے، انھوں نے جو کچھ لکھا ایک مقصد کو سامنے رکھ کر لکھا۔ نظریہ فن کے موضوع کو زیرِ بحث لاتے ہوئے اقبالؒ کہتے ہیں کہ فن کا مقصد حسن و جمال کا احساس بیدار کرنا ہے اور دوسرا اسے انسانی زندگی کے لیے مفید ہونا چاہیے اور ایسا فن جو طبعِ انسانی کے لیے موزوں اور فائدے مند ہو وہ بہتر اور جائز ہے اور جو ان توقعات پر پورا نہ اُترے بے کار اور محض وقت کا ضیاع ہے۔

سورج نے دیا اپنی شعاعوں کو یہ پیغام
دنیا ہے عجب چیز، کبھی صبح کبھی شام

(کلیاتِ اقبال، ضربِ کلیم، صفحہ نمبر: ۶۵۳)

سیّد سلیمان ندوی کو ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:

”شاعری میں لٹریچر برائے لٹریچر کبھی میرا مطمعِ نظر نہیں رہا کہ فن کی باریکیوں کی طرف توجہ کرنے کے لیے وقت نہیں۔ مقصود صرف یہ ہے کہ خیالات میں انقلاب پیدا ہو اور بس۔ اس بات کو مدِنظر رکھ کر جن خیالات کو مفید سمجھتا ہوں ان کو ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ کیا عجب کہ آیندہ نسلیں مجھے شاعر تصور نہ کریں۔“ (۱)

علامہ اقبالؒ زندگی، تخلیق، ارتقا، جوش و عشق کے شاعر ہیں۔ زندگی ان کے نزدیک ایک تخلیقی عمل ہے اور اقبالؒ کے نزدیک اس فن کی بہر قدر ہے جو حیات بخش اور زندگی کا ترجمان ہے۔ چناں چہ ان کے مطابق ہنر و فن ایسا ہونا چاہیے جس سے زندگی کی اعلیٰ قدروں کا حصول ممکن ہو معاشرے کو پستی سے بلندی کی طرف گامزن کرے۔ اس اہم نکتے کو اقبالؒ نے بڑی خوب صورتی سے ”ضربِ کلیم“ میں کچھ یوں بیان کیا ہے۔

اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خُوب ہے لیکن
جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے، وہ نظر کیا
مقصود ہُنر سوزِ حیاتِ اَبدی ہے
یہ ایک نَفَس یا دو نَفَس مثلِ شرر کیا

(۲)

ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی فرماتے ہیں:

''اقبالؒ کے نزدیک فن وہی ہے جو زندگی بخش ہو اور زندگی کا ترجمان ہو، جو مُردہ و افسردہ جذبات کو حرکت میں لائے جو بلند نصب العین کے لیے جینا مرنا سکھائے، حقیقی فن کار وہ ہے جو اپنے فن کو قومی امراض کے دفعیہ کا ذریعہ بنائے۔ فن کا مقصد زندگی کے حسن کو نکھارنا اور معاشرے کو پستی سے بلندی کی طرف لے جانا، انقلاب کی لذت سے آشنا کرنا اور ہر آن ایک نئے دور، ایک نئے انقلاب کی جستجو میں سرگرمِ عمل رکھنا ہے۔''(۳)

علامہ اقبالؒ کو فنونِ لطیفہ اور ادبیات سے معجزوں اور کرامات کی توقع تھی جو قوم میں نئی رُوح پھونک دیتے۔ چناں چہ اقبالؒ کے تصورِ فن میں مقصد کی بلندی کا درس ملتا ہے۔

فن کا مفہوم

''تخلیقِ حسن کا دوسرا نام فن (آرٹ) ہے، فنونِ لطیفہ کے حوالے سے حسن کی یہ تخلیق اگر خِشت و سنگ کے وسیلے سے ظاہر ہو تو اس کا نام فنِ نقش گری یا فنِ تعمیر، خطوط اور رنگوں کے ذریعہ ہو تو فنِ مصوری، بدن کے لوچ اور حرکات و سکنات کی مدد سے ہو تو فنِ رقص، صوت و زخمہ کے توسط سے ہو تو فنِ موسیقی اور حروف و الفاظ کی مدد سے ہو تو ادب ہو گا اور اگر ادب میں صوت و صورت کی صفات بھی شامل ہو جائیں جن کا تعلق مصوری و موسیقی سے ہے تو پھر تخلیقِ حسن کا یہ عمل فنِ شاعری کہلائے گا۔''(۴)

اقبالؒ کے نزدیک شاعری، موسیقی، مصوری، بت تراشی کا مقصد انسانیت کو بلند کرنا ہے تو قابلِ تحسین ہے، اس کے برعکس اگر یہ انسانیت کی ترقی میں حائل ہے تو ایسے فن سے اجتناب کرنا بہتر ہے۔ اقبالؒ کے تصورِ فن میں بلند مقاصد کا حصول اس فن سے ہوتا ہے جس کی پرورش خونِ جگر سے ہو۔

رنگ ہو یا خشت و سنگ، چنگ ہو یا حرف و صوت — معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود
قطرۂ خونِ جگر، سِل کو بناتا ہے دل — خونِ جگر سے صدا سوز و سرور و سرود
(۵)

نقش ہیں سب نا تمام خُونِ جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر
(۶)

فن اور خُودی

ایک شاعر اور ادیب ہونے کی حیثیت سے اقبالؒ نے اپنی تصانیف کے ہی عمدہ نمونے پیش نہیں کیے بلکہ انھوں نے ادب اور فنونِ لطیفہ کے بارے میں اپنے تصورِ خُودی کے حوالے سے بڑی عمدہ بحثیں بھی کی ہیں، بنیادی نکتہ یہ ہے کہ اقبال کی توجہ خُودی کی تعمیر و تشکیل اور بے خُودی کے فوائد یعنی عمدہ معاشرے کے وجود میں آنے پر تھی، وہ فن برائے زندگی کے قائل تھے اور ادب برائے ادب سے انھیں چنداں لگاؤ نہ تھا۔ اقبالؒ ادب و فن کے ہر پہلو کے بارے میں تصورِ خُودی کی روشنی میں ہی بحث کرتے ہیں۔ فن کے بارے میں اقبالؒ کی رائے یہ ہے کہ اسے بہر طور با مقصد ہونا چاہیے یہ اس وقت ممکن ہے جبکہ اس کا سوز و ساز، قوت کا مظہر اور خُودی کا محافظ ہو۔۔ اقبالؒ کے فن کا نظریہ اس کے فلسفۂ خُودی کے تابع ہے۔

جہانِ تازہ کی اَفکارِ تازہ سے ہے نمود — کہ سنگ و خِشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا
خُودی میں ڈوبنے والوں کے عزم و ہمّت نے — اس آبجو سے کیے بحرِ بےکراں پیدا
(کلیاتِ اقبال، ضربِ کلیم، صفحہ نمبر: ۶۴۷)

علامہ اقبالؒ اپنی ایک نظم ''دین و ہنر'' میں بیان کرتے ہیں:

سرود و شعر و سیاست، کتاب و دینِ و ہُنر — گہر ہیں اِن کی گرہ میں تمام یک دانہ
ضمیرِ بندۂ خاکی سے ہے نمود ان کی — بلند تر ہے ستاروں سے ان کا کاشانہ
اگر خُودی کی حفاظت کریں تو عینِ حیات — نہ کر سکیں تو سراپا فُسون و افسانہ
ہوئی ہے زیرِ فلک اُمتوں کی رسوائی — خُودی سے جب اَدب و دِیں ہوئے ہیں بے گانہ
(۷)

''اقبالؒ نے شاعریِ حیات کے گن گائے اور زوال آموز شعرا کے "زیر آگیں" کلام کے خطرات سے لوگوں کو بخوبی آگاہ کیا ہے، ان کے نزدیک ہر فن کو چاہیے کہ انسانی خُودی اور لوگوں کو ملّی اور دینی زندگی کی تقویت دے اس لیے انھوں نے فنونِ لطیفہ، غلاماں، موسیقی، مصوری اور فنِ تعمیر وغیرہ کی بڑے تلخ انداز میں مذمت کی ہے۔ ان کے نزدیک جمالیاتی ذوق کی خاطر ان فنون کی طرف توجہ دینا ایک طرح کی بت پرستی تھی۔ اقبالؒ کے نزدیک اسلامی فن کی تولید و تکمیل ہنوز باقی ہے۔''(۸)

علامہ اقبالؒ نے فن کے بارے میں تفصیل کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کچھ یوں کیا ہے:

''کسی قسم کی رُوحانی صحت کا دارومدار اس کے شاعروں اورفن کاروں کی الہامی صلاحیت پر ہے۔۔۔۔ یہ ایک عطیہ ہے۔۔۔۔۔اس عطیے سے بہرہ ور ہونے والے کی شخصیت اورخوداس عطیے کی حیات بخش تاثیر عالم انسانیت کے لیے اہمیت رکھتے ہیں اگرکسی انحطاط پسند ادیب کافن اپنے شعر یا تصویر کے ذریعے لوگوں کے دل موہ لینے میں کامیاب ہوجاتا ہےتو وہ قوم کے لیے اٹیلا (Attila) چنگیز خان کی افواج قاہرہ سے زیادہ تباہ کن ثابت ہوسکتا ہے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے امراؤالقیس کے بارے میں جوقبل از اسلام کا سب سے بڑا عرب شاعر تھا فرمایا ہے: ''وہ شاعروں کا سردار ہے لیکن جہنم کی راہ میں ان کا قائد بھی ہے۔'' جوفن کار زندگی کا مقابلہ کرتا ہے وہ نوعِ بشر کے لیے باعث برکت ہے اوراس کی رُوح میں زمانے اورابدیت کا عکس جھلکتا ہے۔(۹)

فن اور زندگی

علامہ اقبالؒ کے نزدیک فن کا واحد مقصد یہ ہے کہ وہ اجتماعی زندگی کی نشوونما میں مدد کرے جس فن میں زندگی کی کارفرمائی اورفن کار کی خُودی نظر نہ آئے وہ اقبالؒ کے نزدیک فضول ہے۔فن اقوام عالم کی زندگی کا پرتو ہے۔کسی قوم کےفن کو دیکھ کراس قوم کی نفسیاتی کیفیتوں کا صحیح نقشہ کھینچا جا سکتا ہے۔سچافن کار وہ ہے جو اپنے فن کو بنی نوع کی بہتری کے لیے وقف کرے۔

کھل تو جاتا ہے مُغَنّی کے بم و زیر سے دل
نہ رہا زندہ و پائندہ تو کیا دل کی کشود!
ہے ابھی سینۂ افلاک میں پنہاں وہ نَوا
جس کی گرمی سے پگھل جائے ستاروں کا وجود
جس کی تاثیر سے آدم ہوغم وخوف سے پاک
اور پیدا ہو ایازی سے مقامِ محمودؔ
جس کو مشروع سمجھتے ہیں فقیہانِ خودی
منتظر ہے کسی مطرِب کا ابھی تک وہ سرود!

(کلیات اقبال (اُردو) ضرب کلیم،ص:۶۷۰)

''علامہ اقبالؒ کی نظر میں فن کا زندگی اور انسانیت کے ساتھ ناقابل شکست رشتہ ہے،فن کا مقصد زندگی کی رُوحانی اوراخلاقی قدروں کا فروغ اورایک بہتر انسان اور بہتر اورصحت مند معاشرے کی تخلیق وتشکیل ہے جوزندگی کے لامحدود امکانات سے بھرپور فائدہ اٹھاسکیں، چناں چہ فن کو پرکھنے کا ایک ہی پیمانہ ہے اور وہ ہے زندگی اور بامقصد زندگی کی رُوح بامقصد فن میں عیاں ہوتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ اقبالؒ کی نظر میں شاعر خضر کا کام کرتا ہے۔ چناں چہ اقبال شعرا کے اوصاف اسرارِخُودی میں نہایت بلیغ انداز میں بیان کرتے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر کی معاشرے میں کیا اہمیت ہے۔''(۱۰)

سینۂ شاعر تجلی زار حسن
خیزد از سینائے او انوار حسن
از نگاہش خوب گردد خوب تر
فطرت از افسوں او مجبوب تر
خضر و در ظلماتِ او آب حیات
زندہ تر از آب چشمش کائنات

(۱۱)

فن اور آزادی

علامہ اقبالؒ کی نظر میں فن کی شعوری طور پر ترویج وفروغ کے لیے آزادی ازحد ضروری امر ہے کیوں کہ سماجی اورمعاشی آزادی کے بنافن کی صحیح طور پر نشوونما ممکن نہیں۔اسی لیے علامہ اقبالؒ نے جمال کی اس قدر کواپنے نظریہ فن میں حرکت سے پیوستہ کردیا ہے اوراس کاظہور صرف آزادی میں ممکن ہے۔

ہے کس کی جرأت کہ مسلمان کو ٹوکے
حُریتِ افکار کی نعمت ہے خُدا داد
ہے مملکت ہند میں اک طُرفہ تماشا
اسلام ہے محبوس، مسلمان ہے آزاد!

(کلیات اقبال (اُردو) ضرب کلیم،ص: ۶۱۳، ۶۱۴)

فن اور صداقت

علامہ اقبالؒ کے نزدیک فن کی بنیاد صداقت اور انقلاب انگیز ہونی چاہیے۔فن کی اعلیٰ قدروقیمت یہ ہے کہ وہ اخلاقی اوررُوحانی قدروں کا احساس وتوازن،ادراک حسن کے ذریعے پیدا کرے۔

برگِ گُل آئینہ عارضِ زیبائے بہار
شاہدِ مے کے لیے حجلۂ جام آئینہ
حُسن آئینہ حق اور دل آئینہ حسن
دل اِنساں کو ترا حسنِ کلام آئینہ

کلیات اقبال (اُردو) بانگ درا،ص:۳۰۸

فن اور مقصدیت

اقبالؒ کے تصورفن میں مقصدیت کا پرچار ہے، اقبالؒ کے نزدیک اس فن کا کوئی مطلب نہیں جس کا

تعلق زندگی، انسان، معاشرت سے نہ ہو۔فن کا اولین مطلب خود زندگی ہے۔فن کے لیے لازم ہے کہ وہ ذہن انسانی میں ایک ابدی زندگی کے حصول کی لگن پیدا کردے۔

یہ کائنات چھپاتی نہیں ضمیر اپنا — کہ ذرّے ذرّے میں ہے ذوقِ آشکارائی
کچھ اور ہی نظر آتا ہے کاروبارِ جہاں — نگاہِ شوق اگر ہو شریکِ بینائی
اسی نِگاہ میں ہے قاہری و جباری — اسی نِگاہ میں ہے دلبری و رعنائی

(کلیاتِ اقبال،ضربِ کلیم،صفحہ نمبر:۶۵۷)

معاشرے میں جذبات پیدا کرنا

علامہ اقبالؒ کے نزدیک شاعر ملّت کے لیے کلیدی حیثیت رکھتا ہے اور اس حیثیت کا حق ادا کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اپنی باطنی قوتوں سے محوِ خواب قوم کو جھنجھوڑنا اور انھیں اعلیٰ وارفع مقام اَوجِ ثریا تک لے جانا چاہیے۔ایسی شاعری جو معاشرے کے جذبات میں ہلچل اور طوفان نہ لائے وہ بے کار ہے، بے معنی ہے۔

جس سے دِل دریا متلاطم نہیں ہوتا
اے قطرۂ نیساں وہ صدف کیا، وہ گہر کیا

بے معجزہ دُنیا میں اُبھرتی نہیں قومیں
جو ضربِ کلیمی نہیں رکھتا وہ ہُنر کیا!

(محمد اقبالؒ،کلیاتِ اقبال (اردو) ص: ۶۶۴)

حیاتِ ابدی کے حصول کی لگن

اقبالؒ کے مطابق شاعر ایسی ہستی ہے جس کے سینے سے حسن کے سوتے پھوٹتے ہیں۔شاعر کا سینہ جلوہ گاہِ حسن ہے۔اس طورِ سینا سے حسن کے انوار پھوٹتے ہیں۔اس شاعر کی نگاہ سے خوب صورت چیز اور خوب صورت ہو جاتی ہے۔شاعر کے آب و گِل میں سمندر اور خشکی پوشیدہ ہے۔اس کی فکر کی پرواز ماہ و انجم تک ہے۔وہ بدگوئی سے نا آشنا ہے صرف حُسن کی تخلیق کرتا ہے۔خضر کی مانند شاعر کے ظلمات میں آبِ حیات ہے اس کے آنسو کائنات کو زندہ کر دیتے ہیں یعنی وہ خضر کی طرح تاریکیوں میں ہمارا رہنما ہے اس کی نگاہوں سے کائنات

میں زندگی کی نئی لہر دوڑ جاتی ہے۔

اقبالؒ کے نزدیک فن کار کے لیے ضروری ہے وہ آرزوؤں کی تکمیل میں مضطرب اور خوب سے خوب تر کی تلاش میں سرگرداں رہے، آرزو اور جستجو کی کیفیت شاعر کے دل کو سوز کی لذت سے آشنا کرتی ہے۔علامہ اقبالؒ نے پیامِ مشرق کی نظم ”حور و شاعر“ میں اپنی ناصبور فطرت کا ذکر کچھ اس انداز میں کیا ہے:

چہ کنم کہ فطرتِ من بہ مقام در نسازد
دل ناصبور دارم چو صبا لالہ زارے

(۱۳)

سوز و جنوں

اقبالؒ کے ہاں سوز و جنوں فن کی طرح رواں ہے اگر سوز نہ ہو تو فن سودائے خام ہو کر رہ جاتا ہے، اقبالؒ نے بوعلی سینا اور رومی میں جو بنیادی فرق بتایا ہے۔ بقول اقبالؒ

بوعلی اندر غبارِ ناقہ گم — دست رومی پردۂ محمل گرفت
حق اگر سوزی ندارد حکمت است — شعر میگردد چو سوز از دل گرفت

(۱۴)

عبدالشکور احسن فرماتے ہیں:

”سوز و جنوں کی اس شرط کو شاعر نے ہر جگہ بنیادی اہمیت دی ہے۔وہ ایسے نغمے کا آرزومند ہے جسے شوق و محبت نے پروان چڑھایا ہو کہ اس کے بغیر نغمہ اپنی اصلی کیفیت سے محروم ہے، جنوں کی آغوش میں پالا ہوا نغمہ اس آگ کی مانند ہے جسے فن کار نے اپنے خونِ دل سے حل کیا ہے جب تک اس میں شوق نہیں یہ سوز حیات کی آنچ سے بیگانہ ہے۔یہ نغمہ تاثیر سے محروم رہے گا اور اسے وہ پاکیزگی حاصل نہ ہو گی جو اعلیٰ فن کی امتیازی شان ہے۔“ (۱۵)

تخلیقی عمل

اقبالؒ کا تصورِ فن تخلیقی عمل کو بہت اہم قرار دیتا ہے، یہی وجہ ہے کہ اقبالؒ کو تقلید سے نفرت تھی، کیوں کہ ان کے نزدیک انسان کا تخلیقی عمل ہی اسے خُداوند تعالیٰ کا ہم سر اور ہم کار بناتا ہے کیوں کہ خُدا نے

انسان کو تخلیقی استعداد سے نوازا ہے، اقبالؒ کے مطابق خُدا نے فطرت کی تخلیق کی ہے لیکن انسان اپنے ہنر وفن کو کام میں لا کر اسے مزید سنوار رہا ہے، اقبالؒ نے انسان کی اس تخلیقی صلاحیت کا ذکر ''پیامِ مشرق'' میں نہایت فخر کے ساتھ کیا ہے۔

تو شب آفریدی چراغ آفریدم
سفال آفریدی ایاغ آفریدم
(۱۶)

''اقبالؒ کے ہاں ایک نہایت دلچسپ بات قابلِ توجہ ہے شاعری اور شعرا کا ذکر کرتے ہوئے وہ پیغمبرانہ شان دکھاتے ہیں اور لوگوں کو گمراہ کرنے والے شاعروں پر غیظ وغضب کی بارش رکھتے ہیں مگر اپنے مذہبی افکار بیان کرنے میں وہ کلاسیکی ادب کی علامات سے ہی کام لیتے ہیں۔''(۱۷)

فنِ مصوری

شاعروں کے علاوہ مصوروں کے متعلق بھی اقبال کو یہی شکایت ہے کہ یہ مقلد ہی نظر آتے ہیں۔ یہ خیال درست ہے کہ آرٹ قوم کی زندگی کا آئینہ ہوتا ہے، ہر قوم کی غایتیں اور آرزوئیں اس میں نظر آتی ہیں۔

بقول خلیفہ عبدالحکیم:

''لیکن اگر کوئی ہماری مصوری کو دیکھے تو اس کو ملّت کا زاویۂ نگاہ، اس کی تمنائیں اور آرزوئیں کہیں نظر نہیں آتیں۔ اسلامی تہذیب وتمدن میں مصوری کو زیادہ فروغ حاصل نہ ہو سکا...... عصرِ حاضر میں یہاں مصوری کی طرف توجہ ہوئی تو زیادہ تر اس میں فرنگ کے اسکولوں کی کورانہ تقلید تھی........ مغرب کی مصوری پر اب ایسا ہی دور آیا ہے جس کی ہمارے ہاں کے مصوروں نے نقالی شروع کر دی ہے ایک فرنگی نقاد نے ہمارے مصوروں کی ان تصویروں کو دیکھا اور کہا کہ یہ فرنگ کے فلاں فلاں اسکولوں کی کامیاب یا ناکام نقالی ہے۔ تمھارا پاکستانی آرٹ کہاں ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ جب قوم کو اپنی خُودی کا احساس نہ ہو اور ہنر اس کی مخصوص تمناؤں اور زاویہ ہائے نگاہ کا آئینہ دار نہ ہو تب تک مصوری زندگی کی ترجمان نہیں بن سکتی۔''(۱۸)

موسیقی

''علامہ اقبالؒ کے ہاں دوسرے فنون لطیفہ کی طرح فنِ موسیقی پر بھی اظہارِ خیال ملتا ہے لیکن بقول ڈاکٹر فرمان فتح پوری ''حقیقی سرور وموسیقی کے حسن وقبح کو وہ فلسفہ خُودی کی روشنی میں دیکھتے ہیں۔ ان کے خیال میں حقیقی موسیقار وہی ہے جس کا ضمیر پاک ہو اور جس کے نغمات سے سامعین کے چہرے پر زندگی بکھر جاتی ہے۔''(۱۹)

ان خیالات کا اظہار اقبال کچھ اس انداز میں کرتے ہیں:

وہ نغمہ سردیِ خونِ غزل سرا کی دلیل — کہ جس کو سُن کے تیرا چہرہ تاب ناک نہیں
نوا کو کرتا ہے موجِ نفس سے زہر آلود — وہ نے نواز کہ جس کا ضمیر پاک نہیں
(کلیاتِ اقبال (اردو) ضربِ کلیم، ص: ۶۷۷)

فنِ تعمیر

''علامہ اقبالؒ اسلامی دنیا کے فنون لطیفہ سے مطمئن نہیں ہیں۔ ان کے خیال میں مسلمانوں کے فنون لطیفہ میں اسلامی رُوح فنِ تعمیر کے سوا اور کسی فن میں نظر نہیں آتی۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے شاعری کے بعد فنون لطیفہ میں سے جس شاخ کا زیادہ اثر قبول کیا، فنِ تعمیر ہے۔۔۔۔ اقبال نے جب مسجد قُرطبہ اور ''مَسجدِ قُوَّتُ الاسلام'' کو دیکھا تو انھیں ان میں قوت حیات کے مظاہر نظر آئے اور اقبال مسجد قُرطبہ کو دیکھ کر مبہوت رہ گئے انھیں اس اسلامی فنِ تعمیر کے عظیم الشان نمونے نے فنِ تعمیر پر اظہار خیال کرنے پر مجبور کر دیا۔''(۲۰)

ہے مرے سینۂ بے نُور میں اب کیا باقی — 'لا اِلٰہ' مردہ و افسردہ و بے ذوق نمود
چشمِ فطرت بھی نہ پہچان سکے گی مُجھ کو — کہ ایازی سے دِگرگُوں ہے مقامِ محمود
اب کہاں میرے نَفَس میں وہ حرارت، وہ گداز — بے تب و تابِ دَرُوں میری صلوٰۃ اور دَرُود
(کلیاتِ اقبال (اردو) ضربِ کلیم، ص: ۶۵۱)

جلال و جمال

''علامہ اقبال کے فلسفہ حیات اور نظریہ فن میں جمال وجلال ساتھ ساتھ نظر آتے ہے، اقبال بھی فن

تعمیر کے اس پہلو کو پسند فرماتے ہیں، جس میں جلال اور جمال کی صفات یکجا ہوں۔ اقبال جمال و جلال کی ہم آہنگی کو زندگی کا نصب العین قرار دیتے ہیں جس کا پرچار ان کی تصانیف میں جا بجا نظر آتا ہے۔فن میں جمال و جلال کی یکجائی و ترجمانی کا وہ پہلو جو اقبال کو مسجد قوت الاسلام میں تو نظر آتا ہے لیکن پیرس کی مسجد میں نظر نہیں آتا۔ پیرس کی مسجد گرچہ بہت خوب صورت ہے لیکن اقبال کو اس میں خلوص نظر نہ آیا بلکہ ریا کاری نظر آتی ہے۔''(۲۱)

مری نِگاہ کمال ہُنر کو کیا دیکھے ۔۔۔ کہ حق سے یہ حَرَمِ مغربی ہے بیگانہ
حرم نہیں ہے، فرنگی کرشمہ بازوں نے ۔۔۔ تنِ حَرَم میں چھپا دی ہے رُوحِ بُت خانہ
یہ بُت کدہ اُنہی غارت گروں کی ہے تعمیر ۔۔۔ دمشق ہاتھ سے جن کے ہُوا ہے ویرانہ

(کلیاتِ اقبال، ضربِ کلیم، صفحہ نمبر: ۶۴۹)

یہی وجہ ہے کہ اقبالؒ کی نظر میں فن کا صحیح مقصد زندگی، انسان اور اس کی معاشرت کو تقویت دیتا ہے۔ اپنے دورِ انحطاط کے فن کاروں کے بارے میں اقبال کہتے ہیں کہ شاعر ہوں یا مصور، افسانہ نویس ہوں یا مغنی ان سب کے اعصاب پر عورت سوار ہے جس نے انھیں فن کی اصل رُوح سے بیگانہ کر دیا۔

میاں محمد شریف اقبالؒ کے تصورِ فن کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں کہ

''جہاں تک مجھے علم ہے کسی مصنف نے بھی اقبالؒ سے زیادہ پرجوش انداز میں ناصحانہ فن کی حمایت نہیں کی اور نہ دورِ انحطاط کی شاعری کی مذمت۔ ان کے نزدیک فن کا کوئی مطلب نہیں جس کا تعلق زندگی، انسان اور معاشرت سے نہ ہو۔فن کا اولین مقصود خود زندگی ہے،فن کے لیے لازم ہے کہ وہ ذہن انسانی میں ایک ابدی زندگی کے حصول کی لگن پیدا کر دے۔''(۲۲)

''اقبالؒ کا فن اس ادبی روایت کا وارث ہے جس کے بڑے نمائندے سنائی، عطار اور رومی تھے:

ما از پے سنائی و عطار آمدیم

اور ظاہر ہے کہ عطار اور رومی ان اکابر ادبا میں سے ہیں جن کی شاعری بے لگام تخیل اور محض ہیجانِ جذبات کی غلام نہیں بلکہ رومانی اور فکری تجربات کی بھی آئینہ دار ہے۔ یہ شاعری کی اس روایت سے الگ چیز ہے جس میں محض حسنِ بیان یا محض اظہارِ جذبات کو اہمیت دیتے ہوئے فکر اور تعقل کو نظر انداز کیا گیا ہے۔''(۲۳)

''اقبالؒ اپنے فن کے ذریعے اجتماعی وجدان کی صلاحیتوں کو بروئے کار لانا چاہتا ہے، وہ آرٹ کی مہمیز سے اپنے ہمراہ اُن سست عناصر کو منزلِ مقصود کی جانب تیز گام دیکھنے کا متمنی ہے۔''(۲۴)

علامہ اقبالؒ نے فن کو مقصود بالذات کبھی نہیں سمجھا بلکہ اس کے ذریعے سے حیاتِ انسانی، فطرت اور تقدیر کے اسرار و رموز بے نقاب کیے ہیں۔

مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ
کہ میں ہوں محرمِ رازِ درونِ میخانہ

(کلیاتِ اقبال، بالِ جبریل، ص: ۴۱۵)

اقبالؒ کے خیال میں فن اس باطنی شعور یا وجدان کا موثر اظہار ہے جو فن کار کے اخلاص یا خونِ جگر کے بغیر ممکن نہیں۔فن کو کارگر اور اثر آفرین بنانے کے لیے خلوص و احساس کی صداقت لازم ہے۔ اس کے بغیر الفاظ کی طلسم سازی نہ تو کسی لازوال فن کی تخلیق کر سکتی ہے اور نہ کوئی فن کار اس کی بدولت زندہ جاوید ہو سکتا ہے۔

حواشی

۱۔افتخار احمد صدیقی، ڈاکٹر، فروغِ اقبال (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۹۶ء) ص: ۱۷۳
۲۔محمد اقبالؒ، کلیاتِ اقبال (اردو) (لاہور: الفیصل ناشران، فروری، ۲۰۰۶ء) ص: ۶۶۴
۳۔افتخار احمد صدیقی، ڈاکٹر، فروغِ اقبال (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۹۶ء) ص: ۱۷۱
۴۔فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اقبال سب کے لیے (کراچی: اردو اکیڈمی، ۱۹۷۸ء) ص: ۲۱۷
۵۔محمد اقبالؒ، کلیاتِ اقبال (اردو) (لاہور: الفیصل ناشران، فروری، ۲۰۰۶ء) ص: ۴۶۵، ۴۶۶
۶۔محمد اقبالؒ، کلیاتِ اقبال (اردو) (لاہور: الفیصل ناشران، فروری، ۲۰۰۶ء) ص: ۴۷۳
۷۔محمد اقبالؒ، کلیاتِ اقبال (اردو) (لاہور: الفیصل ناشران، فروری، ۲۰۰۶ء) ص ۶۴۷
۸۔این میری شمل، پروفیسر، ڈاکٹر، شہپرِ جبریل، مترجم محمد ریاض، ڈاکٹر (لاہور: گلوب پبلشرز، ۱۹۸۵ء) ص: ۸۶
۹۔عبدالشکور احسن، ڈاکٹر، اقبال کی فارسی شاعری کا تنقیدی جائزہ (لاہور: اقبال اکادمی، ۲۰۰۰ء) ص: ۳۲۰

۱۰۔خالدہ جمیل،مباحث اقبال(لاہور:اپنا ادارہ، ۲۰۰۴ء)ص:۱۷۵

۱۱۔عبدالرشید،میاں،اسرارورموز(لاہور:ن،د)ص:۹۶

۱۲۔عبدالرشید،میاں،اسرارورموز(لاہور:ن،د)ص:۹۷

۱۳۔اقبال، پیام مشرق(لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز،ن،د)ص:۱۴۸،۱۴۹

۱۴۔اقبال، پیام مشرق(لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز،ن،د)ص:۱۲۲

۱۵۔عبدالشکور احسن،ڈاکٹر،اقبال کی فارسی شاعری کا تنقیدی جائزہ(لاہور:اقبال اکادمی،۲۰۰۰ء)ص:۳۲۳

۱۶۔اقبال، پیام مشرق،نظم بعنوان محاورہ مابین خُدا اور انسان(لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز،ن،د)ص:۱۵۷

۱۷۔این میری شمل، پروفیسر،ڈاکٹر،شہپر جبریل،مترجم محمد ریاض،ڈاکٹر(لاہور:گلوب پبلشرز،۱۹۸۵ء)ص:۸۸

۱۸۔عبدالحکیم،خلیفہ،ڈاکٹر،فکر اقبال(لاہور:بزم اقبال،۱۹۹۲ء)ص:۴۳۶،۴۳۷

۱۹۔خالدہ جمیل،مباحث اقبال(لاہور:اپنا ادارہ، ۲۰۰۴ء)ص:۱۷۹

۲۰۔خالدہ جمیل،مباحث اقبال(لاہور:اپنا ادارہ، ۲۰۰۴ء)۱۸۲

۲۱۔خالدہ جمیل،مباحث اقبال(لاہور:اپنا ادارہ، ۲۰۰۴ء)۱۸۳، ۱۸۴

۲۲۔خالدہ جمیل،مباحث اقبال(لاہور:اپنا ادارہ، ۲۰۰۴ء)۱۸۵

۲۳۔رفیع الدین ہاشمی، پروفیسر،اقبال بحیثیت شاعر(لاہور:مجلس ترقی ادب،اکتوبر ۲۰۰۷ء)ص:۵۳

۲۴۔یوسف حسین خان،ڈاکٹر،رُوح اقبال(لاہور:القمر انٹرپرائزز،مارچ ۲۰۱۰ء)ص:۱۶

علامہ اقبالؒ اور تصورِ ملّت

اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی مخلوقات میں اشرف المخلوقات کا درجہ انسان کو دیا گیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو مختلف قبائل اور خاندانوں میں تخلیق فرمایا تاکہ وہ ایک دوسرے کو پہچان سکیں اور اجتماعی زندگی بسر کر سکیں۔انسان ایک معاشرتی حیوان ہے اور وہ معاشرے میں پنپتا ہی اچھا لگتا ہے۔اکیلے رونا اور ہنسنا اسے زیب نہیں دیتا اس لیے وہ معاشرے میں دیگر لوگوں، رشتوں کے ساتھ باہمی میل جول اور نظم وضبط سے زندگی گزارتا ہے تاکہ اس کی تمام ضروریات کی تسکین بھی ہو اور ذہنی آسودگی بھی حاصل ہو۔قرآن پاک کی سورت اخلاص کا مفہوم ہے کہ اللہ تعالیٰ واحد ہے اس کا کوئی شریک نہیں۔وہ اکیلا ہے اور بے نیاز ہے۔وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔اسلام نے جو تصور ملّت پیش کیا ہے وہی تصور علامہ محمد اقبالؒ کے افکار میں بدرجہ اُتم موجود ہے۔

”ملّت کے لفظ کی وضاحت ضروری ہے،ملّت کا لغوی معنی دین ہے اور قرآن کریم میں یہ لفظ انہی معنوں میں آیا ہے۔چناں چہ ملّت اسلام کا مطلب ہوا دین اسلام مگر رفتہ رفتہ ملّت اسلام کی جگہ خالی ملّت رہ گیا اور ہوتے ہوتے ملّت سے وہ وہ جمعیتیں مراد لی جانے لگیں جن کا دین اسلام تھا۔بالفاظ دیگر”ملّت“ تقریباً وہی معنیٰ اور مفہوم ادا کرنے لگا جو لفظ امت ادا کرتا ہے،اب پورے عالم اسلام کو امت اسلام بھی کہا جاتا ہے اور ملّت اسلام بھی۔“(۱) گویا ملّت اسلامیہ کی اساس دیگر اقوام سے مختلف ہے۔

اپنی ملّت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ﷺ ہاشمی
(کلیات اقبال، بانگ درا، صفحہ نمبر ۲۴۸)

علامہ اقبال کا تصورِ ملّت اسلامی تعلیمات پر مبنی تھا وہ تمام دنیا کے مسلمانوں کو ایک ملّت سمجھتے تھے اور قرآن مجید کی اس آیت کی عملی تفسیر ان کے نظریہ ملّت میں دیکھی جاسکتی ہے۔

القرآن: ترجمہ: مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ سورۃ الحجرات

حدیث نبوی ﷺ ہے: ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے۔ (۲)

اقبالؒ کے تصورِ ملّت کی بنیاد دینی تعلیمات تھیں خُدا کی وحدانیت کے اقرار اور رسول اکرم ﷺ کی رسالت پر ایمان لانے کے بعد خُدا اور رسول ﷺ کے اسی فرمان کو ماننا کہ تمام مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں، مسلمانوں کے لیے اس تصور کے ذریعے وسیع رُوحانی بنیاد فراہم کرتے ہیں۔ افراد کے اس رُوحانی رابطہ کی وجہ سے ایک ایسی عالمگیر ملّت وجود میں آتی ہے جس کی حدود، قوم، نسل، رنگ، نسب یا وطن کی مروج اصطلاحات سے متعین نہیں کی جاسکتیں، رسول اکرم ﷺ نے ''حجۃ الوداع'' کے موقع پر اعلان فرمایا:

''لوگو! یقیناً تمھارا اللہ ایک ہے اور تمھارا باپ بھی ایک ہے، نہ عربی کو عجمی پر فضیلت ہے نہ عجمی کو عربی پر، نہ سرخ کو سیاہ پر فضیلت ہے نہ سیاہ کو سرخ پر، فضیلت کا دار و مدار تقویٰ پر ہے۔ سب مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔'' (۳)

مولانا عبدالسلام ''اقبال کامل'' میں تصورِ ملّت کے بارے میں لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر صاحب فرد کو قطرہ سے اور قوم کو دریا سے تشبیہ دیتے ہیں، اس لیے ان کے نزدیک قوم میں دریا ہی کی طرح وسعت بھی ہونی چاہیے۔''

اور یہ وسعت صرف اس طرح پیدا ہوسکتی ہے کہ قومیت کی بنیاد رُوحانی اصول پر قائم کی جائے۔ لیکن موجودہ دور میں ملک و نسب اور رنگ و روپ کے امتیازات کی بنا پر قومیت کا جو محدود نظریہ قائم کیا گیا ہے وہ وطنیت کے جغرافیائی تحدید کے مادی تخیل سے پیدا ہوا ہے۔ اس لیے اس نے دنیا کی تمام قوموں کے ساتھ مسلمان بھی اس مشرکانہ عبادت میں شریک ہیں۔

اس دور میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور — ساقی نے بنا کی روشِ لطف و ستم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور — تہذیب کے آذر نے ترشوائے صنم اور
ان تازہ خُداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے — جو پیرہن اس کا ہے، وہ مذہب کا کفن ہے
(۴)

''یورپ جانے سے پہلے ڈاکٹر صاحب بھی اسی بُت کے پرستاروں میں تھے لیکن یورپ میں جا کر

انھوں نے مختلف قوموں کی باہمی رشک و رقابت کے مناظر دیکھے تو ان کو معلوم ہوا کہ اس تنگ، محدود و مادی نظریہ سے قومیت کا بحرِ بیکراں نہیں پیدا ہوتا بلکہ اس کے بجائے بہت سے چھوٹی چھوٹی نہریں پیدا ہوجاتی ہیں۔ اس لیے فرد و قوم کے اختلاط و امتزاج سے جو اخلاقی فوائد حاصل ہوسکتے تھے وہ حاصل نہیں ہوسکتے بلکہ اخوت، محبت اور انسانیت کا بالکل خاتمہ ہوجاتا ہے اور قومیت کا ڈھانچا ہی ڈھانچا باقی رہ جاتا ہے جس میں رُوح نہیں ہوتی۔'' (۵)

اقبال مغربی تصورِ قومیت سے بدظن تھے اور ایک ''ملّت'' کے تصور کے مبلغ تھے۔

بتان رنگ و خوں کو توڑ کر ملّت میں گم ہو جا
نہ تورانی رہے باقی، نہ ایرانی نہ افغانی

ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی ''فروغِ اقبال'' میں لکھتے ہیں:

''اگرچہ ابتدائی دور میں انسانی ہمدردی کے جذبے نے اقبالؒ کو آزادی وطن کے گیت گانے اور فرقہ وارانہ مناقشت کی تیرگی میں محبت کی جوت جگانے پر آمادہ کیا لیکن جب اقبالؒ نے وطنیت اور قومیت کے محدود و عارضی تصور کے مقابلے میں ''ملّت'' کے آفاقی و ابدی تصور کا جائزہ لیا تو ان کی نگاہوں کے سامنے اسلام کی عظمت پوری تابانی سے آشکار ہوگئی۔ سفر یورپ سے پہلے بھی اقبالؒ جانتے تھے کہ اسلام نے قبائلی عصبیتوں کو مٹا کر، رنگ و نسل کے بتوں کو توڑ کر، محض ایک کلمہ حق کی بنیاد پر دنیا بھر کے مسلمانوں کو متحد کر دیا ہے۔ اقبالؒ کے نزدیک ملّت کا لفظ قوم کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔'' (۶)

''بانگِ درا'' میں انھوں نے ''وطنیت'' کے عنوان سے جو نظم لکھی تھی اس میں رسول پاک ﷺ کے کردار سے استشہاد کر کے اشعار کو رنگین کیا تھا لیکن پوری نظم کی تعمیر و تشکیل اور اسلوبِ تخلیق سے پڑھنے والے کے دل پر یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ ایک نظریہ ہے جس کی اثبات کے لیے عقلی اور جذباتی دلائل مہیا کیے جا رہے ہیں۔ مثلاً

اقوام جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے — تسخیر ہے مقصود تجارت تو اسی سے
خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے — کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے
اقوام میں مخلوق خُدا بٹتی ہے اس سے — قومیت اسلام کے جڑ کٹتی ہے اس سے

ہاں ''جوابِ شکوہ'' میں جو ندائے غیب آتی ہے اس میں شعری کیفیت کا رنگ لطیف تشبیہات و استعارات اور بلیغ اشارات و کنایات نے ان اشعار کو عجیب پرفسوں کیفیت بخشی ہے جن میں تغزل کی زبان میں

دقیق مطالب کا بیان ہو رہا ہے۔ مثلاً

بادہ آشام نئے، بادہ نیا، خم بھی نئے — حرم کعبہ نیا، بت بھی نئے، تم بھی نئے
کسی یکجائی سے اب عہد غلامی کر لو — ملّتِ احمدِ مرسل ﷺ کو مقامی کر لو
یوں تو سیّد بھی ہو، مرزا بھی ہو، افغان بھی ہو — تم سبھی کچھ ہو، بتاؤ تو مسلمان بھی ہو؟
(۷)

اقبال ایک محبِ وطن شخص تھے مگر انھیں ہند سے باہر کے مسلمانوں سے بھی کچھ کم محبت نہ تھی۔ اسی طرح عالم انسانی کے لیے بھی ان کی محبتیں وقف تھیں، تو سیاسی اعتبار سے بات کو ہم یوں کہیں گے کہ اقبال حب وطن اور ہر مسلمان ملک کی جداگانہ حیثیت و قوت تسلیم کرنے کے علاوہ عالمگیر اسلامی قوت کا درس دیتے رہے۔

اقوام جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے
تسخیر ہے مقصود تجارت تو اسی سے

ڈاکٹر سیّد عبداللہ ''ولی سے اقبال تک'' میں رقم طراز ہیں:

''حقیقت یہ ہے کہ اقبال ایک یونیورسلسٹ (آفاقیت وسعت) ہیں۔ ہر وہ چیز جو ان کے اس خاص اجتماعی نصب العین سے ٹکراتی ہے اس کی وہ مخالفت کرتے ہیں، یہی وہ اجتماعیت کی عام تبلیغ ہے جسے بعض معترض پین اسلامزم کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ حالاں کہ اقبال صرف مسلم اقوام مشرق کے اجتماع کے قائل ہیں۔''

اقبال کہتے ہیں کہ ''ملّت اسلامیہ کی اساس ایمان وعقیدہ رسالت محمدیہ کی ابدیت اور آفاقیت ہے۔ ملّت کی قوت کا سرچشمہ ان کی مذہب کے ساتھ وابستگی اور ملی اتحاد ہے۔''

''اقبال کے نزدیک ملّت اسلامیہ کی طاقت کا سبب وطن نہیں بلکہ اقرار توحید و رسالت اور اسی حوالے سے وحدت ملّت ہے ان کا خیال ہے کہ پوری کائنات انسانی اور اولوالعزمی کے اظہار کے لیے ایک جولاں گاہ کی حیثیت رکھتی ہے، اسی لیے کسی وطن اور خطہ زمین کا پابند ہو جانا آزادی کھو دینے کے مترادف ہے۔''(۱۰)

علامہ اقبالؒ افسوس کرتے ہیں کہ اُمت مسلمہ ٹکڑوں میں تقسیم ہونا شروع ہوگئی ہے جس کی وجہ سے ملّت اسلامیہ کا شیرازہ بکھر گیا۔

ہوس نے کر دیا ٹکڑے ٹکڑے نوع انساں کو
اخوت کا بیاں ہو جا، محبت کی زباں ہو جا

(کلیات اقبال، بانگ درا، صفحہ نمبر ۲۷۳)

''علامہ اقبال کی شاعری میں قیام یورپ سے پہلے وطنیت کا عنصر موجود تھا۔ ان کی نظم ''ترانہ ہندی'' کی بھی مثال دی جاسکتی ہے جہاں اقبال ہندوستان کی عظمت کے گن گاتے نظر آتے ہیں۔''(۱۱)

سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا — ہم بلبلیں ہیں اس کی، یہ گلستاں ہمارا
مذہب نہیں سکھاتا، آپس میں بیر رکھنا — ہندی ہیں ہم، وطن ہے ہندوستاں ہمارا
یونان ومصر وروما سب مٹ گئے جہاں سے — اب تک مگر ہے باقی، نام و نشاں ہمارا
اقبالؔ! کوئی محرم اپنا نہیں جہاں میں — معلوم کیا کسی کو درد نہاں ہمارا

(کلیات اقبال، بانگ درا، ص:۱۰۹، ۱۱۰)

علامہ اقبال کا یہ شعر مسلم قومیت کی جانب ان کے سفر کا سنگِ میل ہے۔

چین و عرب ہمارا، ہندوستاں ہمارا
مسلم ہیں ہم، وطن ہے سارا جہاں ہمارا

(کلیات اقبال، ص:۱۸۶)

علامہ اقبال کے بارے میں ڈاکٹر خالد یاسر اقبال اپنی کتاب ''جدید تحریکات اور اقبال'' میں لکھتے ہیں۔

''اب وہ خود کو جغرافیائی حدود سے ماوراء کر لیتے ہیں اور خود کو پوری مسلم امت کے ساتھ منسلک کر کے دیکھنے لگتے ہیں۔''(۱۲)

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے
نیل کے ساحل سے لے کر تابخاک کاشغر

(کلیات اقبال، ص:۲۹۵)

اس طرح کی بے تحاشا مثالیں ہم اقبال کے اردو کلام سے پیش کر سکتے ہیں جہاں وہ مسلمانوں کو اپنے اندر ملی جذبہ پیدا کرنے کا پیغام دے رہے ہیں۔

ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار ''اقبال ایک مطالعہ'' میں لکھتے ہیں:

''حب الوطنی، وطن پرستی اور تصور وطنیت کے لحاظ سے اقبال کی فکر و نظر میں کچھ ارتقائی صورت یا تبدیلی ملتی ہے، جسے بعض لوگوں نے فکری تضاد کا رنگ دینے کی بھی کوشش کی ہے، اس کی وجہ تو غالباً یہ ہے کہ وطن کے حوالے سے متذکرہ تینوں اصطلاحات کو مترادف قرار دے لیا جاتا ہے، جس کا قدرتی نتیجہ تضاد کی صورت میں

نکلتا ہے، دوسرے اقبال کے سلسلے میں فکری تبدیلی کے محرکات اور اس کی نوعیت کو پوری طرح سمجھنے کی کوشش نہیں کی جاتی اس لیے وطن اور وطنیت (ملّت) کی یہ بحث مطالعہ اقبالؒ کے ضمن میں اکثر کج بحثی کا روپ اختیار کر لیتی ہے۔'' (۱۳)

ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار
قوت مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تیری

(کلیات اقبال، بانگ درا، ص:۲۴۸)

''جدید یورپی نظریے کے مطابق عموماً قومیں وطن سے بنتی ہیں۔ مگر اسلام نے سب سے پہلے عملاً وطن ہی کو غیر اہم قرار دے دیا اور اس طرح وطن پر استوار ''قومیت کے تصور'' کو باطل کر دیا۔'' (۱۴)

حضرت علامہ کہتے ہیں: ''اسلام قیدِ وطن سے آزاد ہے، اس کا مقصد ہے ایک ایسے انسانی معاشرے کی تشکیل جو مختلف نسلوں اور قوموں کو باہم جمع کرتے ہوئے ایک ایسی امت تیار کرے، جس کا اپنا ایک مخصوص شعورِ ذات ہو۔'' (۱۵)

اگر غزوۂ بدر پر روشنی ڈالی جائے تو: ''غزوۂ بدر کا سب سے بڑا درس یہ ہے کہ امت مسلمہ ایک دینی، رُوحانی، اصولی اور نظریاتی برادری ہے۔ اس کی اساس نہ وطن ہے نہ خون، نہ نسل، نہ زبان، نہ دولت، نہ اقتدار۔'' (۱۶)

وہ لوگ جو ملّت کے معاملات میں نسب کو لا داخل کرتے ہیں وہ اخوت کے مفہوم میں گڑبڑ کر ڈالتے ہیں اور جن لوگوں کو آبائی گھمنڈ ہے وہ گویا اس خُدا کے رنگ میں رنگے ہی نہیں گئے جو لم یلد بھی ہے اور لم یولد بھی۔

ملّت کی قوت اس کی رُوحانی یک جہتی ہے، یہ رُوحانی یک جہتی توحید و رسالت پر استوار ہے، اس عقیدے کا مختصر ترین اظہار مگر بھرپور اقرار کلمہ طیبہ ہے۔

ملّت بیضا تن و جان لا اله — ساز ما را پرده گردان لا اله
لا اله سرمایهٔ اسرار ما — رشته اش شیرازهٔ افکار ما

(اسرار و رموز، صفحہ نمبر ۹۲)

از یک آئینی مسلماں زنده است
پیکر ملّتِ ز قرآن زنده است

(اسرار و رموز، ص:۱۲۵)

متحدہ ہندوستان کی مرکزی اسمبلی کے صدر سر عبدالرحیم نے کہا تھا:

ترجمہ: ''ہم ہندوستانی مسلمانوں میں سے کوئی افغانستان، ایران، سنٹرل ایشیاء، چینی مسلمانوں، عربوں اور ترکوں کے یہاں سفر کر رہا ہو تو اس کی اجنبیت دور ہوتے ذرا دیر نہیں لگتی اور وہ یوں محسوس کرنے لگتا ہے گویا اپنے ہی گھر میں ہے، اسے کوئی ایسی بات نظر نہیں آتی جس کے ہم عادی نہ ہوں اور جو ہماری دیکھی بھالی نہ ہو' مگر اس کے خلاف ہندوستان میں جب ہم اپنی گلی عبور کر کے اس حصے میں چلے جائیں جہاں ہمارے ہم وطن ہندو رہتے ہیں تو ہم تمام سماجی معاملات میں اپنے آپ کو ہندوؤں سے بالکل دور اور اجنبی پاتے ہیں۔'' (۱۷)

''وہ کہتے ہیں کہ مسلمان ملّت سے تعلق رکھنے والے معاشرے اور افراد کے مابین ستاروں کی طرح رشتہ، محبت و مودت قائم ہے مگر جس طرح ستاروں کی باہمی کشش آنکھوں سے دیکھ کر نہیں پہچانی جا سکتی اسی طرح ان کی باہمی محبت و مودّت کا رشتہ بھی ظاہر کی آنکھ سے نہیں دیکھا جا سکتا۔'' (۱۸)

رشته این قوم مثل انجم است — چون نگه هم از نگاه ما گم است
تیر خوش پیکان یک کیشیم ما — یک نما، یک بین، یک اندیشیم ما
مدعاے ما مآلِ ما یکیست — طرز و انداز خیال ما یکیست

(اسرار و رموز، صفحہ نمبر ۹۳)

بڑھ کے خیبر سے ہے یہ معرکۂ دین و وطن
اس زمانے میں کوئی حیدرِ کرّار بھی ہے؟

(بالِ جبریل، صفحہ نمبر: ۶۴/۳۵۶)

''جن لوگوں نے ''جاوید نامہ'' پڑھا ہے وہ جانتے ہیں کہ اقبال نے وطن دوستی کی مخالفت نہیں کی بلکہ اس وطنیت کی مخالفت کی ہے جو ایک ملک کے مسلمان کو دوسرے ملک کے مسلمان سے لڑا دے الگ قوم بنا دے ان کے نزدیک مسلمان ایک قوم ہے، اسے پارہ پارہ کر دینے والی وطنیت کے وہ خلاف ہیں۔'' (۱۹)

اس وقت دنیا میں اور بالخصوص ملّت اسلامیہ میں ایسی کوشش جس کا مقصد اولین افراد و اقوام کی نگاہ کو جغرافیائی حدود سے بالاتر کر کے ان میں ایک صحیح اور قومی انسانی سیرت کی تجدید و تولید ہو قابل احترام ہے۔ (۲۰)

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر
ہر فرد ہے ملّت کے مقدر کا ستارہ

(کلیات اقبال، ارمغان حجاز، ص:۳۷۵)

اجاڑا ہے تمیزِ ملّت و آئیں نے قوموں کو
مرے اہلِ وطن کے دل میں کچھ فکرِ وطن بھی ہے؟
(کلیاتِ اقبال، صفحہ نمبر ۱۰۳)

وطنیت، چاہے رنگ ونسل کی بنیاد پر ہو یا علاقائی حد بندی کی بنیاد پر، انسانوں کو ایک دوسرے سے الگ تھلگ کر کے ہوس پرست بنا دیتی ہے۔ علامہ اقبالؒ نے مسلمانوں کے ملّی تصور کو اجاگر کرنے کے لیے اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کا بھرپور استعمال کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

فرد قائم ربطِ ملّت سے ہے، تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں
(کلیاتِ اقبال، بانگِ درا، صفحہ نمبر ۲۳۶)

ملّت کے ساتھ رابطہ استوار رکھ
پیوستہ رہ شجر سے، امیدِ بہار رکھ
(کلیاتِ اقبال، بانگِ درا، صفحہ نمبر ۳۰۶)

یقیں افراد کا سرمایۂ تعمیرِ ملّت ہے
یہی قوت ہے جو صورت گرِ تقدیرِ ملّت ہے
(کلیاتِ اقبال، بانگِ درا، صفحہ نمبر ۳۳۴)

اقبال نے عروج وزوالِ مسلسل پر بہت غور وفکر کیا ہے اور اس ضمن میں جن اصولوں کی طرف اشارہ کیا ہے انھیں بھی اقبال کے تصورِ ملّت کی جامعیت کے لیے اس میں شامل سمجھنا چاہیے۔ اس نے تن آسانی، عیش پرستی اور غلط کاری کو حیاتِ اقوام کی کمی کا باعث قرار دیا ہے اور یہ بھی کہا ہے ملّت کی اجتماعی خطائیں معاف نہیں کی جاتیں اور خُدا اُن کی سزا ضرور دیتا ہے۔(۲۱)

فطرت افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے
کبھی کرتی نہیں ملّت کے گناہوں کو معاف
(کلیاتِ اقبال، ص:۵۵۹)

دامنِ دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں — اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملّت بھی گئی
(کلیاتِ اقبال، ص:۲۷۷)

"اقبال کے نزدیک اسلام ایک ازلی، ابدی، آفاقی اور عالمگیر نوعیت کا پیغام ہے اور ہر زمانہ اور ہر قوم کے لیے رشد و ہدایت کا سرچشمہ ہے اس لیے اس کے پیروکاروں کو رنگ، نسل، قبیلے اور ملک کے امتیازات مٹا کر یکجا ہو جانا چاہیے اور مسلمان ملکوں کی ایک الگ لیگ آف نیشنز قائم کرنی چاہیے۔"(۲۲)

اس دور میں قوموں کی محبت بھی ہوئی عام — پوشیدہ نگاہوں سے رہی وحدتِ آدم
تفریقِ مِلل حکمتِ افرنگ کا مقصود — اسلام کا مقصود فقط ملّتِ آدم
مکہ نے دیا خاکِ جنیوا کو یہ پیغام — جمعیتِ اقوام کہ جمعیتِ آدم!
(کلیاتِ اقبال، ص:۵۷۰،۵۷۱)

"اقبال کے خیال میں مسلم ملکوں کے اتحاد میں رکاوٹ اسی وجہ سے پیدا ہو رہی ہے کہ ان کی حد بندیاں اور تشکیل مغربی نظریۂ وطنیت کی بنیاد پر ہوئی ہے۔ ان کی بقا اسی میں مضمر ہے کہ وہ ایک مربوط ملّت کی صورت میں منظم ہو جائیں، اور "او آئی سی" اور اس سے منسلک اداروں کے قیام سے اقبال کے افکار کا اثر کسی حد تک ظاہر ہونا بھی شروع ہو گیا ہے اور اب توقع بندھ رہی ہے کہ اقبالؒ کے تصورِ ملّت کے تحت مسلمان ملّتِ واحدہ کی شکل میں ایک عالمگیر برادری میں کبھی نہ کبھی ضرور ڈھل جائیں گے۔(۲۳)

اقبال کو اسلام کے تصورِ ملّت کی عظمت کا احساس ہوا جو نسلی امتیازات اور جغرافیائی حد بندیوں سے بالاتر، ایک آفاقی تصور ہے، یہ احساس وشعور ایک فکری انقلاب کا باعث ہوا۔ اقبال کا یہ قول کہ ''یورپ کی آب و ہوا نے مجھے مسلمان کر دیا۔''(۲۴)

"درحقیقت انسانیت کے مستقبل کے بارے میں اقبال کی تمام تر توقعات اسلام اور ملّت اسلامیہ سے وابستہ تھیں۔ اسی لیے انھوں نے کہا تھا:"(۲۵)

سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا
(کلیاتِ اقبال، صفحہ نمبر ۳۳۰)

"انھیں یقین تھا کہ مسلمان اپنی ملی خُودی کے استحکام و استقلال کے بعد، بےخُودی کی آخری منزل یعنی تعمیرِ انسانیت کی طرف تیزی سے گامزن ہوں گے۔ ملّت اسلامیہ، خیر الامم کا کردار ادا کرتے ہوئے اقوام عالم تک یہ پیغام پہنچانے اور اسلام کو امن واتحاد کی ایک عالمی تحریک کی صورت میں دنیا کے سامنے پیش کرے

لیکن اس منصب کے حصول کے لیے یہ ہے کہ پہلے خود متحد ہو جائے۔"(۲۷)

اقبالؒ لکھتے ہیں:

''اسلام قید وطن سے آزاد ہے۔ اس کا مقصد ہے ایک ایسے انسانی معاشرے کی تشکیل، جو مختلف نسلوں اور قوموں کو باہم جمع کرتے ہوئے ایک ایسی امت تیار کرے جن کا اپنا ایک مخصوص شعور ذات ہو۔''(۲۸)

وطن کے تشخص کو ابھارنے سے رنگ و نسل اور امتیازات فروغ پاتے ہیں، جب ایک مسلمان جو ایک اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتا ہے۔ ذات پات، رنگ و نسل اور امتیازات سے بالاتر ہوتا ہے۔ اس کا رنگ صرف خُدا کی ذات کا رنگ ہوتا ہے۔ دین کے مقابلے میں اسلام نے وطن کو کوئی خاص اہمیت نہ دی۔ اسلام کی تعلیمات میں وطن، لسانی اور نسلی رشتے، دین سے کم ترین برادری، خاندان اور گروہ دین پر قربان کر دینے چاہییں کیوں کہ یہ سارے رشتے فانی ہیں۔ مذہب اور دین کا رشتہ پائدار اور رُوحانی ہے۔ یہ انسان کی ذات کو لا محدود اور اس کی سوچوں کو آفاقی بنا دیتا ہے۔

علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں: ''اسلام ہی ہمارا وطن ہے۔ اسلام ہی ہماری نسل ہے۔''(۲۹)

قرآن مجید میں مختلف مقامات پر اجتماعیت کو قومی زندگی کی سب سے بڑی بنیاد اور انسانوں کے لیے اللہ تعالیٰ کی جانب سے بڑی رحمت و نعمت قرار دیا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ: ترجمہ: سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ لو اور تفرقہ میں نہ پڑو، اور اللہ کی اس نعمت کو یاد کرو کہ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ اس نے تمھارے دلوں میں الفت پیدا کر دی اور اس کی نعمت سے تم بھائی بھائی بن گئے۔''(۳۰)

علامہ اقبالؒ اس وحدت کے احساس کو بیدار کرنے کے لیے اخوت کا درس دیتے ہیں۔ آج اقبالؒ کا تصور ملّت اجاگر کرنے کی سخت ضرورت ہے۔

اقبالؒ نے سچ کہا تھا ''جب کسی قوم میں انتشار پیدا ہو جاتا ہے تو تاریخ انھیں کبھی معاف نہیں کر سکتی۔''(۳۱)

ملّت اسلامیہ کو اکٹھا کرنے کے لیے عالم گیر تحریک کی ضرورت ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو جائیں اس میں ہماری نجات ہے اور یہی وقت کا تقاضا ہے۔

حواشی

۱۔ محمد منوّر، پروفیسر، ایقان اقبال (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۱۲ء) ص: ۱۲۲

۲۔ محمد اکرم سعید، پروفیسر، اقبال کا خصوصی مطالعہ (لاہور: عبداللہ برادرز، ۲۰۰۷ء) ص: ۴۶۶

۳۔ محمد اکرم سعید، پروفیسر، اقبال کا خصوصی مطالعہ (لاہور: عبداللہ برادرز، ۲۰۰۷ء) ص: ۴۶۶

۴۔ عبدالسلام ندوی، اقبال کامل (لاہور: الفیصل ناشران و تاجران کتب، ۲۰۰۸ء) ص: ۲۹۷

۵۔ عبدالسلام ندوی، اقبال کامل (لاہور: الفیصل ناشران و تاجران کتب، ۲۰۰۸ء) ص: ۲۹۸

۶۔ افتخار احمد صدیقی، فروغ اقبال (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۹۶ء) ص: ۳۳۱، ۳۳۲

۷۔ عابد علی عابد، سیّد، شعر اقبال (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء) ص: ۱۳۵، ۱۳۶

۸۔ علامہ اقبال کے بنیادی افکار و نظریات، کورس کوڈ ۲۰۷ (اسلام آباد: علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، ۲۰۰۴ء) ص: ۱۳۱ تا ۳۲

۹۔ عبداللہ، سیّد، ڈاکٹر، ولی سے اقبال تک (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۰ء) ص: ۲۸۷

۱۰۔ محمد اکرم سعید، پروفیسر، اقبال کا خصوصی مطالعہ (لاہور: عبداللہ برادرز، ۲۰۰۷ء) ص: ۴۷۴

۱۱۔ خالد اقبال یاسر، ڈاکٹر، جدید تحریکات اور اقبال (لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۲۰۱۵ء) ص: ۴۰۲

۱۲۔ خالد اقبال یاسر، ڈاکٹر، جدید تحریکات اور اقبال (لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۲۰۱۵ء) ص: ۴۰۵

۱۳۔ غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر، اقبال ایک مطالعہ (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۱۲ء) ص: ۱۲۶

۱۴۔ محمد منوّر، پروفیسر، ایقان اقبال (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۱۲ء) ص: ۱۲۶

۱۵۔ محمد منوّر، پروفیسر، ایقان اقبال (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۱۲ء) ص: ۱۲۹

۱۶۔ محمد منوّر، پروفیسر، ایقان اقبال (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۱۲ء) ص: ۱۳۳

17. Meaning of Pakistan by F.K. Durrani (Lahore: Skhih Ashraf)

Page No: 72

۱۸۔محمد منُور، پروفیسر، ایقان اقبال (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۱۲ء)ص:۱۳۵

۱۹۔عبداللہ، سیّد، ڈاکٹر، طیف اقبال، مرتبہ: ممتاز منگلوری، ڈاکٹر (لاہورا کیڈمی، ۲۰۰۹ء)ص:۱۰۸

۲۰۔خالد پرویز، پروفیسر، توحید، اقبالؒ اور ملّت اسلامیہ (لاہور: بیکن بکس: ۲۰۰۴ء)ص: ۵۰۳

۲۱۔خالد اقبال یاسر، ڈاکٹر، جدید تحریکات اور اقبال (لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۲۰۱۵ء)ص:۵۲۲

۲۲۔خالد اقبال یاسر، ڈاکٹر، جدید تحریکات اور اقبال (لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۲۰۱۵ء)ص: ۵۲۳

۲۳۔خالد اقبال یاسر، ڈاکٹر، جدید تحریکات اور اقبال (لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۲۰۱۵ء)ص: ۵۲۴

۲۴۔افتخار احمد صدیقی، فروغ اقبال (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۹۶ء)ص:۲۷۶

۲۵۔افتخار احمد صدیقی، فروغ اقبال (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۹۶ء)ص:۲۸۶

۲۶۔افتخار احمد صدیقی، فروغ اقبال (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۹۶ء)ص:۲۸۶

۲۷۔افتخار احمد صدیقی، فروغ اقبال (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۹۶ء)ص:۲۸۷

۲۸۔ہارون الرشید تبسم، ڈاکٹر، قندیل اقبال (لاہور: مکتبہ تعمیر انسانیت، ۲۱۔اپریل ۲۰۱۴ء)ص:۳۲۷

۲۹۔نذیر نیازی، سیّد، اقبال کے حضور (لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز۔ن۔د)ص:۱۵

۳۰۔قرآن مجید، آل عمران: ۱۰۳

۳۱۔ہارون الرشید تبسم، ڈاکٹر، قندیل اقبال (لاہور: مکتبہ تعمیر انسانیت، ۲۱۔اپریل ۲۰۱۴ء)ص: ۳۳۴

علامہ اقبالؒ اور عقل و عشق

علامہ اقبالؒ کے کلام میں عقل و عشق کی آویزش کو گراں قدر اہمیت حاصل ہے۔اقبالؒ کے نزدیک عقل و عشق عطیہ الٰہی اور نعمت ازلی ہیں۔علامہ اقبالؒ نے عشق کو وسیع معنوں میں استعمال کیا ہے ان کے نزدیک یہ وہ پاکیزہ اور طاقتور جذبہ ہے جو انسان کو عظمت عطا کرتا ہے اور اسے اعلیٰ مقاصد کے حصول کی طرف مائل کرتا ہے ان کے نزدیک عشق گرمی حیات کا موجب ہے اور اس کائنات میں رونق ہے یہ ایک عالمگیر اور بیکراں جذبہ ہے۔اقبالؒ کے نزدیک عشق قدرت کا ایک انمول عطیہ اور نعمت ہے۔یہ نعمت ساری مخلوق کو عطا ہوئی ہے لیکن اس کا امین انسان کو بنایا گیا ہے۔

علامہ اقبالؒ کے یہاں عشق اور ان کے مترادفات ولوازمات یعنی وجدان، خودآگہی، باطنی شعور، جذب، دل، محبت، جنون کا ذکر جس تکرار اور انہماک سے ملتا ہے۔اس سے ثابت ہوتا ہے کہ علامہ اقبالؒ کے تصورات میں عشق کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔انسانوں میں پیغمبروں کا مرتبہ دوسروں سے اس لیے بلند تر ہے کہ ان کا سینہ محبت کی روشنی سے یکسر معمور اور ان کا دل بادہ عشق سے یکسر سرشار ہے۔علامہ اقبالؒ نظم ''محبت'' میں بیان کرتے ہیں:

تڑپ بجلی سے پائی، حُور سے پاکیزگی پائی — حرارت لی نفس ہائے مسیح ابن مریمؑ سے
ذرا سی پھر ربوبیت سے شانِ بے نیازی لی — ملک سے عاجزی، افتادگی تقدیرِ شبنم سے
پھر ان اَجزا کو گھولا چشمہ حیواں کے پانی میں — مرّکب نے محبت نام پایا عرش اعظم سے

(کلیات اقبال، بانگ درا، صفحہ نمبر ۶۲)

یہ ہے وہ محبت کا جذبہ عشق جو اقبالؒ کے دائرہ فکر وفن کا مرکزی نقطہ ہے۔یہی تخلیق کائنات سے

لے کر ارتقائے کائنات تک رموزِ فطرت کا آشنا اور کارزارِ حیات میں انسان کا رہنما و کارکُشا ہے۔ کائنات کی ساری رونق اسی کے دم سے ہے ورنہ اس سے پہلے، اس کی فضا بے جان اور بے کیف تھی۔

عقل

''یہ عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں اچھے برے میں تمیز یعنی فرق کرنے کی صلاحیت اور اس میں سے اچھے کا انتخاب کرنا۔ ادراک، فہم، سمجھ وغیرہ الفاظ بھی عقل کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔ دنیا میں رنگ رنگ کے کام اور راستے ہیں انسان اپنی عقل سے کام لے کر اپنے لیے بہترین راستے کا انتخاب کرتا ہے اور عقل کی مدد سے ہی اس راستے کی اونچ نیچ کو سمجھتا ہے اور اس کا مقابلہ کرتا ہے۔ انسانوں کو حیوانوں سے جو چیزیں ممتاز کرتی ہیں، انسانی عقل بھی ان میں سے ایک ہے۔ حیوان بھی محدود سمجھ بوجھ رکھتے ہیں لیکن انھیں عقل کا وہ درجہ حاصل نہیں ہوتا جو حضرت انساں کے حصے میں آیا ہے۔''(۱)

عشق

''یہ بھی عربی زبان کا لفظ ہے کسی شخص، کام، خیال یا مظہر سے انتہا درجے کی دوستی کے لیے یہ لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ آخری سلام یا اس سلام کو بھی عشق کہتے ہیں جو پہلوان اکھاڑے میں اتر کر کرتے ہیں اردو میں عشق پیچاں ایک بیل کا نام بھی ہے جس کی خاصیت یہ ہے کہ وہ جس درخت سے چمٹ جائے اسے سکھا دیتی ہے، ''عشق ہے'' معنی آفرین اور شاباش کے ہیں، عام طور سے عشق حقیقی اور عشق مجازی کی اصطلاحیں استعمال ہوتی ہیں حقیقی عشق سے مراد خالق کائنات سے غیر معمولی تعلق اور شیفتگی ہے جب کہ مجازی سے مراد انسانوں سے ایسا ہی تعلق لیا جاتا ہے۔''(۲)

''محبت کا بلند تر درجہ عشق کہلاتا ہے اور یہی محبت کسی درجے پر جا کر جنون کہلاتی ہے، عشق کا محرک مجازی یا حقیقی ہو سکتا ہے، یہ عشق ناممکن کو ممکن بنا ڈالتا ہے، کہیں فرہاد سے نہر کھدواتا ہے تو کہیں سوہنی کو کچے گھڑے پر تیرنے پر مجبور کر دیتا ہے، عشق ہی کی بدولت کوئی صدیق اکبرؓ کہلاتا ہے تو کوئی سیّدنا بلالؓ بنتا ہے، غرض ہر عشق کے مدارج مختلف ہیں کوئی عشق مجازی میں ہی گھر کر رہ جاتا ہے تو کوئی عشق مجازی سے حقیقی تک رسائی حاصل کر کے حقیقی اعزاز و شرف حاصل کرتا ہے۔''(۳)

آپ ''حکمۃ الاشراق'' میں لکھتے ہیں کہ:

''ہر بلند نُور کو نیچے کے نُور پر غلبہ و اقتدار حاصل ہے اور نیچے کا نُور بلند نُور سے محبت رکھتا ہے اور اسی قہر و مہر سے نظام عالم کا وجود وابستہ ہے اور جب بہت سے انوار جمع ہو جاتے ہیں تو بلند نُور نیچے کے نُور پر غلبہ حاصل کر لیتا ہے اور نیچے کے نُور کو بلند نُور کا شوق اور عشق ہو جاتا ہے۔ اس لیے نُور الانوار (یعنی خُدا کو) اپنے ماسوا تمام موجودات پر غلبہ حاصل ہے، اور وہ اپنی ذات کے سوا کسی اور کا عشق نہیں کرتا کیوں کہ وہ ہر چیز سے زیادہ خوب صورت اور مکمل ہے اور اس کو خود اپنا کمال نظر آتا ہے۔ اس لیے وہ عاشق بھی ہے اور معشوق بھی ہے اور چوں کہ خُدا سے زیادہ کوئی چیز حسین اور مکمل نہیں، اس لیے کسی چیز کو بھی دوسری چیز کے عشق میں وہ لطف نہیں حاصل ہوتا جو عشق الٰہی میں ہوتا ہے، غرض نظام عالم کا وجود مہر و قہر سے قائم ہے اور انوارِ مجردہ کی جس قدر کثرت ہوتی ہے اور جس قدر ان میں علت و معلول کا سلسلہ بڑھتا جاتا ہے اسی قدر نظام عالم مکمل ہوتا ہے اور کل عالم مل کر ایک عالم بن جاتا ہے۔''(۴)

صوفی شعرا جو ''ہمہ اوست'' کے قائل ہیں، ان کے نزدیک حقیقی وجود کائنات میں صرف ذات باری تعالیٰ کا ہے، کائنات فریب محض ہے اور عقل جو علم کائنات کے حصول کا ذریعہ ہے کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ عشق ہی وہ ذریعہ ہے جس سے حقیقی وجود یعنی ذات باری تعالیٰ تک رسائی ممکن ہے۔ تصوّف میں یہ نظریہ عشق دراصل فلسفہ اشراق سے آیا ہے، جس کے نزدیک یہ نظام عالم ''مہر و قہر'' کی بنیاد پر قائم ہے اور یہ نظام عشق ہی کی بدولت تکمیل پاتا ہے۔

مولانا عبدالسلام ندوی ''اقبال کامل'' میں لکھتے ہیں:

''اشراقی فلسفیوں کا یہی عشق ہے جس کو ہمارے صوفیوں نے وحدت الوجود کی شکل میں لیا ہے اور وہ تصوّف کی راہ سے صوفیانہ شاعری میں آیا اور اس عشق کے ذریعہ سے جو صوفیانہ نظریات قائم ہوئے، فارسی شاعری نے نہایت لطیف انداز میں ان کی تشریح کی۔

۱۔ ان میں پہلا نظریہ یہ ہے کہ کائنات کی بنیاد عشق و محبت پر قائم ہے کیوں کہ دنیا میں علت و معلول کا سلسلہ قائم ہے اور ہر معلول اپنی علت سے عشق و محبت رکھتا ہے اور علت کو اس پر غلبہ و اقتدار حاصل ہوتا ہے لیکن چوں کہ ایک ہی چیز دو حیثیتوں سے علت و معلول دونوں ہوتی ہیں اس لیے ہر چیز میں قہر اور بعض میں مہر زیادہ ہوتا ہے۔ عشق و محبت کے اسی عالمگیر نظریہ کو مولانا رومؒ نے اس طرح بیان کیا ہے:

جملہ اجزائے جہاں زاں حکم پیش — جفت جفت و عاشقان جفت خویش
ہست ہر جزوے بعالم جفت خواہ — راست ہمچو کہربا و برگِ کاہ

آسماں گوید زمین را مرحبا — باتوام جوں آہن و آہن ربا
میل ہر جزے بہ جزے مے نہد — زاتحاد ہر دو تولیدے جہد
ہر یکے خواہاں دگر را ہمچو خویش — از پئے تکمیلِ فعل و کارِ خویش

(۵)

''شعرائے ایران نے عشق کے اسی عالمگیر نقطۂ نظر سے کائنات کا دیکھا تو جن چیزوں میں عشق و محبت کی کشش زیادہ نظر آئی ان کو باہم عاشق و معشوق بنا دیا۔ ذرہ و آفتاب، کاہ و کہربا، کبک و آتش، سرو و قمری، گل و بلبل، پروانہ و شمع، نیلوفر و آفتاب، ماہ و کتان سب کے سب باہم عاشق و معشوق ہیں۔ دوسرے ممالک کی شاعری میں ایک آدھ چیز کو عاشق مانتے ہیں لیکن فارسی شاعری نے تمام کائنات کو عاشق و معشوق بنا دیا۔''

''مولانا شبلیؒ نے شعر العجم میں لکھا ہے کہ یہ اس عالمگیر حسن کا اثر تھا جو ایران میں جمع ہو گیا تھا لیکن ہمارے نزدیک یہ فلسفہ اشراق کا اثر ہے جس نے عشق کا عالمگیر کائناتی نظریہ قائم کیا۔''

۲۔ ''علت معشوق اور معلول عاشق ہوتا ہے اور علت میں قہر اور معلول میں مہر کا جذبہ پایا جاتا ہے۔ زمین اور زمین کی پیداوار پر سب سے زیادہ اثر آسمان کا پڑتا ہے، اس لیے آسمان اس کی علت اور زمین معلول ہے اور اسی نسبت سے آسمان میں قہر اور زمین میں مہر کا جذبہ زیادہ موجود ہوتا ہے۔ ایرانی شعرا آسمان کی جفا کاری اور بے مہری کی جو شکایت کرتے ہیں وہ اسی اشراقی فلسفہ کا اثر ہے جو علت کو علت قاہرہ قرار دیتا ہے۔''

۳۔ ''علت میں قدرت، غلبہ، اقتدار اور عز و شرف پایا جاتا ہے اور اسی نسبت سے معلول میں عجز و اطاعت اور ذلت و مسکنت پائی جاتی ہے اور چوں کہ علت معشوق اور معلول عاشق ہوتا ہے، اس لیے ایرانی شاعری سے زیادہ کسی شاعری نے عاشق کو ذلیل نہیں کیا۔

۴۔ عشق اتحاد چاہتا ہے۔ عاشق جب تک معشوق سے متحد نہ ہو جائے اس کو اور کسی چیز سے تسکین نہیں ہوتی۔ عشق کے اس نظریہ نے وحدت الوجود کا مسئلہ پیدا کیا اور صوفیوں نے خُدا کی ذات کے ساتھ اتحاد پیدا کرنا چاہا لیکن جسم کا اتحاد جسم سے نہیں ہوتا بلکہ رُوح کا اتحاد رُوح سے ہوتا ہے اور خُدا چوں کہ ہمہ تن رُوح ہے اس لیے اس سے اتحاد پیدا کرنے کے لیے جسم کو فنا کرنا چاہیے، صوفیوں کے ریاضت و مجاہدہ کی بنیاد اسی نظریہ عشق پر ہے۔''

۵۔ ''خُدا خود اپنی ذات پر عاشق ہے، اس لیے وہ عاشق بھی ہے اور معشوق بھی، اس سے زیادہ کوئی چیز حسین و جمیل نہیں، اس لیے وہ کسی دوسری چیز پر عاشق نہیں ہو سکتا، البتہ اس میں اپنے حسن کی جلوہ گری کا تماشا

دیکھ سکتا ہے اور اسی غرض سے اس نے دنیا کو پیدا کیا ہے۔''

۶۔ ''حسن و جمال اور تمام محاسن و فضائل کا منبع خُدا کی ذات ہے اور اسی کے فیض کا پرتو درجہ بدرجہ تمام کائنات پر پڑتا ہے، اور دنیا اس سے روشن ہو جاتی ہے۔ اس لیے تمام اشیا میں جو حسن نظر آتا ہے وہ عارضی اور مستعار ہے۔ اگر آفتاب کے پرتو سے دیوار روشن ہو جائے تو دیوار دراصل روشن نہیں بلکہ اصل میں آفتاب روشن ہے دیوار پر صرف اس کا پرتو پڑ گیا ہے۔''

گر شود پُر نُور روزن یا سرا — تو مدان روشن مگر خورشید را
ہر در و دیوار گوید روشنم — پرتو غیرے ندارم ایں منم
پس بگوید آفتاب اے نا رشید — چوں کہ من غائب شوم آید پدید

(۶)

مولانا رُوم فلسفہ اور تصوّف دونوں کے اسرار و رموز سے واقف تھے، اس لیے ان کو معلوم ہو گیا کہ فلسفیانہ اور متکلمانہ عقل خُدا تک نہیں پہنچا سکتی، اس کا ذریعہ صرف عشق و محبت ہے جو تصوّف کا مایہ خمیر ہے۔ اس لیے سب سے پہلے انھوں نے عقل کے خلاف آواز بلند کی اور چوں کہ امام رازیؒ نے اسی زمانے میں عقل و حکمت کا صور خاص طور پر پھونکا تھا، اس لیے تخصیص کے ساتھ ان کا نام لے کر فرمایا:

پائے استدلالیاں چوبیں بود
پائے چوبیں سخت بے تمکیں بود
گر باستدلال کارِ دیں بدے
فخر رازیؒ راز دار دیں بدے

لیکن موجودہ زمانہ مولانا رومؒ کے زمانے سے بھی زیادہ سخت ہے، مولانا روم کے زمانے میں عقل و عشق دونوں زندہ تھے، اس لیے عشق عقل کا مقابلہ کر سکتا تھا لیکن اس دور میں صرف عقل زندہ ہے اور عشق بالکل مردہ ہو چکا ہے۔

برا نا مان، ذرا آزما کے دیکھ اسے
فرنگ دل کی خرابی، خرد کی معموری

(۷)

ابن سینا کے مطابق، عشق ایک عالمگیر جذبۂ حیات ہے جو حیات کے نباتی اور حیوانی مدارج سے لے کر انسان کے رُوحانی ارتقا تک ہر سطح پر، حرکت اور ارتقا کے محرک جذبہ کی حیثیت سے کارفرما ہے لیکن اس تصور

کی جدید فلسفیانہ بنیادوں پر تشکیل اور اس قالب میں رُوحِ اسلامی کا نفوخ، اقبال کی فکرِ رسا کی دین ہے۔'' (۸)

''اقبالؒ کے نزدیک یہ عالمگیر قانون جذبۂ عشق ہے، یہی وہ جذبہ ہے جس کی وجہ سے ہر شے اپنے مبدا، اپنی اصل کی طرف عود کرنے کے لیے بے تاب ہے، یہی بے تابی ہے جو فطرت کے ہر مظہر میں ایک خلش، ایک سوز، ایک بے چینی، ایک جستجو اور ایک آرزو بن کر اس میں حرکت و ہیجان پیدا کیے ہوئے ہے، ایک مفکر کی ذہنی کشمکش سے لے کر ایک ادنیٰ جرثومے کی کشمکش حیات تک، سارے مظاہر میں ایک ہی بنیادی جذبہ غیر شعوری طور پر کام کر رہا ہے اور یہ جذبۂ عشق ہے۔'' (۹)

جذبۂ عشق حیات کی تمام متنوع اور متضاد جدوجہد کا سرچشمہ ہے۔ اس کا سوز کہیں مختلف قوتوں کے درمیان کشش و انجذاب کی صورت میں سوزِ عشق خُودی کی ہر اکائی میں نمود اور نشوونما کا جذبہ بن کر کام کر رہا ہے اور اسی سوز کی قوت سے خُودی کی مختلف اکائیاں ایک دوسرے سے متصادم ہوتی ہیں۔ عشق ہی صیاد ہے اور عشق ہی صید بھی ہے، شکرے کا کبوتر پر جھپٹنا بھی اسی کے سوز کا کرشمہ ہے، کبوتر کی تحفظ ذات کے لیے جدوجہد بھی اسی کی بدولت ہے، عشق ہی شعلہ ہے اور عشق ہی جل کر خاکستر ہو جانے والا خس و خاشاک۔ اہل دانش کی مساعی کا سرچشمہ بھی اسی جذبے کا سوز ہے اور اہل دین کی جذب و مستی کا منبع بھی یہی ہے:

عشق ہم خاکستر و ہم اخگر است
کارِ او از دین و دانش برتر است (۱۰)

اقبالؒ نے عشق کے معمولی لفظ کے جسے کچھ بلند معنی مولانا روم نے ضرور دیے تھے، اس حد تک ترقی دی کہ وہ دمِ جبرئیل بن گیا، دلِ مصطفی ﷺ قرار پایا، خُدا کا رسول گردانا گیا، اس کا کلام بتایا گیا اور وہ عقل و دلِ و نگاہ کا مرشد قرار پایا، اسکے بغیر شریعت اور دین بت کدہ قرار دیے گئے۔ وہی صدقِ خلیل ہے، وہی صبرِ حسینؓ ہے اور بدر و حنین کے غزوات کا وہی محرک رہا ہے۔'' (۱۱)

عقل و دل و نگاہ کا مرشدِ اولیں ہے عشق
عشق نہ ہو تو شرع و دیں بت کدۂ تصورات
صدقِ خلیلؑ بھی ہے عشق، صبرِ حسین بھی ہے عشق
معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق
(کلیاتِ اقبال، بالِ جبریل، صفحہ نمبر ۴۸۷)

علامہ اقبالؒ عشق کو مختلف حیثیتوں سے کائنات میں جلوہ گر دیکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک عشق دم

جبرئیل ہے، دلِ مصطفی ﷺ ہے۔ عشق خُدا کا کلام ہے، صدقِ خلیل بھی عشق ہے اور صبرِ حسینؓ بھی عشق ہے۔ دراصل عشق نام ہے جہدِ مسلسل اور کوشش ناتمام کا۔ الغرض عشق انسانی زندگی میں رواں دواں ہے بلکہ اقبالؒ عشق کو ہی زندگی کا نام دیتے ہیں۔

عشق دمِ جبرئیل، عشق دلِ مصطفیٰ
عشق خُدا کا رسول، عشق خُدا کا کلام
(۱۲)

''اقبال کے مطابق عشق الٰہی نے آنحضرت ﷺ کو کفار کے خلاف بدرُ و حنین کے جنگی معرکوں میں کامیابی سے سرفراز کیا ورنہ عشق کی طاقت کے بغیر ان مہمات کا انجام پانا ناممکن تھا۔ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت بھی عشق الٰہی ہی کا کرشمہ ہے۔ اس وسیع مضمون کو اقبالؒ یوں ادا کرتے ہیں۔'' (۱۳)

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی
(کلیاتِ اقبال، بانگِ درا، صفحہ نمبر ۲۱۶)

بقول خلیفہ عبدالحکیم ''اقبال کا عقیدہ تھا کہ عقل ایک خُدا داد نعمت ہے لیکن اس کی کچھ حدود ہیں ان حدود کے باہر اس کے دعوے لا حاصل اور بے معنی ہو جاتے ہیں اس کی رسائی صرف خارجی دنیا تک ہے، حقائق باطنی کا شعور اسے نہیں ہوتا، تذبذب و تشکیک اور سود و زیاں کا خیال اس کی سرشت میں ہے۔'' (۱۴)

''اقبال کے شعری باطن کا جائزہ لیا جائے اور علامات کی زیریں سطح سے شناسائی حاصل کی جائے تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ اقبالؒ نے جو کچھ خطبات میں کہا ہے اور پھر جو کچھ شاعری میں کہا ہے، بنیادی اور اساسی طور پر ایک ہی خیال ہے جو نہ تو محض وہبی سوچ کے حوالے سے عشق کا علم بردار ہے اور نہ محض منطقی سوچ کے حوالے سے عقل کا بلکہ ایک بالکل جداگانہ حیثیت رکھتا ہے، جس میں عقل اور عشق دونوں صرف ہوئے ہیں۔'' (۱۵)

''عقل بطور ذریعہ تحصیل علم اپنی جگہ پر محدود ہے کیوں کہ اس ذریعے سے حاصل کردہ معلومات میں کسی نہ کسی خامی یا غلطی کا امکان ہے۔'' (۱۶)

علامہ اقبالؒ عقل کو زیست کے خادموں میں شمار کرتے ہیں۔ زیست پر اس کے بے شمار احسانات ہیں لیکن وہ سب کچھ نہیں ہے۔ اس کی پہنچ ایک خاص حد تک ہے لیکن جذبہ اور وجدان بھی اسی وقت قابلِ اعتبار ہوں گے جب انسان عقل کے تعاون سے اقدارِ حیات کی طرف قدم بڑھائے۔ عقل انسان کو منزل کے قریب

پہنچاتی ہے اور عشق کی مدد سے منزل کا حصول ممکن ہوتا ہے۔

عقل گو آستاں سے دُور نہیں — اس کی تقدیر میں حضور نہیں
علم میں بھی سرور ہے لیکن — یہ وہ جنت ہے جس میں حور نہیں
دل بینا بھی کر خُدا سے طلب — آنکھ کا نُور، دل کا نُور نہیں

(کلیاتِ اقبال (اردو)، ص: ۳۳۵)

''بقول شخصے زمانے میں جتنے انقلاب آئے ہیں سب دیوانوں نے برپا کیے ہیں فرزانوں نے نہیں۔ یہاں دیوانگی سے مراد عشق ہے۔'' (۱۷)

خرد کی گتھیاں سُلجھا چکا میں
میرے مولا مجھے صاحب جنوں کر

(کلیاتِ اقبال، ص: ۳۷۹)

عشق کو عقل پر برتری دینے کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ عقل کا دائرۂ کار محدود ہے۔ وہ آنے والی باتوں اور چھپی ہوئی چیزوں سے جو اس کے علم میں نہ ہوں انکار کر دیتی ہے جبکہ عشق انسان کو کائنات کے سربستہ رازوں سے بھی آگاہ کرتا ہے۔ اس طرح عشق کا دائرہ کار کائنات کی ہر شے حتیٰ کہ ذاتِ مطلق تک بھی ہے۔

ہے ذوقِ تجلّی بھی اسی خاک میں پنہاں
غافل! تو نرا صاحبِ ادراک نہیں ہے

(کلیاتِ اقبال (اردو) ص: ۳۲۵)

نہ دیا نشانِ منزل مجھے اے حکیم تُو نے
مجھے کیا گلہ ہو تجھ سے تُو نہ رہ نشیں نہ راہی

(کلیاتِ اقبال (اردو) صفحہ نمبر ۳۳۸)

ڈاکٹر قاضی عبدالحمید فرماتے ہیں:

''عشق کی موشگافیوں اور چون و چرا کی گنجائش نہیں ہے۔ وہ رموز کے سارے پردے اس طرح اٹھا دیتا ہے کہ شاید معنی بے نقاب ہو جاتا ہے۔ ہر چیز میں انفرادیت پیدا کر لینا اس کی سرشت میں ہے اس انفرادیت پسندی کے باوصف وہ نظامِ قدرت کو باہم مربوط رکھنے میں مدد دیتا ہے، ذرے ذرے کو ایسی تربیت دیتا ہے کہ اس کا معنوی تعلق، اصل حقیقت سے بہر حال قائم رہتا ہے، عشق راہ کی دشواریوں اور رکاوٹوں کو خاطر

میں نہیں لاتا، کسی خوف و ہراس کے بغیر آتشِ نمرود میں کود پڑتا ہے اور بالآخر اپنی منزل مقصود کو پالیتا ہے۔'' (۱۸)

عقل و عشق کے حوالے سے علامہ اقبالؒ کی اہم نظم ''عقل و دِل'' ہے:

عقل و دِل

عقل نے اک دن یہ دل سے کہا — بھولے بھٹکے کی رہنما ہوں میں
ہوں زمیں پر، گزر فلک پہ مرا — دیکھ تو کس قدر رسا ہوں میں
کام دُنیا میں رہبری ہے مرا — مثل خضرِ خجستہ پا ہوں میں
ہوں مفسّر کتابِ ہستی کی — مظہرِ شانِ کبریا ہوں میں
بوند اک خون کی ہے تُو لیکن — غیرتِ لعلِ بے بہا ہوں میں
دل نے سن کر کہا یہ سب سچ ہے — پر مجھے بھی تو دیکھ، کیا ہوں میں
راز ہستی کو تو سمجھتی ہے — اور آنکھوں سے دیکھتا ہوں میں
ہے تجھے واسطہ مظاہر سے — اور باطن سے آشنا ہوں میں
علم تجھ سے، تو معرفت مجھ سے — تو خُدا جُو، خُدا نما ہوں میں
علم کی انتہا ہے بے تابی — اس مرض کی مگر دُعا ہوں میں
شمع تو محفلِ صداقت کی — حُسن کی بزم کا دِیا ہوں میں
تُو زمان و مکاں سے رشتہ بپا — طائرِ سِدرہ آشنا ہوں میں
کس بلندی پہ ہے مقام مرا — عرش ربِّ جلیل کا ہوں میں

(کلیاتِ اقبال، صفحہ نمبر ۴۱، ۴۲)

اس نظم ''عقل و دل'' کو سامنے رکھ کر عقل اور عشق کے مقام کو تعین کرنے کی کوشش کی جائے مندرجہ ذیل باتیں سامنے آتی ہیں:

(۱)۔ عقل ہستی کی حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کرتی ہے مظاہر کے ذریعہ وہ اِس حقیقت کا بالواسطہ ادراک کرتی ہے، اس کے ذریعہ جو علم حاصل ہوتا ہے اس کے واسطہ سے حقیقت تک پہنچنے کی کوشش کرتی ہے لیکن عشق بلا کسی واسطہ کے حقیقتِ ہستی کا مشاہدہ کرتا ہے۔ اس طرح عقل کا منزل تک پہنچنا یقینی نہیں ہے مگر عشق بلاشبہ منزل آشنا ہوتا ہے۔

(۲)۔ عقل زمان و مکاں کی حدود کی پابند ہے۔ ان حدود کو توڑنا اس کے بس کی بات نہیں ہے۔ یہ

صرف زمان و مکاں کے مظاہر کے ادراک کا ذریعہ ہے اور اس ذریعہ سے ہمیں صرف علم ہو سکتا ہے مگر عشق کی پہنچ زمان و مکاں کی حدود سے ماورا اِس عالم لامحدود تک ہے جہاں حقیقتِ مُطلق بے حجاب نظر آتی ہے اور یہ مقام ''معرفت'' کا مقام ہے۔

(۳)۔ عقل کا منتہائے مقصود بھی حقیقتِ مُطلق کی معرفت ہی ہے۔ وہ علم کو ذریعہ بنا کر اس حقیقت تک پہنچنے کی کوشش کرتی ہے لیکن یہ کوشش ہمیشہ نا تمام رہتی ہے۔ اس کے برعکس عشق اس منزل تک صحیح رہبری کا فرض انجام دیتا ہے اور اس کی رہبری میں حقیقتِ مُطلق تک پہنچنا ممکن ہے۔ اسی طرح عقل صرف ''خُدا جو'' ہے جبکہ عشق ''خُدا نما'' ہے۔

(۴)۔ عقل بھی صداقت کی شمع ہے کیوں کہ علم کا منبع اور بھلے برے کی پہچان کا ذریعہ ہے۔ سیّدھے راستے کا انتخاب علم کی روشنی میں ہی ہوتا ہے لیکن اس کا کام صرف یہیں تک محدود ہے۔ علم کو رہنما بنا کر حقیقت کی منزل تک نہیں پہنچا جا سکتا کیوں کہ علم کی انتہا حیرانی اور بے تابی پر منتج ہوتی ہے۔ اس جگہ پر پہنچ کر عشق کی رہنمائی کام آتی ہے۔ منزل تک رسائی اسی کے ذریعہ سے ہو سکتی ہے جس مقام پر عقل حیران ہو کر رہ جاتی ہے، اس کے آگے عشق رہنما بنتا ہے اور منزل تک پہنچا دیتا ہے۔

''علامہ اقبالؒ کے نزدیک عشق محض اضطراری کیفیت، ہیجان جنسی، حواس باختہ از خود رفتگی، فنا آمادگی، یا محدود میں گم کر دینے کا نام نہیں ہے بلکہ ان کے یہاں عشق نام ہے ایک عالمگیر قوت حیات کا، جذبۂ عمل سے سرشاری کا، حصول مقصد کے لیے بے پناہ لگن کا، عزم و آرزو سے آراستہ جہدِ مسلسل کا۔''(۱۹)

''انتھروپالوجی کے ماہرین کے نزدیک کلچر کا سرچشمہ حیاتیاتی عمل کا وفور ہے۔ یہ تصور محدود ہے، علامہ اقبالؒ اس سے آگے بڑھتے ہیں۔ ان کے نزدیک اس کا سرچشمہ خُودی ہے جس کا ظہور و انکشاف عشق کے ذریعے ہوتا ہے، یہی عشق مقاصد آفرینی کرتا ہے۔ عشق کا دوسرا نام خونِ جگر اور جوش و جذبۂ حیات ہے۔''(۲۰)

''عقل زندگی کی راہ کو روشن کرتی ہے۔ ''یہ چراغ رہگزر ہے''، رہروِ زندگی کی آنکھیں اس سے روشن ہوتی ہیں لیکن منزل کی اس کو خبر نہیں، حقائق حیات سے یہ جاہل ہے؛ ''درونِ خانہ'' کے اسرار سے ناواقف۔''

عقل زندگی کی رہگزر پر انسان کے لیے روشنی فراہم کرتی ہے۔ اس نے سائنسی انکشافات انسان سے کرائے ہیں۔ تسخیر فطرت میں انسان کی رہنمائی کی ہے۔ انسان کی ظاہری زندگی کو بنانے، سنوارنے اور قاعدے میں لانے اور منظم کرنے میں تمام کارہائے نمایاں عقل نے انجام دیے ہیں۔

خرد سے راہرو روشن بصر ہے   خرد کیا ہے؟ چراغ رہ گزر ہے

درون خانہ ہنگامے ہیں کیا کیا   چراغ رہ گزر کو کیا خبر ہے

(۲۱)

''عشق ہی سے اسرار شہنشاہی کھلتے ہیں، آداب خُود آگاہی معلوم ہوتے ہیں۔ عشق کسی خطرہ کی پرواہ نہیں کرتا، اس کے جلال سے سلاطین کانپ اٹھتے ہیں، حریت و آزادی کا تسلط قائم ہو جاتا ہے۔ استبدادیت کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔''(۲۲)

عقل ہمیں زندگی کی راہ میں پیش آنے والی مشکلات کا حل سمجھاتی ہے لیکن جو شے عمل پر آمادہ کرتی ہے۔ وہ عشق اور ایمان ہیں عشق اور ایمان سے زیادہ طاقتور جذبہ دنیا میں کوئی نہیں ہے اور انسانی ارتقا کی منزلیں اسی جذبہ کے تحت سر ہوئی ہیں اور دنیا میں سارے کارنامے اسی جذبے کے معیار سے انجام دیے گئے ہیں۔ عقل ایک حد سے آگے نہیں دیکھ سکتی۔ یہ اسباب وعلل کے چکر میں ہی پھنسی رہتی ہے۔ اس سے آگے قدم بڑھانا عشق کا کام ہے۔ جسے چشم غیبی نصیب ہوتی ہے۔ اس کے بعد ایک ہی جست میں انسان اس زمان و مکاں کی حدود کو توڑ کر کہیں آگے نکل جاتا ہے۔

عشق کی اِک جَست نے طے کر دیا قصّہ تمام
اس زمیں و آسماں کو بے کراں سمجھا تھا میں

(کلیاتِ اقبال (اردو) ص:۳۱۰)

ڈاکٹر سیّد عبداللہ ''طیف اقبال'' میں لکھتے ہیں:

''اقبالؒ نے اس فطری جذبہ عشق کا تصور ایک اور زاویے سے دلایا ہے، صوفی کہتا ہے کہ نصب العین تک پہنچنے کے لیے خُودی کو مٹانا ضروری ہے ان کے نزدیک عشق کے کمال کی علامت یہ ہے کہ خود کو مٹا دیا جائے۔''(۲۳)

''یوں تو وہ بھی عشق کہلاتا ہے جو محض ''فساد خوردنِ گندم'' سے پیدا ہوتا ہے، جس کا عارضی نشہ یا آزاد، عالم شباب میں بڑا تیز ہوتا ہے اور ایک عشق وہ بھی ہے جو بذات خود ایک ''درد لا دوا'' ہونے کے باوجود تمام جسمانی اور رُوحانی بیماریوں کا علاج ہے اور جسے مولائے روم نے احتراماً یوں مخاطب کیا ہے:

''اے تو افلاطون و جالینوس ما''

''جس عشق کو آزاد کہا گیا ہے وہ محض وصال کا طلب گار ہوتا ہے اور جو ہر درد کی دوا ہے، وہ فراق سے بھی لذت اندوز ہوتا ہے۔''(۲۴)

ڈاکٹر یوسف حسین خان ''رُوحِ اقبال'' میں لکھتے ہیں:

''مولانا روم کے زمانے سے لے کر اب تک ہمارے شاعروں نے عشق کو عقل و علم کے حریف کے طور پر پیش کیا ہے، اقبالؔ نے بھی اس مضمون پر خامہ فرسائی کی اور اسے ایسا اپنایا ہے کہ وہ گویا اسی کا ہو گیا۔ وہ جذبات کی ترجمانی اس طرح کرتا ہے کہ علم و حکمت کا پس منظر بدستور باقی رہے اس لیے اس کے مطالب نہایت دقیق اور اشارے اور کنائے نہایت دُور رس ہوتے ہیں، اقبالؒ عشق کو عقل کے مقابلے میں فضیلت دیتا ہے۔'' (۲۵)

''عشق انسان کے اندر ایک ایسی بے پایاں قوت اور عزم پیدا کر دیتا ہے کہ وہ اس سے سرشار ہو کر تسخیر و تکمیل کے راستے پر گامزن رہتا ہے، یہ گنبد افلاک، یہ کوہ و صحرا، یہ بحر و بر سب اس کے دست اختیار میں ہیں۔'' (۲۶)

''عقل اور عشق دونوں کا منبع ذات الٰہ ہے۔ اقبالؒ اس موضوع پر روشنی ڈالتے ہیں کہ یہ دونوں قوتیں کس طرح ھم آہنگ ہوں اور ان کے مفید نتائج سامنے آسکیں۔ گویا اصل مسئلہ یہ ہے کہ عقل کو عشق کے ساتھ کس طرح ملایا جائے کیوں کہ عقل بے عشق ایک شیطانی قوت بن جاتی ہے، عقل کو مولانا روم نے بھی شیطان کہا ہے۔'' (۲۷)

''صوفیا کرام کے کلام میں بھی عشق کو برتر اور عقل و علم کو کمتر ظاہر کیا گیا ہے۔ حیات انسانی کے بعض مدارج و کیفیات میں عقل اور عشق دونوں ضروری ہیں۔ عام انسانوں کے لیے عقل کافی ہے مگر انسان کامل کے اندرونی ارتقا کے لیے عشق کی بڑی اہمیت ہے۔'' (۲۸)

اقبال نے اپنے کلام میں عشق کو عقل پر ترجیح دی۔ اقبال کے کلام میں سے ایسی بہت سے وجوہات ملتی ہیں جن کی بنیاد پر اقبال نے عشق کو صحیح اور عقل کو اس کی ضد کے طور پر ثابت کیا۔

مولانا عبدالسلام ندوی ''اقبال کامل'' میں رقم طراز ہیں:

''ڈاکٹر صاحب نے جن وجوہ کی بنا پر عقل کے مقابل عشق کو ترجیح دی ہے، (علامہ اقبال عقل و عشق کی آویزش میں عشق کا ساتھ دیتے ہیں) وہ حسب ذیل ہیں:

ا۔ عمل کی بنیاد عقیدہ کی وحدت و یک رنگی پر قائم ہے، اسلام نے صرف ایک کلمہ لا الٰہ الا اللّٰہ کی دعوت دی اور اسی عقیدہ کی وحدت اور یک رنگی نے صحابہ کرامؓ کو جوش عمل سے لبریز کر دیا لیکن عقلی نظریوں میں یہ وحدت و یک رنگی نہیں پائی جاتی بلکہ وہ ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں۔

زماں زماں شکند آنچہ می تراشد عقل
بیا کہ عشق مسلمان و عقل زناری است

(۲۹)

عقل عیار ہے سو بھیس بدل لیتی ہے
عشق بیچارہ نہ ملا ہے نہ زاہد نہ حکیم

اس لیے وہ انسان کی عملی طاقت کو کسی ایک مرکز پر جمع نہیں ہونے دیتی بلکہ اس کو منتشر رکھتی ہے۔

۲۔ اس وحدت و یک رنگی کے ساتھ عقیدہ کے لیے استحکام اور پختگی بھی ضروری ہے، جس کو شریعت کی اصطلاح میں ایمان و یقین کہتے ہیں اور یہی ایمان و یقین انسان کو آمادہ عمل کرتا ہے۔ لیکن ایک طرف تو عقلی نظریات کا یہ اختلاف انسان کے دل میں یقین و ایمان پیدا ہی نہیں ہونے دیتا بلکہ اس کو تلون و تذبذب اور شک میں مبتلا رکھتا ہے، دوسری طرف ان نظریات کو سیکڑوں دلائل سے ثابت کیا جاتا ہے اور انسان اگرچہ ان دلائل کی کثرت سے حیرت زدہ ہو جاتا ہے۔

علاج ضُعفِ یقیں ان سے ہو نہیں سکتا
غریب گرچہ ہیں رازی کے نکتہ ہائے دقیق

''بلکہ وہ ایک کشمکش میں مبتلا ہو جاتا ہے اور اس حالت میں بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ عقل ان دلائل سے انسان کی رہبری کرنا چاہتی ہے لیکن درحقیقت وہ راہ زنی کرتی ہے، یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب ان دلائل کو مکر و فریب اور حیلہ قرار دیتے ہیں۔'' (۳۱)

اقبال نے اپنے جذبے اور تعقل کو تابناک بنانے کے لیے جمالیاتی کیف پیدا کیا تاکہ کلام کی تاثیر میں اضافہ ہو۔ (۳۲)

۳۔ ایک طرف تو علم و یقیں کا یہ ضعف عقل کو عملی میدان میں ناکامیاب رکھتا ہے، دوسری طرف عملی زندگی میں جو خطرات و مہالک پیش آتے ہیں ان کے مقابلے کے لیے جس جراتؑ، استقامت اور جانبازی کی ضرورت ہوتی ہے، وہ عقل میں بہت کم پائی جاتی ہے، عشق آگ میں نہایت بے باکی کے ساتھ کود پڑتا ہے لیکن عقل دیکھ بھال میں رہ جاتی ہے۔ (۳۲)

کیوں کہ عشق خود ایک آگ ہے جو دل میں زندگی کی حرارت پیدا کر دیتا ہے اس لیے آگ کو آگ سے کیا خطرہ ہو سکتا ہے لیکن عقل میں زندگی کی یہ حرارت نہیں پائی جاتی اور ڈاکٹر صاحب نے ایک فرضی اور خیالی

حکایت میں اس نکتہ کو نہایت شاعرانہ انداز میں بیان کیا ہے:

شنیدم شبے در کتب خانۂ من　　　به پروانه می گفت کِرم کتابی
به اوراقِ سینا نشیمن گرفتم　　　بسے دیدم از نسخۂ فارابی

(۳۳)

”اس لیے اگر چہ عقل بھی بڑے بڑے میدان فتح کرنا چاہتی ہے لیکن جرأت و ہمت کی کمی سے وہ دفعتہً ان میدانوں کو فتح نہیں کرسکتی بلکہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہے۔“

(۳۴)

لیکن جرأت و ہمت کی کمی سے عقل جو کام برسوں میں کرسکتی ہے، اس کو عشق آن کی آن میں کرسکتا ہے۔ ڈاکٹر یوسف حسین خان رُوح اقبال میں رقمطراز ہیں:

”اقبال عشق کو عقل کے مقابلے میں فضیلت دیتا ہے، اس واسطے کہ اس سے حقائق اشیا کا مکمل علم اور بصیرت حاصل ہوتی ہے، پھر یہ کہ انسانی زندگی میں جتنا اس کا اثر ہے عقل کا اثر اس کا عشر عشیر بھی نہیں، زندگی کا ہنگامہ اسی سے ہے۔ اگر دل بھی عقل کی طرح فرزانہ ہوتا تو جینے کا لطف باقی نہ رہتا، فطرت کی بزم خموشاں میں عشق ہی سے ساری رونق ہے، بقول شاعر

عشق از فریاد ما ہنگامہ ہا تعمیر کرد!
ورنہ این بزم خموشاں ہیچ غوغائی نداشت

لطف یہ ہے کہ عشق کا لازمی نتیجہ بے تابی اور اضطراب ہے لیکن دل کو اسی میں مزہ ملتا ہے۔

این حرف نشاط آوری گویم وی رقصم
از عشق دل آسایدٔ با ایں ہمہ بےتابی (۳۵)

اقبالؒ نے تسلیم کیا ہے کہ عقل بھی انسان کو منزلِ مقصود کی طرف لے جاتی ہے اور عشق بھی۔ لیکن دونوں کے طریقوں میں فرق ہے۔ عقل مختلف حوالوں سے منزل طے کرتی ہے اور عشق اتنا پُرکشش ہے کہ وہ قافلہء حیات کو منزل کی طرف تیز گام لے جاتا ہے۔

ہر دو بمنزلی روان ہر دو امیرِ کاروان
عقل بحیلہ می بُرد، عشق بُرد کشان کشان (۳۶)

حواشی

۱۔ علامہ اقبال کا خصوصی مطالعہ، کورس کوڈ ۵۶۱۳ (اسلام آباد: علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، ۲۰۱۲ء) ص:۵۸
۲۔ علامہ اقبال کا خصوصی مطالعہ، کورس کوڈ ۵۶۱۳ (اسلام آباد: علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، ۲۰۱۲ء) ص:۵۸
۳۔ محمد اکرم سعید، پروفیسر، اقبال کا خصوصی مطالعہ (لاہور: عبداللہ برادرز، ۲۰۰۶ء) ص:۹۸
۴۔ عبدالسلام ندوی، مولانا، اقبال کامل (لاہور: الفیصل ناشران و تاجران کتب، فروری ۲۰۰۸ء) ص:۲۶۱، ۲۶۲
۵۔ عبدالسلام ندوی، مولانا، اقبال کامل (لاہور: الفیصل ناشران و تاجران کتب، فروری ۲۰۰۸ء) ص: ۲۶۳
۶۔ عبدالسلام ندوی، مولانا، اقبال کامل (لاہور: الفیصل ناشران و تاجران کتب، فروری ۲۰۰۸ء) ص: ۲۶۴، ۲۶۵
۷۔ عبدالسلام ندوی، مولانا، اقبال کامل (لاہور: الفیصل ناشران و تاجران کتب، فروری ۲۰۰۸ء) ص:۲۶۵، ۲۶۶
۸۔ غلام عمر خان، ڈاکٹر، اقبال کا تصورِ عشق (حیدر آباد (دکن) ادارہ ادبیات اردو، ن۔د) ص:۱۰
۹۔ غلام عمر خان، ڈاکٹر، اقبال کا تصورِ عشق (حیدر آباد (دکن) ادارہ ادبیات اردو، ن۔د) ص:۱۹
۱۰۔ غلام عمر خان، ڈاکٹر، اقبال کا تصورِ عشق (حیدر آباد (دکن) ادارہ ادبیات اردو، ن۔د) ص:۲۱
۱۱۔ علامہ اقبال کے بنیادی افکار و نظریات، کوڈ ۲۰۲۷ (اسلام آباد: علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، ۲۰۰۴ء) ص:۵۰
۱۲۔ اقبال: کلیات اقبال اردو (لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۷۵ء) ص:۳۸۶، ۳۸۷
۱۳۔ خالدہ جمیل، مباحث اقبال (لاہور: اپنا ادارہ، ۲۰۰۴ء) ص:۹۷
۱۴۔ عبدالحکیم، خلیفہ، ڈاکٹر، فکر اقبال (لاہور: بزم اقبال، ۲ کلب روڈ، اپریل، ۲۰۱۳ء) ص:۲۵۷
۱۵۔ انُور سدید، ڈاکٹر، اقبال شناسی اور اوراق (لاہور: بزم اقبال، ۲ کلب روڈ، ۱۹۸۹ء) ص:۱۱
۱۶۔ جاوید اقبال، ڈاکٹر، افکار اقبال (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء) ص:۳۵
۱۷۔ منیر احمد یزدانی، پروفیسر، فوز اقبال (میرپور: گوشہ تحقیق علامہ اقبالؒ، ۲۰۱۴ء) ص:۸۰

۱۸۔فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اقبال سب کے لیے (لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء) ص: ۲۶۱

۱۹۔فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اقبال سب کے لیے (لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء) ص: ۲۸۷

۲۰۔عبداللہ، سیّد، ڈاکٹر، مطالعہ اقبال کے چند نئے رخ (لاہور: بزمِ اقبال، ۲ کلب روڈ، ۱۹۹۹ء) ص: ۱۵۹

۲۱۔مرتبین، رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر، محمد سہیل عمر، وحید عشرت، ڈاکٹر (اقبالیات کے سو سال) (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۱۲ء) ص: ۵۸۳

۲۲۔ایضاً، ص: ۵۸۳

۲۳۔عبداللہ، سیّد، ڈاکٹر، طیف اقبال، مرتبہ ممتاز منگلوری، ڈاکٹر (لاہور: لاہور اکیڈمی، ۲۰۰۹ء) ص: ۳۷، ۴۷

۲۴۔افتخار احمد صدیقی، ڈاکٹر، فروغ اقبال (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۹۶ء) ص: ۵۱۹

۲۵۔یوسف حسین خان، ڈاکٹر، رُوحِ اقبال (لاہور: القمر انٹر پرائزز، مارچ ۲۰۱۰ء) ص: ۵۴

۲۶۔عبدالشکور احسن، ڈاکٹر، اقبال کی فارسی شاعری کا تنقیدی جائزہ (لاہور: اقبال اکادمی، ۲۰۰۰ء) ص: ۲۴۰

۲۷۔این میری شمل، ڈاکٹر، شہپرِ جبریل، مترجم محمد ریاض، ڈاکٹر (لاہور: گلوب پبلشرز، ۱۹۸۵ء) ص: ۱۷۱، ۱۷۲

۲۸۔عزیز احمد، اقبال نئی تشکیل (لاہور: گلوب پبلشرز، ن۔د) ص: ۲۸۴

۲۹۔عبدالسلام ندوی، مولانا، اقبال کامل (لاہور: الفیصل ناشران وتاجران کتب، فروری ۲۰۰۸ء) ص: ۲۶۶

۳۰۔عبدالسلام ندوی، مولانا، اقبال کامل (لاہور: الفیصل ناشران وتاجران کتب، فروری ۲۰۰۸ء) ص: ۲۶۷

۳۱۔عبدالسلام ندوی، مولانا، اقبال کامل (لاہور: الفیصل ناشران وتاجران کتب، فروری ۲۰۰۸ء) ص: ۲۶۷

۳۲۔یوسف حسین خان، ڈاکٹر، حافظ اور اقبال (نئی دہلی: غالب اکیڈمی، ن، د) ص: ۱۴۲

۳۳۔عبدالسلام ندوی، مولانا، اقبال کامل (لاہور: الفیصل ناشران وتاجران کتب، فروری ۲۰۰۸ء) ص: ۲۶۸

۳۴۔عبدالسلام ندوی، مولانا، اقبال کامل (لاہور: الفیصل ناشران وتاجران کتب، فروری ۲۰۰۸ء) ص: ۲۶۸

۳۵۔یوسف حسین خان، ڈاکٹر، رُوحِ اقبال (لاہور: القمر انٹر پرائزز، مارچ ۲۰۱۰ء) ص: ۵۴، ۵۵

۳۶۔رابعہ سرفراز، اقبال آثار (فیصل آباد: بابا قائم سائیں پرنٹرز، ۹ نومبر ۲۰۰۳ء) ص: ۱۲۰

علامہ اقبالؒ اور تصوّف

تصوّف کے معنی تزکیہ نفس کا طریقہ، دل کی خواہشوں کو دور کر کے اللہ عزوجل کی طرف متوجہ ہونا ہے۔علامہ اقبالؒ اپنے عہد کے بے مثال مفکرِ ملّت، دانائے راز، محقق اور فلسفی تھے۔ان اُوصاف کے ساتھ ساتھ وہ شاعری میں یدِطولیٰ رکھتے تھے۔کسی خاص فرقے یا مسلک سے کوئی وابستگی نہ تھی۔فقط محمد ﷺ کا اُمتی ہونے پر ناز وفخر تھا۔حضور ﷺ کے اُسوہ حسنہ پر خُود عمل پیرا تھے اور اسی اسلامی نظام حیات کے بہت بڑے داعی تھے۔

اگر علامہ اقبالؒ کی زیست کا بنظرِ غائر مطالعہ کیا جائے تو یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ آپ کی ذات ذہنی وفکری ارتقا کے مختلف مدارج سے گزری اور وقت کے ساتھ ساتھ فہم وفراست، غور وفکر اور تحقیق وجستجو کے نئے اور روشن دَر وا ہوتے گئے اور معرفت نفس کے بعد معرفت الٰہی تک رسائی پائی۔آپ کا موروثی مسلک وحدت الوجود تھا۔آپ کے آباواجداد اسی سلسلے کے پیروکار تھے۔

''اقبالؒ کی ابتدائی تعلیم وتربیت جس ماحول میں ہوئی تھی اس کا تقاضا یہ تھا کہ تصوّف اور دینی مسائل سے انھیں گہری دلچسپی پیدا ہو جاتی، یہی ہوا، اقبالؒ میں اسلام کی محبت شروع ہی سے ایسی رچ بس گئی کہ عمر وعلم کے اضافے کے ساتھ اس میں پختگی اور شدت پیدا ہوتی گئی، حتیٰ کہ ان کی شخصیت رفتہ رفتہ ایک عظیم اسلامی مفکر میں ڈھل گئی۔''(۱)

چناں چہ تصوّف سے متاثر ہونے اور اس کی رُوحانی منزلوں کے قائل ہونے کا باوصف، اُنھوں نے ایسے تصوّف کے خلاف آواز بلند کی جو شریعت کی نفی کرتا ہو یا جس سے قرآن ورسالت کے دیے ہوئے اُصولوں پر ضرب پڑتی ہو۔بات یہ تھی کہ انھیں قرآن پاک اور آنحضرت ﷺ کی ذات مبارک سی ایسی والہانہ وابستگی

تھی کہ وہ زندگی کے مسائل پر غور و فکر کرتے وقت کسی ایسی بات کی تائید نہ کر سکتے تھے جس سے توحید و رسالت کے عقیدے سے انحراف کی صورت پیدا ہوتی ہو، انھوں نے اپنی پوری شاعری اور فکر کے بارے میں دعویٰ کیا ہے کہ وہ قرآن و سنت کے نظریات کے عین مطابق ہے۔ ایک جگہ یہاں تک کہہ دیا ہے کہ اگر اس میں ذرہ برابر جھوٹ ہو تو قیامت کے روز انھیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شفاعت نصیب نہ ہو، ان کے مطالعے میں سب سے زیادہ رہنے والا صحیفہ قرآن پاک تھا، دوسری ساری کتابیں ثانوی حیثیت رکھتی تھیں، قرآن پاک کی تلاوت وہ یہ سمجھ کر کرتے تھے گویا وہ انھیں پر نازل ہوا ہے، اکثر یہ ہوتا کہ تلاوت کرتے کرتے اشک رواں ہو جاتے اور رقت کی سی کیفیت طاری ہو جاتی۔'' (۲)

''جنید بغدادی کے مطابق تصوّف ایک ایسی نعمت ہے جس پر بندہ قائم ہے۔ تصوّف یہ ہے کہ بغیر علائق کے خُدا سے قربت حاصل ہو، تصوّف ذکر ہے پھر وَجد ہے پھر نہ یہ ہے نہ وہ ہے۔'' (۳)

ڈھونڈتی ہیں جس کو آنکھیں وہ تماشا چاہیے
چشم باطن جس سے کھل جائے وہ جلوا چاہیے

(کلیات اقبال، بانگ درا، صفحہ نمبر ۴۸)

ابو ریحان البیرونی (م ۴۴۰ھ۔ ۱۰۴۸ء) اپنی تصنیف کتاب الہند میں لکھتے ہیں:

''تصوّف کا لفظ اصل میں 'سین' سے تھا، اور اس کا مادہ ''سوف'' تھا، جس کے یونانی زبان میں ''حکمت'' کے ہیں، دوسری صدی ہجری میں جب یونانی کتابوں کا ترجمہ ہوا تو یہ لفظ عربی زبان میں آیا۔ چوں کہ حضرات صوفیا میں اشراقی حکما کا انداز پایا جاتا تھا، اس لیے لوگوں نے ان کو صوفی یعنی ''حکیم'' کہنا شروع کیا، رفتہ رفتہ ''سوفی'' سے ''صوفی'' ہو گیا۔'' (۴)

علامہ اقبالؒ کی نشو و نما خالص صوفیانہ ماحول میں ہوئی تھی، اس لیے قدرتی طور پر ان کو تصوّف اور عرفان سے مناسبت پیدا ہو گئی تھی، اس صوفیانہ ماحول کی طرف اشارہ کرتے ہوئے وہ ضرب کلیم میں ایک جگہ اپنے فرزند عزیز جاوید اقبال سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں:

غارت گر دین ہے یہ زمانہ — ہے اس کی نہاد کافرانہ
دربارِ شہنشہی سے خوشتر — مردانِ خُدا کا آستانہ!

(۵)

علامہ اقبالؒ کے نزدیک اسلامی تصوّف دل میں قوت پیدا کرتا ہے اور پستی و دُون ہمتی کو دور کرتا

ہے، اسلامی تصوّف کا مقصد انسان کا صفات الٰہیہ سے متصف ہو کر زیادہ سے زیادہ اپنی شان یکتائی کو نمودار کرنا ہے۔ علامہ اقبالؒ اسلامی تصوّف کے متعلق لکھتے ہیں:

''میرے خیال میں یہ ثابت کیا جا سکتا ہے کہ قرآن و احادیث صحیحہ میں صوفیانہ نظر کی طرف اشارات موجود تھے لیکن وہ عربوں کی خاص عملی ذہانت کی وجہ سے نشو و نما پا کر بار آور نہ ہو سکے، جب ان کو ممالک غیر میں موزوں حالات میسر آ گئے تو وہ ایک جداگانہ نظریہ کی صورت میں جلوہ گر ہوئے۔'' (۶)

"علامہ اقبالؒ کی شاعری میں جس صوفیانہ مسلک کے آثار ملتے ہیں، وہ رسمی یا رائج تصوّف نہیں، اس کی بنیاد خالص اسلامی تصوّف اور اسلام کی حرکی رُوح (Dynamic Spirit) پر ہے۔ چناں چہ اقبالؒ کا سارا کلام اسی Dynamic Spirit کی تشریح اور تفسیر ہے، اور یہی اقبالؒ کے تصوّف کا امتیازی نشان ہے، اس مسلک میں اقبالؒ نے ان صوفیا سے اکتساب فیض بھی کیا ہے، جو زندگی کے اس مثبت نظریہ کے علمبردار ہیں اور خود بھی اپنے حکیمانہ نظریات سے اس نظریہ کو تقویت دی اور پروان چڑھایا۔'' (۷)

"تصوّف کے ساتھ علامہ اقبالؒ کے تعلق کے بارے میں بنیادی بات یہ ہے کہ وہ اس حقیقی اسلامی تصوّف کے پرجوش حامی تھے جس نے فرد اور ملّت کی توانائی کو باقی رکھا مگر عجمی اثرات کے حامل غیر اسلامی تصوّف کے خلاف انھوں نے اپنا پورا زور بیان صرف کیا ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ تصوّف ملّت اسلامیہ کے درد کا درمان بنے، صاحبان تصوّف صاحبان خُودی و عشق ہوں اور ان کی دل و نگاہ دونوں سے اسلامی جلال و جمال ٹپک رہا ہو، ''تصوّف'' کے عنوان سے ضرب کلیم میں انھوں نے لکھا۔'' (۸)

یہ حکمتِ ملکوتی، یہ علم لاہوتی — حرم کے درد کا درماں نہیں تو کچھ بھی نہیں
یہ ذکر نیم شبی، یہ مراقبے، یہ سرور — تیری خُودی کے نگہبان نہیں تو کچھ بھی نہیں

(کلیات اقبال (اُردو) ضرب کلیم، صفحہ نمبر ۴۹۶)

علامہ اقبال قرآنی تصوّف کو بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، بلکہ یوں کیوں نہ کہوں کہ وہ سچے تصوّف (واردات باطنی یا شعور ۲۔ ولایت) میں گہرا اعتقاد رکھتے تھے۔ انھوں نے صوفیانہ ادب سے خاصا استفادہ کیا۔ شبستری کی ''گلشن راز'' کا جواب لکھا، یہاں تک کہ ایک جلیل القدر صوفی رومی ہی کو اپنا رُوحانی پیشوا تسلیم کیا اور ایک نامور صوفی حسین بن منصور حلاّج کو ''جاوید نامہ'' میں بڑا رتبہ عطا کیا۔ بعض صوفی اکابر اور ان کی ارادات رُوحانی سے استناد بھی کیا اور ان کی صداقت کو تسلیم کیا۔'' (۹)

علامہ اقبالؒ تصوّف کے ان پہلوؤں کو پسند کرتے ہیں۔ اقبالؒ نئے مسلم معاشرے میں تصوّف کو فروغ حاصل

کرتے دیکھنا چاہتے تھے جو خصوصیات شعور نبوت سے مزین ہو:

ا۔''جو قرآنی تصور توحید پر ایمان رکھے اور اس اصول پر قائم رہے کہ توحید کی ضد کثرت نہیں بلکہ شرک ہے۔

۲۔ جو احکام شریعت کا پابند ہو۔

۳۔ جو وصال کے بجائے فراق اور فنا کے بجائے بقا کی تحصیل کے لیے کوشاں رہے۔

۴۔ جس کا عشق خلاق اور فعال ہو۔

۵۔ جو انسان کو صاحب اختیار سمجھے۔

۶۔ جو موجودہ کی حقیقت کو تسلیم کرے اور اس کی اصلاح جاری رکھے۔

۷۔ جو صحو اور مسلسل بیداری کی کیفیت طاری کرے۔

۸۔ جو خلوت یا خانقاہ نشینی اور رہبانیت کا مخالف ہو۔

علامہ اقبالؒ چاہتے تھے کہ روایتی درویشی کا رنگ بدل جائے۔ وہ آج کے درویش کو سکون پرست ہونے کے بجائے سخت کوش دیکھنا چاہتے تھے،

علامہ اقبالؒ چاہتے تھے کہ درویش صرف خلوت گزیں نہ ہو بلکہ خارجی اور باطنی فطرت کا رمز آشنا اور فکر ونظر میں انقلاب پیدا کرنے والا ہو یعنی وہ مشاہدۂ فطرت بھی کرے اور اصلاح ملّت بھی۔''(۱۰)

علامہ اقبالؒ تصوّف کے ان پہلوؤں کو سخت ناپسند کرتے تھے۔

ا۔''جو انسانوں سے قطع تعلق کر کے خلوت نشینی کی تلقین کرے۔ زندگی اور فطرت کو غیر حقیقی سمجھے اور حیات سے فرار کی راہ اختیار کرے۔

۲۔ جو سُکر، محویت اور بےخُودی کی کیفیات طاری کرے۔

۳۔ جس کا نصب العین وصال یا فنا ہو اور جو حیات افزائی کے بجائے حیات سوزی کی طرف لے جائے۔

۴۔ جو احکام شریعت کو ثانوی حیثیت دے۔

۵۔ جو موجودات اور نفس انسانی کو باطل قرار دے۔

۶۔ جو جبر کا قائل ہو، خیر وشر کا امتیاز مٹا کر انسان کو اخلاقی تعطیل دے دے۔

۷۔ جو کفر اور ایمان کا فرق مٹا دے۔

۸۔ جو سکوں پرستی اور قناعت کوشی کی تلقین کرے۔''(۱۱)

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم''فکر اقبال''میں لکھتے ہیں:

''اقبالؒ خانقاہی تصوّف کا مخالف ہے لیکن حافظ کا تصوّف تو خانقاہی بھی نہیں اور وہ اقبالؒ کی طرح فقیہ اور خانقاہی صوفی دونوں کا مخالف ہے اگرچہ وجہ اختلاف مختلف ہے۔ بہر حال اقبالؒ اپنی شاعری سے جو انقلاب پیدا کرنا چاہتا تھا اور جس اصلاح کوشی کا طالب تھا وہ بات حافظ میں نہیں ملتی اور جو کچھ وہاں ملتا ہے وہ اقبالؒ کے نظریۂ حیات کے خلاف پڑتا ہے۔''(۱۲)

''اسلام رہبانیت اور خانقاہ نشینی کا مخالف ہے، اقبالؒ صوفیائے کبار کے ساتھ عقیدت رکھتا ہے لیکن جہاں کہیں اس کو ان کے فکر ونظر کا کوئی پہلو غیر اسلامی اور منافی حیات دکھائی دیتا ہے وہاں بے باکانہ مخالفت بھی کرتا ہے۔۔۔۔۔۔ اقبالؒ نے ماضی کے تصوّف پر بھی تنقید کی ہے اور زمانۂ حال کے پیشہ ور مدعیان طریقت کا بھی پول کھولا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نہ نکالنا چاہیے کہ وہ اس کا قائل ہے کہ تصوّف نے اسلام کی کچھ خدمت نہیں کی۔''(۱۳)

''اقبالؒ عجمی اسلام اور تصوّف کی جگہ اصل عربی اسلام اور تصوّف جاگزین کرنا چاہتے تھے۔''(۱۴)

دمِ عارف، نسیمِ صبح دم ہے — اسی سے ریشۂ معنی میں نم ہے
اگر کوئی شعیب آئے میسر — شبانی سے کلیمی دو قدم ہے

(کلیاتِ اقبال (اُردو)، رباعیات، ص:۳۸۰)

پروفیسر ڈاکٹر این میری شمل کی تصنیف''شہپر جبریل''مترجم ڈاکٹر محمد ریاض رقم طراز ہیں:

''اقبال اس تصوّف کے مخالف ہیں جو مثلاً شعر حافظ سے ہویدا ہے البتہ رومیؔ سے وہ غیر معمولی ارادت کا اظہار کرتے ہیں کیوں کہ وہ عجمی تصوّف کے''ترکِ خُودی'' کے تصور کے خلاف رہے ہیں البتہ رومیؔ جہاں وحدت الوجودی پرواز دکھاتے ہیں۔ وہاں اقبالؒ ان کا ساتھ نہیں دیتے اس خواب سے رومیؔ، اقبالؒ کے رُوحانی پیرو مرشد قرار پاتے ہیں اور اقبالؒ کی ان سے ارادت آخری نفس تک برقرار رہتی ہے۔''(۱۵)

تصوّف دراصل آرزو مند رُوح کا حضورِ خُداوند پہنچنے کا ایک وسیلہ ہے، یہ حقیقت منتظر اور محبوبِ واقعی کو قلب میں تلاش کرنے کا نام ہے۔ بیرن فان ہیگل کے بقول یہ مابعد الطبیعاتی''تشنگی''ہے۔ صوفی وہ نہیں جو غیر متداول دعاؤں اور عبادت کا دلدادہ ہو، صوفی وہ ہے جو یہ تشنگی محسوس کرتا ہو۔ وہ خالقِ حقیقی کا طالب ہے اور اس کا مطلوب بھی۔''(۱۶)

علامہ اقبالؒ، سیّد سلیمان ندوی کے نام ایک مکتوب میں رقم طراز ہیں:

''جو کام آپ کر رہے ہیں جہاد فی سبیل اللہ ہے، اللہ اور اس کے رسول ﷺ آپ کو اس کا اجر عطا

فرمائیں گے۔ اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ تصوّفِ وجُودی سرزمینِ اسلام میں ایک اجنبی پودا ہے جس نے عجمیوں کی دماغی آب وہوا میں پرورش پائی ہے۔'' (۱۷)

''علامہ اقبالؒ نے خود اپنی نامکمل تصنیف ''تاریخ تصوّف'' مرتبہ پروفیسر ڈاکٹر صابر کلوروی، میں لفظ صوفی کی ابتدا اور اہل تصوّف کی اصطلاح کے رائج ہونے کے سلسلہ میں وضاحت کی ہے اور مختلف صوفیائے کرام کے عقائد کو زیر بحث لا کر آخر میں یہی ثابت کیا ہے کہ اگرچہ ابتدا میں اہل تصوّف کی اصطلاح زاہد و عابد لوگوں کے لیے مخصوص تھی لیکن بعد میں یہ دین اسلام میں ایک بدعت کی شکل اختیار کر گئی۔'' (۱۸)

''کوئی مسلمان ہے جو لوگوں کو برا سمجھے جن کا نصب العین محبت رسول ﷺ ہے اور جو اس ذریعہ سے ذات باری سے تعلق پیدا کر کے اپنے اور دوسروں کے ایمان کی پختگی کا باعث ہوتے ہیں اگر میں تمام صوفیا کا مخالف ہوتا تو مثنوی میں ان کی حکایات ومقولات سے استدلال نہ کرتا۔'' (۱۹)

علامہ اقبالؒ کی زندگی کا جائزہ لیا جائے تو اول تا آخر بزرگان دین اور صوفیائے کرام سے ان کی عقیدت قدم قدم پر ملے گی۔ مولانا روم کو علامہ اقبالؒ اپنا پیرومرشد مانتے ہیں جو شخص صوفیائے کرام کا ذکر محبت و احترام سے کرے اور بزرگان دین کی درگاہوں پر ذوق وشوق سے حاضری دے اس کو ہم تصوّف کا مخالف کیسے کہہ سکتے ہیں۔

''تصوّف دراصل مختلف تہذیبوں کے انحطاط کے وقت ان میں ظہور پذیر ہوتی رہی ہے یعنی نفی ذات کا نظریہ یا اپنی ہستی کو بے مایہ سمجھنا دراصل یہ عقیدہ تو غلام اور پست ہمت قوموں کا اخلاقی عقیدہ رہا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے ثابت کیا ہے کہ ایسے ہی حالات میں مختلف قوموں میں تصوّف کی تحریک جنم لے کر قوموں کو بےعمل اور کمزور بنا کر ترکِ دنیا پر مجبور کرتی رہی۔'' (۲۰)

نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسمِ شبیری
کہ فقرِ خانقاہی ہے فقط اندوہ و دلگیری
(۲۱)

علامہ اقبالؒ کے نظریہ تصوّف پر صوفی غلام مصطفیٰ تبسم لکھتے ہیں:

''اقبال کا اندازِ فکر اس تصوّف سے بالکل مختلف ہے جو صدیوں سے دنیائے اسلام میں مروج رہا ہے جو بدقسمتی سے بڑی حد تک مسلمانوں میں جمود پیدا کرنے کا باعث بنا رہا، جن لوگوں نے اس تصوّف جمالی کو اپنا مسلک اور دین بنا لیا ان کے لیے مادی ماحول کے تکلیف دہ عناصر سے مصروف پیکار ہونا ناممکن ہے۔ ان کو

اس محویت میں وہ لطف حاصل ہوتا ہے کہ وہ وہیں کے ہو رہتے ہیں۔ علامہ اقبالؒ کا نظریہ تصوّف انھیں جھنجوڑتا ہے اور خواب سے بیدار کرتا ہے۔'' (۲۲)

علامہ اقبالؒ نے ڈاکٹر نکلسن کو ایک خط میں لکھا تھا کہ:

"I claim that the philosphy of the Asrar is a direct development out of the experience and speculation of old Muslim sufis and thinkers." (23)

ڈاکٹر سیّد عبداللہ ''طیف اقبال'' میں لکھتے ہیں:

''اقبال عملی تصوّف کے اس حصے کے منکر نہیں جس کا تعلق پاکیزگی، طہارت، حلال روزی کمانے، ریاکاری سے بچنے، کامل رہنما کی اطاعت اور ان عبادتوں سے ہے جن کا ثبوت آنحضرت ﷺ کے عمل اور قرآن سے ملتا ہے، اقبالؒ بھی انھیں تزکیۂ رُوحانی کا ذریعہ قرار دیتے ہیں اور خارجی ریاضتوں کو بامعنی بنانے کے لیے ضروری سمجھتے ہیں۔۔۔۔۔۔ اقبالؒ ان صوفیوں کے خلاف تھے جن کی تعلیم، افکار اور عمل، حیات کش اور عمل کی زندگی سے گریز سکھانے والی اور بےعملی کی تلقین کرنے والی ہے۔'' (۲۴)

اے مردِ خُدا! تجھ کو وہ قوت نہیں حاصل — جا بیٹھ کسی غار میں اللہ کو کر یاد
مسکینی و محکومی و نومیدیِ جاوید — جس کا یہ تصوّف ہو وہ اسلام کر ایجاد

(کلیاتِ اقبال (اردو) ہندی اسلام، صفحہ نمبر ۴۹۷)

شیخ شہاب الدین سہروردی صوفیہ میں پائے جانے والے بلکہ تصوّف کی لازمی شرط، فقر کے بارے میں رقمطراز ہیں:

ترجمہ: فقر ان (صوفیہ) کی صفتِ ذاتی بن جاتی ہے ان کے پاس متاعِ دنیوی میں سے کچھ ہو یا نہ ہو مگر اس صفت میں کوئی تغیر رونما نہیں ہوتا۔'' (۲۵)

پروفیسر ڈاکٹر خالد اقبال یاسر اپنی کتاب ''جدید تحریکات اور اقبال'' میں لکھتے ہیں:

''(اقبالؒ نے) ابتدا میں گھر پر انھوں نے ''فصوص الحکم'' اور ''فتوت مکیہ'' کے درسوں میں شرکت کی، ان کے والد ایک صوفی بزرگ تھے جن کا ایک وجدانی قصہ عطیہ بیگم نے بیان کیا ہے جس کے مطابق انھیں خواب میں کابل سے آنے والے ایک قافلے میں کسی بیمار شخص کے بارے میں معلوم ہوا اور وہ شہر سے دور قافلے

کے پڑاؤ میں اس کا علاج کرنے گئے۔'' (۲۶)

''علامہ اقبالؒ نے جس ماحول میں پرورش پائی، اس پر تصوّف کے اثرات غالب تھے۔'' (۲۷)

ماہنامہ ''ضیائے حرم'' کے اپریل ۱۹۷۵ء کے ایک شمارے میں سیّد نُور احمد شاہ قادری نے اپنے مضمون میں اعوان شریف میں اپنے والد کی معیت میں قاضی سلطان محمود کی خدمت میں حاضری اور سلسلہ قادریہ میں اقبالؒ کی بیعت کا ذکر کیا ہے۔'' (۲۸)

شاہ سلیمان پھلواری کے نام ۹ مارچ ۱۹۱۶ء کے ایک خط میں اقبالؒ نے خود بتایا:

''حقیقی اسلامی تصوّف کا میں کیونکر مخالف ہو سکتا ہوں کہ میں خود سلسلۂ عالیہ قادریہ سے تعلق رکھتا ہوں۔'' (۲۹)

"اقبال کو صوفیہ کے زہد و تقویٰ سے نہیں بلکہ غلوفی الزہد پر اعتراض رہا جس سے تصوّف ایک ایسا نظام تمدن بن گیا تھا جس کی ناتوانی میں مسلمانوں کے لیے بے جا کشش پائی جاتی ہے۔ وحدت الوجود کا نظریہ نو فلاطونیت کے ذریعے اسلام میں داخل ہوا تھا، اس لیے اقبالؒ نے یونانی فلسفہ افلاطون پر بھی طنز و تعریض کی اور اسے گوسفندِ قدیم کا لقب دیا۔'' (۳۰)

مولانا روم تصوّف اور صوفیہ کے متعلق کہتے ہیں کہ:

''صوفی توکل پر زور دیتا ہے لیکن توکل کا یہ مطلب نہیں کہ انسان جد وجہد ترک کر دے۔'' (۳۱)

"اقبالؒ تصوّف کو غیر اسلامی عناصر سے پاک کر کے اسلام کی رُوح پرور ارتقا پسند تعلیم کو اجاگر کرنا چاہتا ہے۔'' (۳۲)

"اقبالؒ اسلام کے بڑے معتقد ہیں لیکن دوسرے مذاہب سے کوئی عداوت نہیں ہے۔ مذہب یا عقائد کے لحاظ سے وہ کسی کے دوست ہیں نہ دشمن، عقائد میں وہ صوفی اور نظامِ معاشرت میں مسلمان۔'' (۳۳)

''شیخ الاسلام ذکریا انصاری کے الفاظ میں تصوّف وہ علم ہے جس سے نفس پاک اور اخلاق صاف ہو جاتے ہیں۔ امام غزالیؒ کے نزدیک تصوّف اس علم کو کہتے ہیں جس سے اخلاق حمیدہ کی قسمیں اور انھیں پانے کا طریقہ معلوم ہوتا ہے اور اس کے ساتھ اخلاق رذیلہ کی صورتیں اور اس سے بچاؤ کی ترکیبوں کا پتا چلتا ہے، صوفیا کے مطابق ان گناہوں کی دس صورتیں ہیں:

۱۔ خُدا کو ایک سمجھتے ہوئے غیر کی عبادت ۲۔ انسانی جان کا اِتلاف

۳۔ باپ بیٹے کا تضاد ۴۔ سچائی سے انحراف

۵۔ بے سہارا انسانوں پر ظلم ۶۔ روپے کی ناجائز افزائش

۷۔ جنسی بے راہ روی ۸۔ گھرانوں کے اندر جذباتی غیرت کا ارتکاب

۹۔ علم کا ناجائز استعمال ۱۰۔ جہاد سے فرار

اس فہرست سے یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں کہ آربری تصوّف کو غلط طور پر ترکِ دنیا کے اصولوں پر اُستوار عیسائی رہبانیت سے ملا دیتا ہے، صوفی طریقت اور شریعت کو متضاد خیال نہیں کرتا بلکہ دونوں کو ساتھ لے کر چلنے کا قائل ہوتا ہے۔'' (۳۴)

حضرت مجدد الف ثانیؒ فرماتے ہیں

''تصوّف شعارِ حقہ اسلامیہ میں خلوص پیدا کرنے کا نام ہے۔ اسلامی اقوام کی تاریخ میں ایسے بزرگ ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں پیدا ہوئے اور ہوتے رہیں گے جن کی زندگی کا نصب العین یہی خلوص رہا ہے۔ ان کی زندگیاں عام مسلمانوں کے لیے نشانِ راہ کا کام دیتی رہی ہیں اور یہ سلسلہ ابدالآباد تک جاری رہے گا۔'' (۳۵)

صوفیا نے اسلام کی جو تفسیر کی ہے اس کی غیر معمولی قوت کی توجیہ اسی وقت ممکن ہے جب کہ تصوّف کی جامع اور محیط تشکیل پر غور کیا جائے، سامی قوم کے ہاں نجات کا جو اصول تھا اس کو مختصراً ان الفاظ میں بیان کر سکتے ہیں۔

''اپنے ارادے کو متبدل کر دو۔'' جس کے یہ معنی ہیں کہ سامی قوم ارادہ کو رُوحِ انسانی کا جوہر خیال کرتی تھی، اس کے برخلاف ہندی ویدانتی یہ تعلیم دیتا ہے کہ آلام کی وجہ یہ ہے کہ ہم کائنات کے متعلق غلط نقطہ نظر اختیار کرتے ہیں۔'' (۳۶)

کمال وحدت عیاں ہے ایسا کہ نوکِ نشتر سے تو چھیڑے
یقین ہے مجھ کو گرے رگِ گل سے قطرہ، انسان کے لہو کا

(کلیات اقبال (اُردو)،ص: ۱۳۷)

پروفیسر ڈاکٹر این میری شمل ''شہپر جبریل'' میں بیان کرتی ہیں:

''تصوّف کے سلسلے میں اقبال کی اہم بات یہی ہے، وہ کوئی نیا نظام فکر نہیں بناتے کہ انسان کو متعدد پاؤں والی کسی رُوحانی سیڑھی پر سوار کریں اور اس کی زندگی کو غیر متوازن بنائیں، وہ فکر و نظر کی تطہیر کی خاطر کوئی ایسا نظام وضع نہیں کرتے جو انسانی خُودی کو نابود کر دے، خواہ یہ نابودی جلوہ ایزدی یا حیاتِ ایزدی کے تابع ہی

ہو۔ وہ دراصل طلب خُدا کی خاطر دل کو زندہ تر اور توانا تر بنانا چاہتے ہیں تا کہ ازلی و ابدی زندگی سے ربط و ضبط پیدا کر کے بھی انسان کی جداگانہ حیثیت برقرار اور قائم رہے۔ (۳۷)

علامہ اقبالؒ ایسے تصوّف کے قائل ہیں جو اسلامی شریعت سے بھرپور ہم آہنگ ہو۔

حواشی

۱۔فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اقبال سب کے لیے (لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء) ص: ۵۷

۲۔فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اقبال سب کے لیے (لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء) ص: ۵۷

۳۔خالدہ جمیل، مباحث اقبال (لاہور: اپنا ادارہ، ۲۰۰۴ء) ص: ۱۱۵

۴۔ابوسعید نُورالدین، ڈاکٹر، اسلامی تصوّف اور اقبال (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۹۵ء) ص: ۳۵، ۳۶

۵۔ابوسعید نُورالدین، ڈاکٹر، اسلامی تصوّف اور اقبال (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۹۵ء) ص: ۲۲۱

۶۔ابوسعید نُورالدین، ڈاکٹر، اسلامی تصوّف اور اقبال (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۹۵ء) ص: ۲۲۴

۷۔ابوسعید نُورالدین، ڈاکٹر، اسلامی تصوّف اور اقبال (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۹۵ء) ص: ۲۳۳، ۲۳۴

۸۔علامہ اقبال کے بنیادی افکار و نظریات، کوڈ، ۲۰۷ (اسلام آباد: علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، ۲۰۰۴ء) ص: ۴۱

۹۔عبداللہ، سیّد، ڈاکٹر، مطالعہ اقبالؒ کے چند نئے رخ (لاہور: بزم اقبال، نومبر ۱۹۹۹ء) ص: ۱۲۲

۱۰۔جاوید اقبال، ڈاکٹر، افکار اقبال (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء) ص: ۷۰، ۷۱

۱۱۔جاوید اقبال، ڈاکٹر، افکار اقبال (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء) ص: ۷۰

۱۲۔عبدالحکیم، خلیفہ، ڈاکٹر، فکر اقبال (لاہور: بزم اقبال، ۲ کلب روڈ، اپریل ۲۰۱۳ء) ص: ۳۱۱

۱۳۔عبدالحکیم، خلیفہ، ڈاکٹر، فکر اقبال (لاہور: بزم اقبال، ۲ کلب روڈ، اپریل ۲۰۱۳ء) ص: ۳۳۳

۱۴۔این میری شمل، پروفیسر، ڈاکٹر، شہپر جبریل، مترجم محمد ریاض، ڈاکٹر (لاہور: گلوب پبلشرز، ۱۹۸۵ء) ص: ۴۱۵

۱۵۔این میری شمل، پروفیسر، ڈاکٹر، شہپر جبریل، مترجم محمد ریاض، ڈاکٹر (لاہور: گلوب پبلشرز، ۱۹۸۵ء) ص: ۴۳۴

۱۶۔این میری شمل، پروفیسر، ڈاکٹر، شہپر جبریل، مترجم محمد ریاض، ڈاکٹر (لاہور: گلوب پبلشرز، ۱۹۸۵ء) ص: ۴۴۲

۱۷۔عطاءاللہ، شیخ، مرتبہ اقبالنامہ مجموعہ مکاتیب اقبال (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۱۲ء) ص: ۱۱۲

۱۸۔محمد اقبال، علامہ، تاریخ تصوّف، مرتبہ صابر کلوروی، ڈاکٹر (لاہور: مکتبہ عالیہ، ن، د) ص: ۵۳، ۵۴

۱۹۔عبدالواحد معینی، سیّد، مرتبہ مقالات اقبال (لاہور: آئینہ اردو، ۱۹۸۸ء) ص: ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۰۳

۲۰۔منیر احمد یزدانی، پروفیسر، فوز اقبال (میر پور: گوشہ تحقیق علامہ اقبال، مئی ۲۰۱۴ء) ص: ۴۸، ۴۹

۲۱۔محمد اقبال، علامہ، کلیات اقبال (اردو) (لاہور: شیخ غلام علی سنز، ۱۹۷۹ء) ص: ۶۸۰

۲۲غلام مصطفٰی تبسم، صوفی، مقالہ اقبال اور تصوّف، مشمولہ منشورات اقبال (لاہور: بزم اقبال، ۱۹۸۸ء) ص: ۸۷

23.Bashir Ahmed Dar, Compiled & Edited letters of Iqbal, (Lahore: Iqbal Academy Pakistan, 1978) Page No: 147

۲۴۔محمد عبداللہ، سیّد، ڈاکٹر، طیف اقبال، مرتبہ ڈاکٹر ممتاز منگلوری (لاہور: لاہور اکیڈمی، ۱۹۷۶ء) ص: ۴۸، ۴۹

۲۵۔محمد منوّر، پروفیسر، ایقان اقبال (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۱۲ء) ص: ۲۱۲

۲۶۔خالد اقبال یاسر، ڈاکٹر، جدید تحریکات اور اقبال (لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۲۰۱۵ء) ص: ۵۳۳

۲۷۔عطیہ بیگم، اقبال، مترجمہ ضیاالدین برنی (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۸۱ء) ص: ۱۶

۲۸۔نذیر نیازی، سیّد، اقبال کے حضور (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۸۱ء) ص: ۱۵

۲۹۔اقبال: مکتوب بنام شاہ سلیمان پھلواری، مرتبہ بشیر احمد ڈار (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۷۷ء) ص: ۱۸۸

۳۰۔علی عباس جلال پوری، سیّد، اقبال کا علم کلام (لاہور: مکتبہ فنون، ۱۹۷۲ء) ص: ۹۲

۳۱۔ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر، اقبال اور مسلک تصوّف (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۷۷ء) ص: ۳۸۸

۳۲۔عبدالحکیم، خلیفہ، ڈاکٹر، (لاہور: بزم اقبال، ۲ کلب روڈ، ۲۰۱۳ء) ص: ۱۳۶

۳۳۔تحسین فراقی، ڈاکٹر، نقد اقبال حیات اقبال میں (لاہور: بزم اقبال، ۱۹۹۲ء) ص: ۲۷۸، ۲۸۰

۳۴۔خالد اقبال یاسر، ڈاکٹر، ادب اور زمانہ (لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۲۰۱۴ء) ص: ۳۷، ۴۷

۳۵۔محمد اقبال، علامہ، تاریخ تصوّف، ترتیب، صابر کلوروی (لاہور: مکتبہ تعمیر انسانیت، ۱۹۸۵ء) ص: ۹۱

۳۶۔محمد اقبال، علامہ، فلسفہ عجم، مترجم میر حسن الدین (کراچی: نفیس اکیڈمی، ۱۹۶۲ء) ص: ۱۴۲

۳۷۔این میری شمل، پروفیسر، ڈاکٹر، شہپر جبریل، مترجم محمد ریاض، ڈاکٹر (لاہور: گلوب پبلشرز، ۱۹۸۵ء) ص: ۴۵۵، ۴۵۶

علامہ اقبال اور تصورِ اجتہاد

علامہ اقبالؒ کی پیدائش اور پرورش ایسے دور میں ہوئی جو مسلمان قوم کے زوال اور مایوسی کا تھا۔ بے یقینی اور بے بسی کی گھمبیر فضا مُسلمانوں کو اسلام کی روشن تعلیمات سے دُور لے جا رہی تھی۔ اہلِ مغرب کی مادی ترقی نے اہلِ اسلام کو مادیت پرستی کی طرف مائل کر دیا تھا۔ اس مادیت پرستی کی وجہ سے مسلمانوں کی اعلیٰ اخلاق و کردار کی تمام اقدار ماند پڑ گئیں اور وہ روبہ تنزل ہو گئے۔

علامہ اقبالؒ نے مغربی تہذیب کی ان کمزوریوں کی نشاندہی کی اور اسلام کی بنیادی اور اصل حقیقتوں کو وضاحت وصراحت کے ساتھ پیش کیا۔ انھوں نے دُور اندیشی اور خُداداد بصیرت کے بل بوتے پر مسلمانوں پر یہ بات واضح کی کہ عنقریب دُنیا میں اسلام کو سربلندی حاصل ہوگی اور مُسلمان اس دینِ اسلام کی وساطت سے دُنیا کو مادی خواہشات اور لالچ اور ہوس کی تباہ کاریوں سے محفوظ رکھنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

اجتہادی تصورات اقبالؒ کے فکری اور ذہنی ارتقا میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ اُنھوں نے نوعِ انسان کے تمام بڑے اور اہم مسائل اور ان کی تمام جہات کو نہایت بے باکی، مکمل صداقت اور خلوص نیت سے پیش کیا۔ مثالی معاشرے کو قائم کرنے کے لیے مضبوط اور ٹھوس اساس لازمی ہے۔ ایسے بنیادی اصول جو سماجی زندگی کے تغیر وتبدل کی وضاحت کر سکیں۔ مستحکم اُصولوں اور تغیرات کی ہم آہنگی کو ہر دور میں برقرار رکھنے کے لیے اجتہاد اور اجتہادی تصورات بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔

اجتہاد کی تعریف

''اجتہاد جہد (زبر کے ساتھ) اور جُہد (جیم پر پیش) دونوں مادوں میں استعمال ہوتا ہے، پہلے مادہ میں اس کے معنی کوشش، مشقت اور تکلیف اٹھانے کے ہیں اور دوسرے مادہ میں اس کے معنی طاقت، وسعت اور استطاعت کے ہیں۔''(۱)

ڈاکٹر سیّد عبداللہ نے ''مطالعہ اقبال کے چند نئے رخ'' میں لکھا ہے:

علامہ اقبالؒ نے اپنے ایک انگریزی خطبے کا نام رکھا تھا:

"The Principal of movement in the structure of Islam."

''سیّد نذیر نیازی نے اپنے اُردو ترجمے میں اس خطبے کا آسان نام ''الاجتہاد فی الاسلام'' رکھا ہے، کیوں کہ علامہ اقبالؒ نے اپنے اس خطبے میں اجتہاد ہی کو اسلام کی ابدی و آفاقی ہیت کا اصول حرکت و ترقی قرار دیا ہے۔''(۲)

''۱۹۲۵ء سے پہلے انھوں نے ایک مضمون اجتہاد پر لکھا مگر دورانِ تحریر معلوم ہوا کہ مضمون اس قدر آسان نہیں جیسا انھوں نے ابتداء میں خیال کیا تھا۔''(۳)

اجتہاد کی تعریف حضرت علامہ اقبالؒ کے انگریزی کلمات کا جو ترجمہ سیّد نذید نیازی صاحب نے کیا وہ یہ ہے:

''لغوی اعتبار سے تو اجتہاد کے معنی ہیں کوشش کرنا لیکن فقہ اسلامی کی اصطلاح میں اس کا مطلب ہے وہ کوشش جو کسی قانونی مسئلے میں آزادانہ رائے قائم کرنے کے لیے کی جائے۔ ساتھ ہی حضرت علامہ نے اس آیت قرآنی سے استدلال کیا ہے۔''

ترجمہ: جولوگ ہماری خاطر مشقت اٹھائیں گے ہم انھیں اپنی راہیں حتماً اور لازماً دکھائیں گے۔

سورہ ۲۹: آیت ۶۹)

خواہ قرآن حکیم میں اس آیت کا محل کچھ بھی ہو مگر بہر حال اجتہاد بھی ایک مشقت ہے، ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ اجتہاد، توضیع وتوسیع قانون کی راہ میں جہاد ہے، اس لیے مجتہد اللہ کی ہدایت سے محروم نہیں رہتا۔۔۔۔''۔(۴)

شروع شروع میں اقبالؒ بھی اجتہاد کی بجائے تقلید کو بہتر سمجھتے تھے کیوں کہ یہ اس وقت بہترین پالیسی تھی۔ بعد ازاں ان کا نقطہ نظر یکسر بدل گیا اور فرمایا کہ قومی شیرازہ بندی کی اہمیت سے انکار نہیں لیکن کسی قوم

کی زندگی کا اصل سرمایہ مادیت یا عارضی شیرازہ بندی نہیں بلکہ اس ضمن میں افراد کی ذہنی اور جسمانی بالیدگی اور نشوونما کا کردار نہایت اہم ہے۔ علامہ اقبالؒ اجتہاد کو ہیئت اسلامی میں اصولِ حرکت سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس اصول کی اہمیت کے باوجود فقہ کے ائمہ اربعہ کے ہاں اجتہاد کا دروازہ بند ہی نظر آتا ہے اور یہ صورتحال اسلام کے حرکی تصورِ حیات کی نفی کرتی ہے، علامہ اقبالؒ نے اس صورتحال کا تجزیہ کیا اور جدید دور میں عالم اسلام میں ہونے والے اجتہاد کا جائزہ لیا ہے۔ اس خطبے کے اہم نکات مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔اسلام کا حرکی نظریہ حیات اور تصورِ توحید ۲۔اجتہاد کی ضرورت و اہمیت
۳۔ترکِ اجتہاد کے اسباب ۴۔تحریک وہابیت
۵۔ترکیہ میں ہونے والی اجتہادی کوششیں ۶۔اسلامی فقہ کی خصوصیات
۷۔اسلامی آئین کے ماخذ ۸۔اسلامی تعلیمات کی آفاقیت (۵)

ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی ''فروغِ اقبال'' میں رقم کرتے ہیں:

''اس ساری جامعیت اور ہمہ گیری کے باوجود، ہماری نظامت، فقہ بالآخر افراد ہی کی ذاتی تعبیرات کا نتیجہ ہیں، اس لیے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان پر قانون کے نشوونما کا خاتمہ ہو چکا ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ علمائے اسلام نے تو مذاہب فقہ کے بارے میں کچھ ایسی رائے قائم کر رکھی ہے، اس کے باوجود انھوں نے اجتہاد کی ضرورت سے بھی اصولاً کبھی انکار نہیں کیا ہے۔'' (۶)

اِجتہاد

ہند میں حکمتِ دیں کوئی کہاں سے سیکھے — نہ کہیں لذّتِ کردار، نہ افکارِ عمیق
حلقۂ شوق میں وہ جرأتِ اندیشہ کہاں — آہ محکومی و تقلید و زوالِ تحقیق!
خود بدلتے نہیں، قرآں کو بدل دیتے ہیں — ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق!
ان غلاموں کا یہ مسلک ہے کہ ناقص ہے کتاب — کہ سکھاتی نہیں مومن کو غلامی کے طریق
(۷)

فقیہ

وہ عالم ہے جو تفکر و تدبر کر کے قوانین اسلامی کے مشکل اور پیچیدہ اُمور و مسائل کو قرآن و سنت اور احادیث رسول ﷺ کی روشنی میں واضح کرتا ہے اور اگر کسی خاص مسئلے میں اسلامی قوانین کے مذکورہ بنیادی

ماخذ واضح رہنمائی نہ کر سکیں تو پھر عقلِ سلیم سے کام لیتے ہوئے ضرورت زمانہ اور حالات کے تقاضوں کے مطابق اُمتِ مسلمہ کی قانونی راہ نمائی کے فرائض انجام دیتا ہے۔ اقبالؒ کے مطابق ماضی میں اسلام اور مسلمانوں کی مدنی اور سیاسی کامیابیوں کی وجہ فقہا کی مجتہدانہ کوششیں تھی۔''

علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ ''جن حضرات نے تاریخ اسلام کا مطالعہ کیا ہے خوب جانتے ہیں بہ لحاظ ایک نظامِ مدنیت اور سیاست، اسلام نے جو کامیابی حاصل کی ہے اس کا تقریباً نصف حصہ ہمارے فقہا کی قانونی ذہانت اور فطانت کا مرہونِ منت ہے۔'' (۸)

اجتہاد کے تین درجے

ا۔تشریح یا قانون سازی میں مکمل آزادی، لیکن جس سے عملاً صرف مؤسسین مذاہب ہی نے فائدہ اٹھایا۔
ب۔محدود آزادی جو کسی مخصوص مذاہب فقہ کی حدود کے اندر ہی استعمال کی جا سکتی ہے اور
ج۔وہ مخصوص آزادی جس کا تعلق کسی ایسے مسئلے میں جسے مؤسسین مذاہب نے جوں کا توں چھوڑ دیا ہو، قانون کے اطلاق سے ہے۔'' (۹)

علامہ اقبالؒ وضاحت کرتے ہیں کہ علمائے سنت و جماعت اصول اور نظریئے کے طور پر اس امر کے قائل ہیں کہ اجتہاد ہونا چاہیے مگر انھوں نے اس ضمن میں شرائط ایسی عائد کر رکھی ہیں جن کا پورا کرنا اگر ناممکن نہیں تو محال ضرور ہے۔ یہاں علامہ اقبالؒ بعض مستشرقین کی اس رائے یا الزام کی تردید کرتے ہیں کہ اجتہاد کی راہ تُرکوں کے اثر سے بند ہوئی۔ علامہ اقبالؒ وضاحت کرتے ہیں کہ ترکوں کا اثر شروع ہونے سے قبل حرکت فقہ میں جمود رونما ہو چکا ہے۔

''علامہ اقبالؒ کے نزدیک فقہ و اجتہاد کے باب میں جو بندش در آئی اس کے چند اسباب بھی تھے۔

(۱)۔ بنو عباس کے دور میں فروغ پانے والی تعقلیت نے بعض ایسے مسائل کھڑے کر دیے تھے جن کے نتائج آگے چل کر بڑے خطرناک ہوتے۔ مثلاً خلقِ قرآن کا مسئلہ علما و فقہائے اُمت کو خوف لاحق ہوا کہ نظام ایسے متکلمین کی حد سے بڑھی ہوئی بے باک کلامی بحثیں کہیں اُمت کے فکری انتشار کا باعث نہ بن جائیں، اس ڈر کے مارے انھوں نے فقہ و اصول میں اور بھی زیادہ تشدد پیدا کر لیا تا کہ اسلامی سوسائٹی کا ڈھانچا بحال رہے۔

(۲)۔ متکلمین اور فقہا کی عقلی و فقہی موشگافیوں سے بیزار ہو کر ایک گروہ الگ ہو بیٹھا وہ گروہ غیر اسلامی موثرات سے متاثر تھا، یہ اہلِ تصوّف کا گروہ تھا۔ علامہ کہتے ہیں تصوّف کو عقلیت پرستوں کے خلاف ایک

طرح کی بغاوت قرار دیا جا سکتا ہے، علامہ یہ بھی کہتے ہیں کہ سوسائٹی کے عالی دماغ لوگوں نے تصوّف کے دامن میں پناہ لے لی اور نتیجہ یہ ہوا کہ اصول و قانون کا شعبہ متوسط درجے کے افرادِ علم و عقل کے قبضے میں چلا گیا۔

(۳)۔ سقوطِ بغداد سے مسلمانوں کو شدید دھچکا لگا اور اس کے جلو میں آنے والی تباہی و بربادی نے مسلمانوں کے دل و دماغ پر اسلامی سوسائٹی اور دین کے مستقبل کے باب میں نیم مایوسی کا سایہ ڈال دیا۔ نتیجہ یہ کہ فکری قویٰ میں اضمحلال بڑھا اور انتشار بھی، سوسائٹی کے مزید فکری اور ذہنی انحطاط کو روکنے کی خاطر قدامت پسند علما کو ضوابط و قواعد کی مزید متشددانہ تعین کی ضرورت محسوس ہوئی۔ حضرت علامہ خود بھی اس صورت حال میں ایک حد تک اس رویے کی تائید کرتے ہیں۔''(۱۰)

''قوائے انحطاط کا سدِ باب نظم و ربط ہی سے ہوتا ہے لیکن ہمارے زمانے کے علما نہیں سمجھتے تو یہ قوموں کی تقدیر اور ہستی کا دار و مدار اس امر پر نہیں کہ ان کا وجود کہاں تک منظم ہے، بلکہ اس بات پر کہ افراد کی ذاتی خوبیاں کیا ہیں، قدرت اور صلاحیت کیا۔ یوں بھی جب معاشرہ حد سے منظم ہو جائے تو اس میں فرد کی ہستی سرے سے فنا ہو جاتی ہے۔ وہ گرد و پیش کے اجتماعی افکار کی دولت سے تو مالا مال ہو جاتا ہے لیکن اپنی حقیقی رُوح کھو بیٹھتا ہے۔''(۱۱)

اسلامی نظامِ حیات کے اصولِ حرکت سے بحث کرتے ہوئے اقبالؒ لکھتے ہیں کہ:

''رُوحانی زندگی کی اساس اسلام کی نظر میں ایک ابدی حقیقت ہے جو تفسیر و تنوع کی دوگانہ صفات میں ظہور کرتی ہے جو معاشرہ حقیقت کے ایسے تصور پر مبنی ہو اسے اپنی زندگی میں ثبات و تغیر کے اضداد میں مصالحت کر کے دونوں کو اپنے اندر سمو لینا چاہیے۔''(۱۲)

آزادیٔ افکار سے ہے ان کی تباہی — رکھتے نہیں جو فکر و تدبر کا سلیقہ
ہو فکر اگر خام تو آزادیٔ افکار — انسان کو حیوان بنانے کا طریقہ

(کلیاتِ اقبال، ضربِ کلیم، ص:۶۲۶)

قاضی شوکانی کہتے ہیں:

''قیاس و اجتہاد تو رسولِ کرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے زمانے میں ان کی زندگی میں بھی ہوتا تھا۔''(۱۳)

''اقبالؒ کے خیال میں ترک قوم کی مذہبی اور سیاسی زندگی میں اجتہاد کا تصور جو جدید فلسفیانہ نظریات کی روشنی میں زیادہ وسعت اختیار کر گیا تھا اپنا اثر دکھا رہا ہے، یہ امر حلیم ثابت کے قانونِ اسلامی کے نئے نظریے سے ظاہر ہے جس کی بنیاد جدید عمرانی تصورات پر رکھی گئی ہے۔''

''اقبالؒ فرماتے ہیں کہ احیائے اسلام ایک حقیقت ہے اور انھیں یقین ہے کہ واقعی یہ ایک ناگزیر حقیقت ہے تو ہمیں بھی ایک نہ ایک دن ذہنی ورثہ کی قدر و منزلت کا دوبارہ جائزہ لینا پڑے گا۔''(۱۴)

''پھر اگر اسلام کی نشاۃ ثانیہ ناگزیر ہے جیسا کہ میرے نزدیک قطعی ہے تو پھر ہمیں بھی ترکوں کی طرح ایک نہ ایک دن اپنے عقلی اور ذہنی ورثے کی قدر و قیمت کا از سرِ نو جائزہ لینا ہو گا۔''

''اصل بات جو توجہ طلب ہے وہ یہ ہے کہ حقِ اجتہاد کس کو حاصل ہے؟ فرد کو یا جماعت کو؟ ترکوں نے یہ اجتہاد کیا کہ اسلامی تعلیمات کو رُوح کے مطابق اس منصب کو افراد کی ایک جماعت بلکہ منتخب شدہ مجلس کے سپرد بھی کیا جا سکتا ہے۔ علامہ اقبالؒ اس طریق اجتہاد کو درست قرار دیتے ہیں کہ ان کے نزدیک یہ طرزِ عصرِ حاضر میں بحالی جمہوریت کے لیے ناگزیر تھا مگر علامہ اقبالؒ تاکید کرتے ہیں کہ علما کا بھی ایک گروہ اسمبلی میں شامل ہونا چاہیے جو دین سے متعلق زیرِ بحث آنے والے مسائل اور ان کے ضمن میں رو پذیر ہونے والے ضوابط و قواعد کا جائزہ لیتے رہیں۔''(۱۵)

''حضرت علامہ نے جہاں تُرکوں کی اجتہادی کوششوں کو داد دی ہے وہیں کوئی نہ کوئی انتہائی آواز بھی بلند کر دی ہے۔

اجتہاد اندر زمان انحطاط
قوم را برہم ہمی پیچد بساط

بالآخر اقبالؒ نے بھی اسلامی فقہ میں اجتہاد کی ضرورت محسوس کی، وہ مزید غور و فکر کے بعد یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ ایک قوم کی زندگی اور ترقی کا انحصار، افراد کے ذہنی و جسمانی نشو و نما پر ہے، اسی لیے وہ چاہتے ہیں کہ امتِ مسلمہ کو بھی، اسلامی قوانین کو حالات اور ضروریاتِ زمانہ کے مطابق ترتیب دے لینا ضروری ہے۔''(۱۶)

اجتہاد کے ماخذ

(۱) قرآن مجید

فقہ میں قرآن کو اسلامی قوانین کا اولین ماخذ تسلیم کیا گیا ہے۔ اقبال اسلامی فقر و اجتہاد کی پرزور حمایت اور تائید کے باوجود فرماتے ہیں کہ

''مسلمانوں کا کوئی فیصلہ بھی قرآنی رُوح سے متصادم نہیں ہونا چاہیے۔''

بقول اقبالؒ: ''میرا عقیدہ یہ ہے کہ جو شخص اس وقت قرآنی نقطہ سے زمانہ حال کے جورس پروڈنس

(Jurisprudence) یعنی اصول فقہ پر ایک تنقیدی نگاہ ڈال کر احکام قرآنیہ کی ابدیت کو ثابت کرے گا وہی اسلام کا مجدد ہوگا اور بنی نوع انسان کا سب سے بڑا خادم۔'' (۱۷)

قرآن مجید میں ارشاد ربانی ہے:

ترجمہ: اللہ تعالیٰ نے تمام بنی نوع انسان کو ایک ہی نفس سے پیدا کیا۔''

اقبالؒ فرماتے ہیں کہ ''باطنی مشاہدہ تو انسانی علم کا صرف ایک ذریعہ ہے۔ قرآن کی رو سے علم کے دو اور ذرائع ہیں یعنی فطرت اور تاریخ''۔ (۱۸)

اس بنا پر اسلام نے ایک عالمگیر انسانی برادری کی بنیاد رکھی ہے۔ جب دنیا اس تصور سے بالکل بے گانہ تھی۔ اس نے تمام امتیازات کو بالائے طاق رکھ دیا اور ایسے معاشرے کو اُستوار کیا جس کا محور شرف انسانی ہے جب تک انسان عملی طور پر ان قوانین پر (قرآن کے اصولوں پر) عمل پیرا نہیں ہوتا تب تک وہ اس جہانِ فانی میں با مقصد اور کامیاب زندگی نہیں گزار سکتا۔

علامہ اقبالؒ نے ''جاوید نامہ'' میں قرآنی نظامِ حکومت کا مختصر نقشہ پیش کیا ہے۔ انھیں کامل یقین ہے کہ قرآن اب تک بھی ایک نئے نظام حکومت کی بنیاد رکھنے کے لیے تیار ہے۔ بشرطیکہ نہایت توجہ اور دل کی اتھاہ گہرائیوں سے اس کا مطالعہ کیا جائے۔

نقش قرآن تا درین عالم نشست — نقش ہای کاہن و پاپا شکست
فاش گویم آنچہ در دل مضمر است — این کتابی نیست چیزی دیگر است

(کلیات اقبال (فارسی)، جاوید نامہ، ۴۸۲)

علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں: ''تقریباً تمام ممالک میں اس وقت مسلمان یا تو اپنی آزادی کے لیے لڑ رہے ہیں یا قوانین اسلامیہ پر غور وفکر کر رہے ہیں۔'' (۱۹)

(۲) حدیث

''قرآن مجید کے بعد، اجتہاد کا دوسرا ماخذ حدیث ہے۔ جس سے مراد رسول اللہ ﷺ کے تمام اقوال اور افعال ہیں۔ آپ ﷺ نے قرآن کے مطالب کو کبھی اپنے فعل سے اور کبھی قول و فعل دونوں سے واضح فرمایا۔ اس حیثیت سے حدیث میں کوئی ایسی چیز نہیں کہ جس کے مفہوم پر قرآن نے اجمالاً یا تفصیلاً دلالت نہ کی ہو۔ لیکن حالات کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ، ان اصولوں کی تفاصیل میں مناسب ترمیم ضروری ہو جاتی ہے۔

چناں چہ آپ نے خود یمن کے عامل، حضرت معاذؓ کو تلقین کی کہ اگر اس علاقے کے حالات کے مطابق قرآن اور حدیث میں احکام موجود نہ ہوں تو اپنے آزادانہ فیصلے پر عمل کرو۔ اسی کو تو اجتہاد کہتے ہیں۔'' (۲۰)

(۳) اجماع

''اجتہاد کا تیسرا ماخذ ''اجماع'' ہے۔ کسی حکم شرعی پر کسی زمانے میں مسلمان مجتہدین کا متفق ہو جانا ''اجماع'' کہلاتا ہے، لیکن اجماع 'کتاب اللہ' یا سنت رسول اللہ ﷺ کو منسوخ نہیں کر سکتا یا اسلام کے بنیادی ڈھانچے میں کوئی تبدیلی نہیں لا سکتا۔ اصول وہی رہیں گے البتہ ان کی تفصیل زمانے کے تقاضوں کے مطابق طے کی جائے گی۔ یہی اجتہاد ہے۔'' (۲۱)

اقبالؒ کی رائے ہے کہ خلفائے راشدین کے بعد بنی اُمیہ اور بنی عباس نے جو بادشاہت قائم کی اس بعد کے فائدے کے لیے لازم تھا کہ اجتہاد کا عہدہ کسی ایک فرد کے سپرد کرنے کی بجائے کسی مستقل قانون ساز اجماعی ادارے کو سونپا جاتا۔ مُسلم ممالک میں بادشاہت کے خلاف جو جذبات بھڑک رہے ہیں اور مختلف جگہوں پر قانون ساز مجالس موجود ہیں۔ ان حالات میں اگر اجتہاد کا کام اشخاص کی بجائے مجالس کے سپرد ہو جائے تو یہ امر یقینی ہے کہ ہمارے قانون کے ارتقا کا موجب بنے گا۔

(۴) قیاس

''اجتہاد کا چوتھا اور آخری ماخذ ''قیاس'' ہے۔ قانون سازی میں مماثلتوں کی بنا پر استدلال سے کام لینا قیاس کہلاتا ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ اسلام کے بنیادی تقاضوں کے مطابق اپنی رائے کا استعمال کیا جائے اور نئے اصول وضع کیے جائیں۔ اقبالؒ کے اجماع اور قیاس اجتہاد ہی کی دوسری صورتیں ہیں۔ حق اجتہاد کے سلسلے میں یہ امر بھی توجہ طلب ہے کہ ''حق اجتہاد'' فرد کو حاصل ہے یا جماعت کو۔ ترکوں نے ''حق اجتہاد'' کے بارے میں یہ فیصلہ کیا کہ منصب اجتہاد کو افراد کی ایک جماعت بلکہ منتخب شدہ قانون ساز کے سپرد کر دیا۔'' (۲۲)

اجتہاد کے لیے فکر کی پختگی لازم ہے اور یہ ایک ایسی داخلی بندش ہے جو معاشرے کے اقتدار اعلیٰ کو بے راہ روی سے روک سکتی ہے۔۔۔۔۔ علامہ اقبال نے اجتہاد کے موضوع پر جو کچھ لکھا ہے اس کے مطالعہ سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ

ا۔ ان کی رائے میں فقہ کی تشکیل جدید ہونی چاہیے لیکن غلامانہ اور مقلدانہ نہیں۔

۲۔ اس کے لیے ایسے نصابات مرتب کیے جائیں جو شرع کے حوالے سے جدیدیات کی مشکلات اور عصری مجبوریوں کے حل کرنے میں مدد دیں اور ظاہر ہے کہ اس کے لیے ایسے اداروں کی ضرورت ہے۔

"جہاں تک خالص مذہبی فکر کا تعلق ہے پروفیسر مذکورہ نے فلاسفہ اسلام کے افکار پر نظر ڈالتے ہوئے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اسلامی تاریخ کے متعلق ہم بجا طور پر کہہ سکتے ہیں کہ یہ عبارت ہے اس تدریجی عمل و تعامل، علی ھذا توافق و تطابق اور ان دو قوتوں کی روز افزوں شدت اور گہرائی سے جن کو ایک طرف آریائی تہذیب اور علم و حکمت اور دوسری جانب سامی مذہب سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ لیکن مسلمانوں نے گردو پیش کی قوموں سے تہذیب و ثقافت کے جو عناصر اخذ کیے ان کو ہمیشہ اپنے مذہبی مطمحِ نظر کے مطابق ڈھال لیا۔" (۲۳)

یہی وجہ ہے کہ اقبالؒ کا موقف یہ رہا ہے کہ نئے فقہی فیصلے ہونے ضرور چاہئیں، کیوں کہ دنیا بھر میں نئی معاشرتی لہریں ابھر آئی ہیں جن سے مسلمان قوم خصوصاً جدید الخیال طبقہ متاثر ہو رہا ہے اور وہ مسائل و مشکلات کے بارے میں اسلام کا فیصلہ مانگتا ہے۔" (۲۴)

علامہ اقبالؒ اجتہاد کی اہمیت پر زور دیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ یہ مُسلمانوں کو بطور خاص اجتہاد کی طرف توجہ دینے کی ضرورت ہے ورنہ قرآن کی تعلیمات و احکامات موجودہ زمانے کے لیے بے اثر ثابت ہو جائیں گے اور ان کا اصل مقصد یہ ہے کہ انسان کے دِل میں کائنات اور خالقِ کائنات سے تعلق کا درست تصور پیدا ہو سکے۔ المختصر اسلامی معاشرے کی بنیاد توحید اور ختمِ نبوت کے عقائد پر اُستوار ہے۔ اسلامی فقہ کی حرکت پذیری، اسلام کی اعلیٰ تعلیمات اور اسلامی قوانین کے چاروں بنیادی ماخذوں کی روشنی میں علامہ اقبالؒ اپنے اجتہادی تصورات کو ہمارے روبرو پیش کرتے ہیں۔ بہت مدلل اور مثبت اندازِ فکر سے اپنے تصورات کو واضح کیا ہے۔

حواشی

۱۔ خالد مسعود، ڈاکٹر، اقبال کا تصورِ اجتہاد (راولپنڈی: ایس ٹی پرنٹرز، گولمنڈی، ۱۹۸۵ء) ص: ۱۱۲

۲۔ عبداللہ، سیّد، ڈاکٹر، مطالعہ اقبالؒ کے چند نئے رخ (لاہور: بزم اقبال، نومبر، ۱۹۹۹ء) ص: ۱۵۲

۳۔ عبدالسلام ندوی، مولانا، اقبال کامل (لاہور: الفیصل ناشران و تاجران کتب، فروری ۲۰۰۸ء) ص: ۱۰۶

۴۔ محمد منوّر، پروفیسر، برھانِ اقبال (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۰۳ء) ص: ۱۹۳، ۱۹۴

۵۔ علامہ اقبال کی تحریروں کا متن، کوڈ ۴۰۳ ۷ (اسلام آباد: علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، ۲۰۰۵ء) ص: ۳۵

۶۔ افتخار احمد صدیقی، ڈاکٹر، فروغِ اقبال (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۹۶ء) ص: ۴۲۴، ۴۲۵

۷۔ اقبال، کلیاتِ اقبال اردو (لاہور: شیخ غلام اینڈ سنز، ۱۹۷۳ء) ص: ۴۸۴

۸۔ ایس ایم منہاج الدین، ڈاکٹر، افکار و تصورات اقبال (ملتان: کارواں ادب، ۱۹۸۵ء) ص: ۳۱۰

۹۔ نذیر نیازی، سیّد، تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، (لاہور: بزم اقبال، ۲۰۱۲ء) ص: ۲۲۲

۱۰۔ نذیر نیازی، سیّد، تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، (لاہور: بزم اقبال، ۲۰۱۲ء) ص: ۲۲۳، ۲۲۴

۱۱۔ نذیر نیازی، سیّد، تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، (لاہور: بزم اقبال، ۲۰۱۲ء) ص: ۲۲۵

۱۲۔ خالدہ جمیل، مباحث اقبال (لاہور: زبیدہ سنٹر، ۲۰۰۴ء) ص: ۱۵۸

۱۳۔ عبدالحکیم، خلیفہ، ڈاکٹر، تلخیص خطبات اقبال (لاہور: بزم اقبال، جون ۱۹۸۸ء) ص: ۱۳۲

۱۴۔ جاوید اقبال، ڈاکٹر، خطبات اقبال (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء) ص: ۱۸۳

۱۵۔ محمد منوّر، پروفیسر، برہان اقبال (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۰۳ء) ص: ۱۹۹

۱۶۔ افتخار احمد صدیقی، ڈاکٹر، فروغ اقبال (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۹۶ء) ص: ۴۲۶

۱۷۔ اقبال کا خط بنام صوفی غلام مصطفیٰ تبسم مورخہ ۲ ستمبر ۱۹۲۵ء بحوالہ افکار و تصورات اقبالؒ، ص: ۳۱۷

۱۸۔ محمد شریف بقاء، خطباتِ اقبال ایک جائزہ (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۹۱ء) ص: ۹۹

۱۹۔ گوہر نوشاہی، ڈاکٹر (مرتبہ)، مطالعہ اقبال (لاہور: بزمِ اقبال، ۱۹۸۳ء) ص: ۲۶۳

۲۰۔ افتخار احمد صدیقی، ڈاکٹر، فروغ اقبال (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۹۶ء) ص: ۴۲۶

۲۱۔ افتخار احمد صدیقی، ڈاکٹر، فروغ اقبال (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۹۶ء) ص: ۴۲۷

۲۲۔ افتخار احمد صدیقی، ڈاکٹر، فروغ اقبال (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۹۶ء) ص: ۴۲۷

۲۳۔ نذیر نیازی، سیّد، تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، (لاہور: بزم اقبال: ۲۰۱۲ء) ص: ۲۴۶

۲۴۔ خالدہ جمیل، مباحث اقبال (لاہور: اپنا ادارہ، ۲۰۰۴ء) ص: ۱۵۶

علامہ اقبالؒ کا تصور خیر و شر

(بحوالہ ''جاوید نامہ'' نظم ''نالۂ ابلیس'')

اللہ رب العزت نے انسان کو احسن تقویم پیدا کیا ہے، مطلب تمام مخلوقات سے افضل اور برتر۔ خیر وشر کی دونوں قوتیں انسان کے اندر جمع کر دیں اور اسے اختیار دیا گیا ہے کہ وہ چاہے تو 'خیر' کا راستہ اختیار کر کے اپنی شخصیت کی تعمیر کرے اور چاہے تو 'شر' کا راستہ اختیار کر کے اپنی شخصیت کی تحلیل کرے۔ شیطان جس نے آدمؑ کو سجدہ کرنے سے انکار کر کے خُدائی احکام کی نافرمانی کی اور اس انا پرستی اور حکم عدولی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اسے ملعون و مردود قرار دیا۔ اب شیطان کا کام صرف اتنا ہے کہ اللہ عزوجل کی مخلوق کو بہکانے اور اُسے اللہ عزوجل کے مقرر کردہ راستے سے دور لے جائے اور اس کے لیے شیطان نے اللہ عزوجل سے قیامت تک کی مہلت مانگی ہے۔

ترجمہ: ''ہم خیر وشر کے ذریعے آپ کو آزماتے ہیں۔'' (سورۃ الانبیا:۳۵)

''نالۂ ابلیس'' ''جاوید نامہ'' سے قطع نظر ایک جداگانہ نظم کے طور پر بھی اقبالؒ کی ایک لازوال تخلیق ہے، اشعار کا حسن صوری بھی ہے اور معنوی بھی۔ شکوہ و شکایت لکھنے میں اقبالؒ ید طولیٰ رکھتے تھے۔ خُدا اور انسانوں سے وہ شکوے تو کرتے رہے، یہاں انھوں نے انسانوں کے بارے میں ابلیس کا خدا سے شکوہ نظم کیا ہے، یہ شکوہ بے حد عبرت ناک اور رنگ آور ہے، کیوں کہ خود مظہر شر انسانوں کی بے مقاوتی اور تسلیم با شر کی روش

آور سے خُدا کے ہاں فریادی ہے۔ وہ خُدا سے ملتمس ہے کہ اسے صاحبان خُودی اور مردانِ مومن سے زیادہ سابقہ پڑے بلکہ گاہے بگاہے اسے شکست بھی ملے کیوں کہ سر بہ تسلیم نخچیروں سے وہ تنگ آ چکا ہے، اقبال کے ہاں ابلیس انسانوں کی قوت خیر و مبارزہ کو آزمانے کی ایک محک ہے مگر عصر حاضر کے بے عمل انسانوں نے اس ازلی دشمن سے شقاوت اور بدبختی کے سوا کچھ بھی نہیں لیا ہے۔''(۱)

ابن آدم چیست؟ یک مشت خس است
مشتِ خس را یک شرار از من بس است!

(۲)

اے خُدائے خیر وشر، میں انسان کی محفل سے خواب ہو گیا، اس نے کبھی میرے حکم سے سرتابی نہ کی، خود سے آنکھیں بند کر لیں اور اپنے آپ کو نہ پا سکا۔ اس کا وجود ذوقِ انکار اور شرارِ عظمت و کبریائی سے بے بہرہ ہے۔

''اس کی فطرت خام اور اس کا عزم کمزور ہے، یہ مدمقابل میری ایک ضرب کی تاب نہیں لا سکتا۔ مجھے ایک بصیرت والے اور پختہ حریف کی تمنا ہے۔ خُدایا! یہ مٹی اور پانی کی گڑیا (کمزور انسان) مجھ سے لے لے۔ بڑھے سے اب بچگانہ کام نہیں ہوتے۔ انسان ہے کیا؟ خس و خاشاک کی ایک مشت، مٹھی بھر خس و خاشاک کو میرا ایک شرارہ کافی ہے۔ اس دنیا میں اگر خس و خاشاک ہی ہونا تھا تو مجھے اس قدر آگ دینے کا کیا فائدہ؟ شیشہ پگھلانا باعث ندامت ہے مگر پتھر پگھلانا مشکل ہوتا ہے۔ میری آرزو ہے خُدایا کہ میرا دشمن سے سامنا ہو۔ خُدایا! مجھے ایسے مردِ خُدا کا راستہ بتا۔''(۳)

''عام لوگوں کا یہ عقیدہ تھا کہ آدمی کو شیطان نے خراب کیا مگر یہاں شیطان کو ایسا شکوہ انسانوں سے ہے کہ یہ خُودی ناشناس انسان بے چوں و چرا میری حکم برداری پر تیار رہتا ہے ذرا مقابلہ کرے تو مجھے بھی زور آزمائی کا موقع ملے۔ ابلیس خُدا سے اس لیے کہتا ہے کہ اس ذلیل شکار سے میری خلاصی کرا کیوں کہ اگر کوئی صاحبِ نظر حریف پختہ ہو تو اس سے کشتی لڑنے میں مزہ بھی آئے۔ یہ آدم تو ایک مشت خس رہ گیا ہے جس کے لیے ایک چنگاری کافی ہے۔''(۴)

''اقبال کی وہ سب نظمیں جن میں شیطان کا انداز معذرت خواہانہ ہے، رُومی سے متاثر ہو کر لکھی گئیں یہاں تک کہ شیطان کی گردن مروڑنے کا تصور بھی رُومی ہی سے لیا گیا۔ بہر حال جاوید نامہ کی نظم ''نالۂ ابلیس'' کا شیطان کے کردار سے متعلق عالمی ادب میں اپنا مقام ہے۔ شیطان خُدا سے گلہ کرتا ہے:

"اے خُداوندِ صواب و ناصواب! مجھے آدم کی صحبت نے ذلیل وخوار کر دیا ہے، اس کی تو فطرت ہی انکار سے بیگانہ ہے۔ لہٰذا میرے حکم کی تعمیل کرتا ہے۔ میں تو ایسے فرماں بردار سے پناہ مانگتا ہوں۔ اے خُداوند! میں تجھے اپنی سابقہ اطاعت کا واسطہ دے کر کہتا ہوں کہ مجھے اس کی صحبت سے نجات دے۔ اس کی صحبت میں رہ کر میری ہمت بھی پست ہو گئی ہے۔ اس کی فطرت اتنی خام اور عزم اس قدر کمزور ہے کہ میری ایک ضرب کی تاب بھی نہیں لا سکتا۔ مجھے کوئی پختہ حریف عطا کر جو میرے مرتبے کے لائق ہو، مجھے ایسا انسان دے جو میری طاقت کا مردانہ وار مقابلہ کر سکے۔ جو میری گردن پکڑ کر مروڑے اور جس کی ایک ہی نگاہ مجھے لرزہ بر اندام کر دے۔ اے خُداوند! مجھے کم از کم ایک مردِ حق پرست تو عطا فرما تا کہ میں بھی شکست کی لذت سے محظوظ ہو سکوں۔" (۵)

۱۔ خیر ایک ایجابی اور شر ایک سلبی چیز ہے۔

۲۔ خیر شر پر غالب ہے اور خیر کی تعداد و مقدار شر سے زیادہ ہے مثلاً دنیا میں اگر چہ مرض کا وجود ہے لیکن صحت اس سے زیادہ پائی جاتی ہے۔ دنیا اگرچہ رنج و غم سے خالی نہیں لیکن خوشی اور مسرت کا وجود ان سے زیادہ ہے لیکن اس کے بالکل برعکس محمد بن زکریا رازیؔ کے نزدیک شر ایجابی اور خیر سلبی ہے یعنی لطف و مسرت کی حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ رنج والم زائل ہو جائیں۔ کھانے پینے کی لذت کے معنی صرف یہ ہیں کہ بھوک اور پیاس کی تکلیف سے نجات مل گئی۔ یہی حال اور تمام لذتوں کا ہے کہ وہ کسی نہ کسی تکلیف اور رنج والم کا ازالہ ہیں اور شوپنہار کا فلسفہ بھی یہی ہے کہ دنیا میں واقعی جو چیزیں موجود بالذات ہیں وہ دکھ، مصیبت اور حاجت ہیں۔ ان سے کبھی وقتی چھٹکارا مل جایا کرتا ہے تو اسی مہلت کا نام انسان نے خوشی یا مسرت رکھ چھوڑا ہے۔ یعنی وہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ درد والم ایجابی ہیں اور لذت و مسرت محض سلبی مسرت یا لذت ہمیشہ کسی خواہش کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے، خواہش یعنی احتیاج لذت سے پہلے پائی جاتی ہے۔ جوں ہی خواہش کی تشفی ہو جاتی ہے۔ لذت موقوف ہو جاتی ہے لہٰذا تشفی یا مسرت دراصل کسی احتیاج یا درد سے نجات یابی ہے۔ اس بنا پر کائنات کی انتہائی حقیقت کے قلب میں شر ہی شر پایا جاتا ہے۔ زندگی کا مایہ خمیر یہی شر ہے تمام چیزیں شر ہیں یعنی جو بھی چیز وجود رکھتی ہے وہ شر ہے۔ (۶)

ترا از خویشتن بیگانہ سازد — من آں آبے طرب ناکے ندارم
بباز آرم محو دیگر متاعے — چو گل جز سینۂ چاکے ندارم

۳۔ بلکہ خودی کا تحقق، کمال اور نشوونما ہے اور یہ تمام چیزیں شر یعنی مصیبت اور رنج والم سے حاصل ہوتی ہیں۔

از چنین صیدی مرا آزاد کن
طاعتِ دیروزۂ من یاد کن

(نالۂ ابلیس، صفحہ نمبر ۸۰۶)

"اے خُدا مجھے تو اس قسم کے شکار (انسان) سے نجات دلا تو میری گزشتہ یا پرانی اطاعت (عبادت) یاد کر۔"

بایں ہمہ خُدا پر یہ الزام عائد نہیں ہو سکتا کہ اس نے شر کو پیدا کر کے انسان کو مبتلائے آلام کر دیا کیوں کہ

۴۔ اصل فطرت اور مشیت الٰہی میں خیر و شر کچھ نہیں بلکہ عالم خارجی میں جب خُودی تسخیر فطرت میں مصروف عمل ہوتی ہے تو خیر و شر کا امتیاز پیدا ہوتا ہے:

کیوں کہ جو چیزیں تسخیر فطرت میں خُودی کی معاون ہوتی ہیں ان کو وہ خیر اور جو چیزیں مزاحم ہوتی ہیں ان کو شر سمجھتی ہے، اس لیے خُودی معیار خیر و شر ہے۔" (۷)

نمود جس کی فرازِ خُودی سے ہو وہ جمیل
جو ہو نشیب میں پیدا، قبیح و نا محبوب

۵۔ لیکن خیر و شر کا یہ امتیاز عقل سے ہوتا ہے۔ امام رازی نے لکھا ہے کہ اشاعرہ کے اصول کے مطابق خیر و شر کا مسئلہ پیدا ہی نہیں ہوتا کیوں کہ ان کے نزدیک عقلاً کوئی چیز نہ بری ہے نہ بھلی۔ شریعت جس چیز کو اچھا کہہ دیتی ہے وہ اچھی اور جس چیز کو برا کہہ دیتی ہے وہ بری ہو جاتی ہے لیکن معتزلہ حسن و قبیح کے قائل ہیں یعنی ان کے نزدیک خود عقل نیک و بد کا امتیاز کرتی ہے اس لیے ان کے نزدیک عقلاً خیر و شر کا وجود ہے اور ڈاکٹر صاحب نے بھی معتزلہ کی رائے اختیار کی ہے چناں چہ خُدا کو مخاطب کر کے کہتے ہیں:

غلامم جز رضای تو نجویم — جز آن راہے کہ فرمودی نہ پویم
و لیکن گر بہ این نادان بگوئی — خری را اسب تازی گو، نگویم

۶۔ دنیا میں اصل وجود شر کا ہے اور اسی شر کے ازالہ کا نام خیر ہے یعنی شر وجودی اور خیر سلبی چیز ہے:

مرغے ز آشیانہ بہ سیرِ چمن پرید
خاری ز شاخِ گل بہ تنِ نازکش خلید

(۸)

ہے۔شوپنہار بھی لذت وراحت کا منکر نہیں مگر وہ آنی جانی چیز ہے۔قیام و بقا صرف شر کو ہے۔

سحر می گفت بلبل باغبان را
دریں گل جز نہال غم نگیرد

اس لیے زودفنا لذت ومسرت اس کے نزدیک اس عالمگیر، قائم وثابت فطرتی شر کا بدل نہیں ہوسکتی اوراس سے نجات کا ذریعہ صرف یہ ہے کہ اس میدان ہی سے پاؤں ہٹا لیا جائے۔''(۹)

''تاہم علامہ اقبالؒ نے اس قدر پیش رفت کی ہے وہ جبر اور قدر کے روایتی تصور کی بجائے انسان کے لیے آزادی اور اختیار کے لامحدود امکانات کے قائل ہیں جو خُدا اور انسان کے اندر رکھے ہیں وہ مجبور محض نہیں بلکہ لامحدود اور کھلے امکانات میں سے چناؤ یا انتخاب وہ کرتا ہے اقبال کے نزدیک وہی اس کی تقدیر ہے۔''(۱۰)

''اقبالؒ کا ابلیس صرف مرکزِ شر ہی نہیں ہے بلکہ اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔اقبال کا ابلیس ایک باعمل شخصیت ہے جو قوت محرکہ سے لبریز ہے۔برف میں دھنسا ہوا بدی کا مجسمہ نہیں بلکہ سراپا شعلہ ہے، شعلہ جو روشنی گرمی اور حرکت کی علامت ہے۔''(۱۱)

اقبالؒ نے اپنے کلام میں ابلیس کا ہمہ جہت تصور پیش کیا ہے۔اس کے کئی روپ اور کئی اسلوب ہیں۔کبھی وہ تخلیق انسان کے آفاقی ڈرامے کا بدنصیب ہیرو نظر آتا ہے جس میں بدی کا عنصر غالب ہے۔یہی بدی انسانی فطرت کا اک جزو لاینفک بھی ہے، یہی بدی حرکت وعمل پر بھی اکساتی ہے۔

ڈاکٹر عابد حسین کا کہنا ہے:

''شیطان اصل میں عشرت حیات اور قوت کی رُوح کا جزو ہے اس کا کام یہ ہے کہ انسان کے دل میں عمل کا ولولہ پیدا کرے مگر چوں کہ اس کی خلقت ناقص ہے اس لیے وہ اعتدال سے گزر جاتا ہے۔''(۱۲)

''اقبالؒ کے تصورِ ابلیس'' کے باب میں خلیفہ عبدالحکیم نے ''فکرِ اقبال'' میں لکھا ہے۔

''اقبالؒ کے ہاں ابلیس کا تصور اس کے فلسفہ خُودی کا ایک جزو لاینفک ہے۔خُودی کی ماہیت میں ذات الٰہی سے فراق اور سعی قرب و وصال دونوں داخل ہیں۔اقبالؒ کے فلسفہ خُودی کی جان اس کا نظریہ عشق ہے، عشق کی ماہیت، آرزو، جستجو اور اضطراب ہے۔اگر زندگی میں موانع موجود نہ ہوں تو وہ خیر کوشی بھی ختم ہو جائے جس کی بدولت خُودی میں بیداری اور اُستواری پیدا ہوتی ہے۔اگر انسان کے اندر باطنی کشاکش نہ ہوتو زندگی منجمد ہو کر رہ جائے، اقبالؒ نے شیطان کی خُودی کو بھی زور وشور سے پیش کیا ہے اور کئی اشعار میں شیطان کی

تذلیل کی بجائے اس کی تکریم کا پہلو غالب نظر آتا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اقبال جدوجہد کا مبلغ ہے اور جدوجہد باطنی اور خارجی مزاحمتوں کے بغیر نہیں ہوسکتی۔''(۱۳)

فطرت او خام و عزمِ او ضعیف
تابِ یک ضربم نیارد این حریف
(نالہ ابلیس، ص:۸۰۷)

مجھے ایسے بندے کی ضرورت ہے جو صاحب نظر ہو جو برے اور بھلے کی پہچان رکھتا ہو، مجھے تو ایسا مدمقابل چاہیے جو بڑا مضبوط ہو (جو میرا حکم نہ مانے بلکہ میرا مقابلہ کرے)، اس انسان کی سرشت خام ہے اور اس کا عزم (ارادہ) کمزور ہے۔یہ مدمقابل میری ایک چوٹ کو بھی برداشت نہیں کرسکتا۔

علامہ اقبالؒ نظم ''نالہ ابلیس'' میں ''تصور خیر وشر'' کا جائزہ لیتے ہیں:

''اے نیکی و بدی کے خالق! آدم کی صحبت نے مجھے خراب کیا، اس نے کبھی میری حکم عدولی نہیں کی۔اپنی آنکھیں بند کرلیں اور خود کو نہ پہچانا۔اس کی خاک ذوق انکار نہیں رکھتی۔وہ اپنی فضیلت کے شعلہ سے بے خبر ہے۔وہ ایسا شکار ہے جو شکاری کو خود دعوت دے کہ مجھے شکار کر۔ایسے فرمانبردار بندے سے خُدا کی پناہ! اے خُدا! میری پرانی اطاعت و خدمت کو یاد کرتے ہوئے مجھے ایسے آسان شکار سے آزادی دلا۔افسوس صد افسوس! اس نے میری بلند ہمت کو پست کر دیا۔اس کی فطرت خام اور ارادہ کمزور ہے۔وہ ایسا حریف ہے کہ میری ایک ضرب بھی نہیں سہہ سکتا۔میرے مقابلے کے لیے کسی بندہ صاحب نظر کی ضرورت ہے جو اس کمزور و ملائم ہستی سے زیادہ پختہ ہو۔اس مٹی اور پانی کے کھلونے کو مجھ سے واپس لے لے۔میرے جیسا بوڑھا بچوں کے کھیل کھیلنے سے قاصر ہے۔ابن آدم آخر کیا ہے؟ تنکوں کی ایک مٹھی! اس تنکوں کی مٹھی کو جلانے کے لیے تو میری ایک ہی چنگاری کافی ہے۔اگر اس عالم میں تنکوں کے علاوہ اور کچھ نہ تھا تو مجھے اتنی زیادہ آگ سے نوازنے کا کیا فائدہ؟ شیشہ کو پگھلانا تو میرے لیے شرم کی بات ہے البتہ پتھر کو پگھلانا واقعی کوئی کام کہا جاسکتا ہے۔میں آدم پر اپنی فتوحات سے اتنا تنگ آ چکا ہوں کہ انصاف کی خاطر اب تیرے سامنے حاضر ہوں۔میری استدعا ہے کہ ایسے بندۂ خُدا کی طرف جانے کے لیے میری رہنمائی کر جو میرا منکر ہو۔ایسا بندہ جو میری گردن مروڑے اور جس کی نگاہ سے میرے جسم میں لرزہ طاری ہو جائے، جو مجھ سے کہے دور ہو جا میرے سامنے سے۔جس کے روبرو میری حیثیت جو کے دانوں کے برابر بھی نہ ہو۔اے خُداوند! مجھے ایک زندہ مردِ حق پرست حریف کے طور پر عطا کرتا کہ میں بھی شکست کھانے کی لذت حاصل کرسکوں۔''(۱۴)

آں کہ گوید، "از حضور من برو"
آں کہ پیشِ او نیرزم با دو جو

(جاوید نامہ، نالہ ابلیس، ۸۰۷)

اے خُدا یک زندہ مردِ حق پرست
لذتے شاید کہ یابم در شکست!

(جاوید نامہ، نالہ ابلیس، ۸۰۷)

پروفیسر ڈاکٹر این میری شمل اپنی تصنیف ''شہپر جبریل'' میں رقم طراز ہیں:

''اقبالؒ نے ایک دردناک 'نالہ ابلیس' لکھا ہے۔ ابلیس فریاد کرتا ہے کہ وہ مثبت نتائج کے بغیر اولادِ آدم سے مبارزہ کر رہا ہے، انسان جلد اس کے الفاظ کو صحیح ماننے لگا ہے اور ابلیس کی تکذیب کرنا اس نے ترک کر دیا ہے، اس طرح ابلیس عملاً بے مبارزہ زندگی گزار رہا ہے۔''

''نالہ ابلیس'' میں شر انگیزی اور سازشیں ابلیس کے خاصے بتائے گئے ہیں، مگر اقبالؒ کے ہاں یہ شرارتیں منفی نہیں۔

زندگیٔ سوز و ساز بہ ز سکونِ دوام
فاختہ شاہین شود از تپشِ زیرِ دام

(۱۵)

اقبالؒ عالم انسانی کو توجہ دلاتے ہیں کہ وہ شیطانی حربے سے ہوشیار رہیں۔ قرآن مجید کی آخری سورۃ میں خاکی اور ناری شیاطین کا ذکر آیا ہے جس کا مدعا یہ ہے کہ ابلیس کے نقش قدم پر چلنے والے ایسے انسان بھی ہیں جو اس کی طرح دوسرے انسانوں کو بھی گمراہ کرتے ہیں۔ اقبالؒ نے 'ارمغان حجاز' میں ابلیسانِ خاکی اور ابلیسانِ ناری کے زیرِ عنوان بڑے معنی خیز نکتے پیدا کیے ہیں ضرب کلیم میں سیاست افرنگ کے عنوان سے ایک قطعہ ہے۔

تری حریف ہے یا رب سیاستِ افرنگ — مگر ہیں اس کے پُجاری فقط امیر و رئیس
بنایا ایک ہی ابلیس آگ سے تو نے — بنائے خاک سے اس نے دو صد ہزار ابلیس!

(ضرب کلیم، سیاست افرنگ، ص: ۱۲۱)

اقبالؒ مسلمانوں کو بالخصوص یہ پیغام دیتے ہیں کہ وہ خیر کے معاون بنیں اور شر کو نیچا دکھانے کی کوشش کریں۔ جاوید نامہ میں 'نالۂ ابلیس' اقبالؒ کی ایک لازوال نظم ہے اس میں شیطان خُدا کے حضور فریاد کرتا

ہے کہ اسے موجود عصر میں کمزور انسانوں سے پالا پڑا ہوا ہے، وہ اسے کوئی دعوت مبارزہ نہیں دیتے بلکہ اس کی ہر بات بے چون و چرا مان لیتے ہیں۔

ابلیس فریاد کرتا ہے کہ اس بے مقابلہ زندگی سے اس کی ہمت پست ہوتی جا رہی ہے لہٰذا اس کے مقابلے کے لیے صاحبانِ خُودی افراد میدان میں بھیجے جائیں تاکہ وہ رزم و نبرد کی لذت سے بہرہ مند ہو سکے۔ اس طرح اقبالؒ دراصل موجودہ عصر کے انسانوں کو غیرت دلاتے ہیں کہ وہ ابلیسی قوتوں کے خلاف سینہ سپر ہو جائیں کہ خیر کی بالادستی ہو اور شر کمزوری کے گڑھوں میں منہ چھپانے لگے۔

تا نخیزد بانگِ حق از عالمی
گر مسلمانی نیاسائی دمی

اقبالؒ نے جب مسئلہ شر کی طرف غور و فکر کیا تو اپنے ڈاکٹریٹ کے مقالے'' ایران میں مابعد الطبیعات کا ارتقا'' میں لکھا تھا کہ:

''ظلمت میں جو فطرت کی نسائی قوت ہے شر کے عناصر پوشیدہ تھے اور رفتہ رفتہ مرتکز ہو گئے اس سے وہ قبیح صورت والا شیطان وجود میں آیا جس کو قوت فعلیت سے موسوم کرتے ہیں۔۔۔۔۔ مانی ہی وہ پہلا شخص ہے جس نے اس امر کی طرف نہایت بے باکی سے اشارہ کیا کہ کائنات شیطان کی فعلیت کا نتیجہ ہے اور اس لیے شر اس کے مایہ خمیر میں ہے۔''(۱۶)

شیشہ را بگداختن عاری بود
سنگ را، بگداختن کاری بود!

(نالہ ابلیس، ص: ۸۰۶، ۸۰۷)

''شیشے کو پگھلانا آگ کے لیے شرم کی بات ہے، (البتہ) پتھر کو پگھلانا تو کچھ کام ہے۔''

''اقبال عالم انسانی کو خیر و شر کے حوالے سے توجہ دلاتے ہیں کہ وہ شیطانی حربے سے ہوشیار رہیں۔ علامہ اقبالؒ نے ارمغان حجاز میں ابلیسان خاکی اور ابلیسان ناری کے زیر عنوان بڑے معنی خیز نکتے بیان کیے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ عصر حاضر کے شیاطین خاکی کے خلاف ابلیس ناری کے مقابلے میں زیادہ سرگرمی دکھانے کی ضرورت ہے کیوں کہ ابلیس کے نقش قدم پر چلنے والے یہ انسان جنھیں شیاطین خاکی کیا گیا ہے زیادہ خطرناک ہیں۔''(۱۷)

عام مومنوں کا یہ حال ہے کہ وہ شیطان سے پناہ مانگتے ہیں لیکن یہاں شیطان انسان سے بیزاری کا

اظہار کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ ایسے صید زبوں کی صیادی سے مجھے نجات مل جائے ایسے انسانوں کا شکار کرنا یوں ہی جھک مارنا ہے۔ عام عقیدہ یہ ہے کہ آدمی کو شیطان نے خراب کیا مگر یہاں شیطان اعوذ باللہ من الانسان کہہ رہا ہے کہ یہ خُودی ناشناس انسان بے چوں و چرا میری حکم برداری پر تیار رہتا ہے، ذرا مقابلہ کرے تو مجھے زور آزمائی کا موقع ملے۔

ای خُداوند صواب و نا صواب — من شدم از صحبت آدم خراب
ہیچ گہ از حکم من سر بر نتافت — چشم از خود بست وخود را در نیافت

(۱۸)

از چنیں صیدی مرا آزاد کن — طاعتِ دیروزہ من یاد کن
پست ازو آن ہمت والای من — وای من، ای وای من، ای دای من!

(نالۂ ابلیس، صفحہ نمبر ۸۰۶)

''کوئی صاحب نظر حریف پختہ ہوتو اس سے کشتی لڑنے میں مزہ بھی آئے۔ یہ موجودہ انسان کیا ہیں؟ مٹی کے کھلونے ہیں اور میں ہوں مرد پیر۔ بھلا کسی بڑھے کو یہ زیب دیتا ہے کہ مٹی کے کھلونوں سے کھیلا کرے۔ یہ آدم تو ایک مشت خس رہ گیا ہے جس کے لیے ایک چنگاری کافی ہے، میرے اندر جو عالم سوز آگ ہے، مجھے اتنی آگ تو نے کاہے کو دے رکھی ہے، اس کا تو کوئی مصرف نظر نہیں آتا، کوئی ایسا پہلوان نکال جو میری گردن مروڑ سکے اور جس کی ایک نگاہ ہی سے لرزہ براندام ہوجاؤں۔ جو مجھے دیکھتے ہی سرِتسلیم خم کرنے کے بجائے پکار اٹھے کہ دور ہو یہاں سے اور جس کے نزدیک میری قیمت دو جو کے برابر نہ ہو۔ ایسا مردحق اگر مجھے پچھاڑ دے تو اس شکست میں وہ لذت محسوس ہو جو میرے بندہ فرمان کی اطاعت گزاری سے مجھے حاصل نہیں ہوتی۔''(۱۹)

اقبالؒ کی اپنی رائے ہے اور یہ رائے اس کے نصب العین کی بلندی کی وجہ سے ہے۔ ورنہ انسان ہمیشہ زیادہ تر ایسے ہی تھے اور ایسے ہی رہیں گے۔ مختلف ادوار میں اچھوں اور بروں کے تناسب میں فرق پڑتا رہتا ہے، کبھی اچھوں کی تعداد بڑھ جاتی ہے اور کبھی بروں کی کثرت ہوجاتی ہے اور قوموں کا عروج وزوال اسی سے متعین ہوتا ہے لیکن نصب العینی انسان دنیا میں کتنے ہوئے اور کتنے ہوسکتے ہیں۔

''اقبال کے نزدیک زندگی خیروشر دونوں پر مشتمل ہے۔ ارتقائے حیات میں ایک حالت کی نفی سے دوسری حالت کا اثبات ہوتا ہے اور آگے بڑھتے ہوئے بھی اس اثبات کی نفی ہوجاتی ہے۔''(۲۰)

''نفس کے اندر اگر پیکار نہ ہوتو اس کی ترقی ممکن نہیں، زندگی خیروشر کی پیکار کا نام ہے۔ شر نفی اور

انکار کے مُترادف ہے اور یہی صفت ابلیس کے تصور میں متشخص ہوگئی ہے لیکن خالی نفی اور انکار کے لزوم کا تعلق ہے اور جس حد تک اقبالؒ اس کو معاون حیات سمجھتا ہے اس حد تک انکارِ مجسم ابلیس کی زبان سے بھی حکیمانہ کلمات نکلواتا ہے لیکن ابلیس کی خُودی محض ایک سلبی خُودی ہے۔ اس میں ایجابی پہلو کا فقدان ہے۔ ابلیس کے تصور میں بھی ایسے صفات موجود ہیں جو قلب ماہیت سے خُودی کی تکمیل میں معاون ہوسکتے ہیں اور ابلیس کی ستائش گری انہی صفات کی وجہ سے ہے جن میں زندگی کا ارتقا مضمر ہے اور ان صفات کے فقدان سے زندگی تکمیل کو نہیں پہنچ سکتی۔''(۲۱)

''انسان کے لیے شر کی ماہیت کو سمجھنا اور ہستی میں اس کا مقام متعین کرنا ایسا ضروری ہے جیسا کہ خیر کی ماہیت کو سمجھنا، کیوں کہ خیروشر باہمی تقابل ہی سے سمجھ میں آسکتے ہیں۔ شرق وغرب میں بعض اکابر صوفیہ، حکما اور شعرا نے ابلیس کو ایک زبردست المیہ کردار بنادیا۔۔۔۔۔۔۔۔ شیطان زندگی کے مراحل میں اس وقت غالب معلوم ہوتا جب انسان نفی کی منزل میں رک جائے اور آگے اثبات کی طرف اس کے قدم نہ اٹھ سکیں۔ اگر نفی کا عنصر بھی انسان کے لیے اثبات سے کم اہمیت نہیں رکھتا تو اس سے گریز ناممکن بلکہ ناواجب ہے۔ زندگی میں کوئی اچھا کام بھی جذبات کے بغیر نہیں ہوسکتا۔''(۲۲)

''دنیا خیروشر کی ایک رزم گاہ ہے اور ڈاکٹر صاحب اس رَزم گاہ سے پاؤں پیچھے نہیں ہٹاتے بلکہ اسی جنگ کو زندگی سمجھتے ہیں۔(۲۳)

لیکن جنگ کے لیے طاقت کی ضرورت ہے اور نطشے کے خیال میں طاقت ہی خیروشر کا معیار ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے نزدیک اگرچہ خیروشر کا معیار قوت نہیں بلکہ خُودی ہے جو قوت سے زیادہ وسیع اور عام چیز ہے تاہم وہ بھی زندگی کے لیے جسمانی قوت کو ضروری سمجھتے ہیں۔(۲۴)

چمن خوشست ولیکن چو غنچہ نتوان زیست — قبای زندگیش از دم صبا چاک است
بخود خریدہ و محکم چو کوہساران زی — چو خس مزی کہ ہوا تیز وشعلہ بے باک است

(۲۵)

اقبال دنیا کو نہ مطلق خیر سمجھتے ہیں اور نہ کلیتاً شر، خیروشر دونوں ان کے نزدیک زندگی کی ناقابل انکار حقیقتیں ہیں۔ ان کے نزدیک شیطان کے بغیر یا شر کے بغیر انسان اور نیکی نہیں پنپ سکتے اور انسانی شخصیت کی کامل نشوونما نہیں ہوسکتی۔

علامہ اقبالؒ انسان کو طاقتور اور نیک دیکھنا چاہتے ہیں۔ ان کا پیغام ہے کہ انسان ظاہری و باطنی

قوت حاصل کرے اور اسی طرح معاشرے بھی طاقتور رہوں۔وہ مزید کہتے ہیں کہ آزادی، اچھائی کے لیے بنیادی شرط ہے۔سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس قوت کے حصول اور استعمال میں کیا اصول کارفرما ہونا چاہیے۔علامہ اقبالؒ بنیادی اصول کی طرف ہماری رہنمائی کرتے ہیں اور وہ احترام آدمیت کا اصول ہے، جب انسان ایک دوسرے کے حقوق العباد کا خاص خیال رکھیں گے اور وہ بقائے باہمی پر یقین وعمل کر کے ایک عالمگیر برادری کی حیثیت سے آگے بڑھیں گے تو وہ خیر (نیکی) کے راستوں پر چل رہے ہوں گے۔انسانی اُخوت اور احترامِ انسان کے اصولوں پر عمل کر کے ابلیس کو شکست دی جاسکتی ہے اور ان اصولوں ہی میں انسانیت کی بھلائی اور بقا ہے۔

حواشی

۱۔محمد ریاض،ڈاکٹر،جاوید نامہ(لاہور:اقبال اکادمی پاکستان،۱۹۸۸ء)ص:۱۳۷

۲۔حمیداللہ شاہ ہاشمی، پروفیسر،کلیات اقبال فارسی (لاہور: مکتبۂ دانیال، ۲۰۰۷ء)ص:۸۰۶،۸۰۷

۳۔محمد ریاض،ڈاکٹر،جاوید نامہ(لاہور:اقبال اکادمی پاکستان،۱۹۸۸ء)ص:۱۳۸

۴۔خالدہ جمیل،مباحث اقبال (لاہور:اپنا ادارہ، ۲۰۰۴ء)ص:۸۳

۵۔جاوید اقبال،ڈاکٹر،افکار اقبال (لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۵ء)ص:۸۷

۶۔عبدالسلام ندوی،اقبال کامل (لاہور:الفیصل ناشران،فروری،۲۰۰۸ء)ص:۲۴۴ تا ۲۴۶

۷۔عبدالسلام ندوی،اقبال کامل (لاہور:الفیصل ناشران،فروری،۲۰۰۸ء)ص:۲۴۷

۸۔عبدالسلام ندوی،اقبال کامل (لاہور:الفیصل ناشران،فروری،۲۰۰۸ء)ص:۲۴۷۔۲۴۸

۹۔عبدالسلام ندوی،اقبال کامل (لاہور:الفیصل ناشران،فروری،۲۰۰۸ء)ص:۲۴۸

۱۰۔وحید عشرت،ڈاکٹر،فکریات اقبال (لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۹ء)ص:۳۲۸

۱۱۔نغمہ زیدی،سیّدہ، پروفیسر،مطالعہ افکار اقبال (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۱۰ء)ص:۱۳۷

۱۲۔نغمہ زیدی،سیّدہ، پروفیسر،مطالعہ افکار اقبال (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۱۰ء)ص:۱۳۸

۱۳۔عبدالحکیم،خلیفہ،فکر اقبال (لاہور: بزم اقبال، اپریل ۲۰۱۳ء)ص:۴۵۰

۱۴۔جاوید نامہ اقبال (آسمانی ڈرامے کی ہیت میں) جاوید اقبال،ڈاکٹر(لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۱۴ء)ص:۱۰۱

۱۵۔این میری شمل، ڈاکٹر،شہپر جبریل،مترجم،محمد ریاض،ڈاکٹر (لاہور:گلوب پبلشرز، ۱۹۸۵ء)ص:۲۶۱

۱۶۔خالدہ جمیل،مباحث اقبال (لاہور:اپنا ادارہ، ۲۰۰۴ء)ص:۸۳، ۸۴

۱۷۔خالدہ جمیل،مباحث اقبال (لاہور:اپنا ادارہ، ۲۰۰۴ء)ص:۸۶

۱۸۔عبدالحکیم،خلیفہ،فکر اقبال (لاہور: بزم اقبال، اپریل ۲۰۱۳ء)ص:۴۶۰

۱۹۔عبدالحکیم،خلیفہ،فکر اقبال (لاہور: بزم اقبال، اپریل ۲۰۱۳ء)ص:۴۶۰

۲۰۔عبدالحکیم،خلیفہ،فکر اقبال (لاہور: بزم اقبال، اپریل ۲۰۱۳ء)ص:۴۶۳

۲۱۔عبدالحکیم،خلیفہ،فکر اقبال (لاہور: بزم اقبال، اپریل ۲۰۱۳ء)ص:۴۶۳

۲۲۔عبدالحکیم،خلیفہ،فکر اقبال (لاہور: بزم اقبال، اپریل ۲۰۱۳ء)ص:۴۵۰

۲۳۔عبدالسلام ندوی،اقبال کامل (لاہور:الفیصل ناشران،فروری،۲۰۰۸ء)ص:۲۴۹

۲۴۔عبدالسلام ندوی،اقبال کامل (لاہور:الفیصل ناشران،فروری،۲۰۰۸ء)ص:۲۵۰

۲۵۔عبدالسلام ندوی،اقبال کامل (لاہور:الفیصل ناشران،فروری،۲۰۰۸ء)ص:۲۵۰

علامہ اقبالؒ اور تصورِ زمان ومکاں

''زماں'' یعنی وقت اور ''مکاں'' سے مراد خلا میں کسی مادی شے کے مقام کا تعین کرنا۔۔۔ جہاں تک ''زماں'' کا تعلق ہے ہم سب کو وقت کے گزرنے کا احساس ایک جیسا ہے یعنی واقعات ایک ایسی ترتیب کے ساتھ رونما ہوتے ہیں جنھیں ہم پہلے اور بعد کے الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں اور دو واقعات میں درمیانی وقت اگر بغیر کسی واقعہ کے گزرے تو ہم اسے خالی وقفہ کہتے ہیں اس اعتبار سے وقت عرف عام میں ایک خارجی شے ہے جس کے گزرنے کا احساس انسان کے ذہن میں اس طرح ہوتا ہے جیسے کوئی دریا بہتا چلا جاتا ہے۔''(۱)

''مکاں'' کے متعلق ہمارا احساس قدرے مختلف ہے۔ خلا میں موجود اشیا کے محل وقوع کا تعین آنکھ سے کیا جاتا ہے اور اس میں سمت کا بڑا دخل ہے کیوں کہ اگر ہم اپنی جگہ سے ہٹ جائیں تو سمت بھی بدل جائے گی اور دو اشیا جو پہلے ایک ہی سمت میں نظر آتی تھیں۔ اب مختلف سمتوں میں نظر آنے لگیں گی اور ان کے درمیان خالی فاصلہ ہوگا لہٰذا کہا جا سکتا ہے کہ خلا میں کسی شے کے مقام کا تعین کرنا خارجی نہیں بلکہ ذاتی ہے۔''(۲)

علامہ اقبالؒ نے اپنے کلام، خطبات اور دوسری تحریروں میں جن بنیادی مسئلوں پر غور وفکر کیا ہے، ان میں زمان ومکاں کا سائنسی اور فلسفیانہ مسئلہ بھی شامل ہے جو ان کے زیرِ نظر بہت زیادہ رہا ہے حتیٰ کہ خطبات کا بیشتر حصہ محض اسی مسئلے کی توضیح وتشریح اور اس کے اطلاقات پر مشتمل ہے۔ اس کی روشنی میں انھوں نے مذہب اور الٰہیات کے مختلف اصولوں پر غائر نظر ڈالی ہے، ان کا خیال یہ ہے کہ زمان ومکاں کا مسئلہ مسلمانوں کے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔

چناں چہ فرماتے ہیں:

''دوسری طرف اسلامی تہذیب کی تاریخ کے مطالعے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ خالص ذہنی مسائل ہوں یا مذہبی نفسیات یعنی اعلیٰ تصوّف کے مسائل ہوں، سب کا نصب العین اور مقصود یہی ہے کہ لامحدود کو محدود کے اندر سمو لیا جائے۔ ظاہر ہے کہ جس تہذیب کا یہ مطمحِ نظر ہو اس میں زمان ومکان کا سوال درحقیقت زندگی اور موت کا سوال ہے۔''(۳)

زمان ومکان اور علیت کے مسئلے اقبالؒ کی نظر میں بنیادی اور اہم مسئلے ہیں اور بغیر ان کی الٰہیات کی تشکیل نہیں کی جا سکتی۔

چناں چہ لکھتے ہیں:

''قرونِ وسطیٰ سے لے کر موجودہ زمانے تک انسانی تخیل اور تجربے نے ناقابل بیان ترقی کی ہے۔ نیچر پر انسان کا تسلط اور اقتدار بہت بڑھ گیا ہے، اس تسلط نے انسان میں ایک نئی رُوح پھونک دی ہے اور اس امر کا ایقان پیدا کر دیا ہے کہ وہ کائنات میں ممتاز حیثیت رکھتا ہے اور درحقیقت اشرف المخلوقات ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زمان ومکاں اور علیت کے بارے میں انسانی ذہن بہت آگے نکل گیا ہے۔ سائنس کی جدید ترقیوں نے ہماری ذہنی صلاحیتوں میں تدریجی طور پر ایک انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ آئن سٹائن کے نظریۂ اضافیت نے کائنات کے ایک جدید تخیل کو ہمارے سامنے پیش کر دیا ہے اور ہمیں اس قابل بنا دیا ہے کہ ہم فلسفے اور مذہب کے اکثر اہم مسئلوں کو ان جدید تصوروں کی روشنی میں دیکھیں اور ان کی مدد سے حل کریں۔''(۴)

''اسلام نے زمان کو حقیقی مانا ہے۔ اقبالؒ بھی اسے حقیقی تصور کرتے ہیں، اگرچہ طبیعی زمان، مکاں جس میں انسانی عقل چکر لگاتی ہے، اصل حقیقت نہیں۔'' چناں چہ وہ کہتے ہیں:

خرد ہوئی ہے زمان و مکاں کی زُنّاری
نہ ہے زماں نہ مکاں، لَا اِلٰہ اِلَّا اللہ

(کلیاتِ اقبال (اُردو) ضرب کلیم، صفحہ نمبر: ۵۶۸)

ہستی و نیستی از دیدن و نا دیدن من!
چہ زمان و چہ مکان شوخیِ افکار من است

(کلیاتِ اقبال (فارسی) زبورِ عجم، صفحہ نمبر: ۴۹۸)

اقبالؒ فرماتے ہیں کائنات کا وجود میرے دیکھنے یا نہ دیکھنے پر منحصر ہے۔ زمان ومکان میرے افکار

کی قُدرت کا نتیجہ ہیں۔ یعنی میں نے فکر اور سوچ کے ذریعے یہ تصورات اپنائے ہیں ورنہ حقیقت کچھ اور ہے؟

وہ زندگی کو زمان میں ایک مسلسل حرکت سمجھتے ہیں۔ ان کا ایقان ہے کہ انسان اپنے جسم اور رُوح کے ساتھ مل کر ایک ہی وحدت ہے اور یہ تصور غلط ہے کہ انسان کو دو مختلف حقیقتوں میں بانٹا جا سکتا ہے جو اگرچہ ایک نقطے پر باہم ملتے ہیں لیکن دراصل ایک دوسرے کے متضاد ہیں۔ سچ یہ ہے کہ مادہ اور رُوح ایک دوسرے سے مختلف نہیں ہیں، اقبالؒ کے اس قول پر اچنبھا نہیں ہونا چاہیے کہ:

''جس وحدت کو انسان کے نام سے پکارا جاتا ہے وہ جسم ہے اگر ہم خارجی دنیا میں اس کی افعال پر نظر رکھیں اور رُوح ہے اگر اس کے انجام اور کام کی غایت یا نصب العین کا لحاظ رکھیں۔ اگر ہم علامہ اقبالؒ کی شاعری پر نظر ڈالیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ کئی نفیس اور مؤثر نظموں میں انھوں نے زمان و مکاں کی حقیقت کو واضح کیا ہے۔ چناں چہ بالِ جبریل کے اشعار میں وہ بتاتے ہیں کہ زندگی زمان کے مسلسل تغیر و حرکت کا دُوسرا نام ہے۔

سلسلۂ روز و شب، نقش گرِ حادثات ۔۔۔ سلسلۂ روز و شب، اصلِ حیات و ممات
سلسلۂ روز و شب تارِ حریرِ دو رنگ ۔۔۔ جس سے بناتی ہے ذات اپنی قبائے صفات
سلسلۂ روز و شب، سازِ ازل کی فغاں ۔۔۔ جس سے دکھاتی ہے ذات زیر و بمِ ممکنات
تیرے شب و روز کی اور حقیقت ہے کیا ۔۔۔ ایک زمانے کی رو جس میں نہ دن ہے نہ رات

(۶)

''جاوید نامہ'' میں زمان و مکاں کا فرشتہ زروان اقبال پر یہ حقیقت واضح کرتا ہے کہ انسانی تدبیر زمان کی تقدیر کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے۔ زندگی، موت اور حشر سب زمان ہی کی حرکتیں ہیں۔ انسان، فرشتے اور کائنات سب زمان میں واقع ہوئے ہیں، زمان حقیقت آخری کا ضروری جزو ہے۔''(۷)

بالِ جبریل" میں بھی اقبال نے ''زمانہ'' کے عنوان سے ایک نظم لکھی ہے جس میں وقت اپنی صفات کا اظہار خود اپنی زبان سے کرتا ہے۔ اس میں فاعل انا کی تسلسلی وقت کا بھی ذکر ہے کہ حوادث اور واقعات یکے بعد دیگرے ظہور پذیر ہوتے ہیں لیکن اصل زمان یہ تسلسلی وقت نہیں ہے بلکہ اصل زمان میں خود زندگی اور تقدیر مضمر ہیں، جس شخص کی نظر عارفانہ نہیں ہے وہ اصل زمان سے آگاہ نہیں ہو سکتا۔(۸)

جو تھا نہیں ہے، جو ہے نہ ہوگا، یہی ہے اک حرفِ محرمانہ!
قریب تر ہے نمود جس کی، اسی کا مشتاق ہے زمانہ!
مری صراحی سے قطرہ قطرہ نئے حوادث ٹپک رہے ہیں
میں اپنی تسبیحِ روز و شب کا شمار کرتا ہوں دانہ دانہ!

ہر ایک سے آشنا ہوں لیکن جدا جدا رسم و راہ میری
کسی کا راکب، کسی کا مرکب، کسی کو عبرت کا تازیانہ!
مرے خم و پیچ کو نجومی کی آنکھ پہچانتی نہیں ہے
ہدف سے بیگانہ تیر اس کا، نظر نہیں جس کی عارفانہ!

(۹)

''پیامِ مشرق'' میں ''نوائے وقت'' والی نظم اقبالؒ کے تصورِ زمان کو بہت اچھی طرح پیش کرتی ہے۔ طبیعاتی وقت جو زمان و مکان مسلسلہ کی ایک سمت ہے، اضافی ہے لیکن اصل زمان کو قرآن کریم نے وحدت اور کلیت قرار دے کر تقدیر کے نام سے موسوم فرمایا ہے۔ تقدیر محض زمان کا نام ہے جب اس کو امکانات کے ظہور سے پہلے دیکھا جائے، تقدیر محض زمان کا نام ہے جب کہ اس کو تواتر کے قید و بند سے آزاد کر دیا جائے۔ یہ وقت جو تقدیر ہے حقیقی ہے اور تمام اشیا کی جان ہے۔(۱۰)

اقبالؒ کے نزدیک ''حرکت فی نفسہٖ فطرت کا ایک نا قابل تقسیم عمل ہے۔ ہر حرکت خواہ وہ تیر کی پرواز ہو، زندگی کا ایک نا قابل تقسیم فعل ہوگا۔ کائنات کے اندر مظاہر کا عبور فی الزمان ہستی کی حقیقت تک پہنچنے کا وسیلہ ہے اور حقیقت مطلقہ زمان مطلق ہے جس کے اندر فکر و حیات و کائنات ایک دوسرے میں داخل اور پیوستہ ہیں لہٰذا زمانِ مطلق کا ادراک خُدا تعالیٰ کا عرفان ہے جو تربیتِ خُودی کے مراحل کا بنیادی عنصر ہے۔ انفرادی خُودی کے حوالے سے اس نوعیت کی وحدت، ہمیں ایسے نفس کے اندر ہی دکھائی دے سکتی ہے جو زندگی کے تمام کوائف پر محیط ہو اور جو انفرادی زندگی اور فکر کا سرچشمہ ہو۔''(۱۱)

''زمان فعالیتِ الٰہی کی ایک کیفیت ہے۔ خُودی سے انسان میں تسخیرِ کائنات کا شعور اور ولولہ پیدا ہوتا ہے اور فعالیتِ الٰہی اور اس ذاتِ باری کی خلاقی کی صفات سے مملو ہوتا ہے۔ زمان الٰہی مرور سے آزاد ہوتا ہے۔ اس سے انسان کو بھی بقائے دوام حاصل ہو سکتی ہے۔ جاوید نامہ میں یہی مضمون زروان یا رُوحِ مکاں کی زباں سے ادا کیا گیا ہے۔''(۱۲)

''انفرادی اور اجتماعی خُودی کے درمیان حرکیت اور قوت کے حوالے سے یہ تفریق کی جا سکتی ہے کہ انائے مطلق یا حقیقتِ اخریٰ زمانِ مسلسل نہیں بلکہ زمان خالص میں ہوتی ہے جہاں تبدیلی تغیر ارتقائے نقص سے کمال کی طرف نہیں ہوتا بلکہ وہاں تغیر کے معنی تکوّن مسلسل کے ہیں، جبکہ فرد خواہش کی پیروی میں کامیابی اور ناکامی کے نشیب و فراز میں رہتا ہے اور ایک حالت سے دوسری حالت میں سفر کرتا رہتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے

کہ فرد اپنی خُودی کے مدارج طے کرتا ہوا اس مرحلے پر پہنچ جائے کہ ناظر اور منظور ایک ہو جائیں اور ناظر منظور میں اپنی توجہ اس قدر جذب کرے کہ اس کا اپنا شعور باقی نہ رہے اور انائے مطلق کے زمان میں تدریج لمحات سے ناظر بھی ماورا ہو جائے لیکن ایسا اس صورت میں ممکن ہے کہ ناظر میں ادراک کی صلاحیت ہو اور دوسری طرف منظور ایسا ہو جو ناظر کی استعداد سے ادراک میں آنے کو قبول کرے۔'' (۱۳)

خُودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے
(کلیات اقبال (اُردو) بال جبریل، ص:۴۱۹)

''تمام کائناتی وقت سے آزاد ہو کر وہ اپنا دوران خالص تراشتا ہے اور اس سے سرور حاصل کرتا ہے۔ کائناتی وقت کو اقبالؒ مکانی سمجھتا ہے۔ اقبالؒ آگاہ کرتا ہے کہ ''اصلی وقت'' یا دوراں کو خط سے ممتاز کیا جائے جہاں دورانِ خالص کا سرور مردِ حُر کا امتیاز ہے وہاں مکانی زمان کی قید و بند، عبد یا محکوم کی نشانی ہے۔ مردِ حُر کی فعال خُودی ماضی، حال اور مستقبل کا احاطہ کرتی ہے اور اسی لیے دوران میں بسر کرتی ہے ایسا شخص ''لی مع اللہ وقت'' کہنے کی قدرت رکھتا ہے۔ روز و شب کا اسیر بات کہنے کا حوصلہ نہیں کر سکتا۔'' (۱۴)

زمان و مکاں کا فلسفہ علامہ اقبالؒ کے لیے خصوصی دلچسپی رکھتا ہے، لیکن وہ اس مسئلے کو صرف مغربی نقطہ نظر تک محدود نہیں رکھنا چاہتے تھے، ان کی خواہش تھی کہ اس سلسلے میں مسلم مفکرین نے جو خدمت انجام دی ہے انھیں مغرب میں روشناس کرایا جائے۔

سیّد سلیمان ندوی کو لکھتے ہیں:

''میں نے زمان و مکاں کے متعلق تھوڑا سا مطالعہ کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہندوستان کے مسلمانوں نے بڑے بڑے مسائل پر غور و فکر کیا ہے اور اس غور و فکر کی تاریخ لکھی جا سکتی ہے۔ یہ کام صرف آپ ہی کر سکتے ہیں، میرے خیال میں آپ کو چاہیے کہ اس کام کو اپنی زندگی کے اہم مقاصد میں شمار کریں۔ دراصل اقبال ہر فلسفے کو خُودی کے معیار پر پرکھتے ہیں، اس لیے جو چیز خُودی کو استحکام دیتی ہے وہ ان کے نزدیک مستحسن ہے۔''

اسرارِ خُودی کے دیباچہ میں کہتے ہیں: ''خُودی ایک حالت کشاکش کا نام ہے۔''

خُودی کی جلوتوں میں مصطفائی اور خلوتوں میں کبریائی دیکھنے والے انسان میں اضافیت کی پیدا کردہ بے دست و پائی نہیں رہتی، بلکہ وہ تو اجتماعی معاشرتی بقا و ارتقا میں بنیادی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔

خطبات میں اقبالؒ نے اس کا اظہار یوں کیا ہے:

''جس طرح کئی سیاروں کی باہمی کشش اور حرکت سے ایک نظامِ شمسی بنتا ہے اسی طرح افراد کے اجتماع اور باہمی تعاون سے ایک معاشرہ وجود میں آتا ہے اور ایک نامیاتی میکانی نظام کی تخلیق ہوتی ہے۔'' (۱۵)

''تمام حیات و کائنات توحید کا مظہر ہے، اس کی ماہیت نہ مادی ہے اور نہ نفسی۔ اس کی کنہ حیات ابدی ہے جو خلاق اور ارتقا کی کوشش ہے، مادہ اور نفس حیات کا مظاہر ہیں۔ زمان و مکاں کی بھی کوئی مستقل حقیقت نہیں، یہ خاص مراحل زندگی کے اپنے پیدا کردہ زاویہ نگاہ ہیں اور اس عالم میں ادراک ان سانچوں میں ڈھل جاتا ہے۔'' (۱۶)

''کوئی تغیر بغیر زماں کے ممکن نہیں ہے اگر زمانہ نہیں تو تغیر بھی نہیں، علاوہ ازیں کانٹ کے نزدیک زمان اور مکاں معروضی حقیقتیں نہیں ہیں، وہ حقیقت کا ادراک کرنے کے لیے صرف ہمارے شئون یا ہماری جہتیں (Aspects) ہیں۔۔۔ اقبالؒ کے خیال میں یہ واحد سطح نہیں ہے، کیوں کہ زمان و مکاں کا مفہوم و جود کے فرق مراتب سے بدلتا جاتا ہے۔ زمان و مکاں جامد، اٹل اور نہ بدلے جانے والے جہات نہیں ہیں۔'' (۱۷)

''ذات باری تعالیٰ ''سلسلہ روز و شب'' سے اپنی ''قبائے صفات'' ضرور بناتی ہے لیکن اقبال کا مرد مومن ''تخلقوا باخلاق اللہ'' ''یا یزداں بکمند آور'' پر عمل کر کے اپنی زور خُودی سے ''ابلق ایام'' کو اپنا مرکب بنا سکتا ہے، اگرچہ جدولی زمانہ کے مقابلے میں زمان خالص کا مسئلہ اقبالؒ کے لیے آخری وقت تک پیچیدہ رہا لیکن اس کا اصل پیغام عمل ہے کیوں کہ اس کے نزدیک خود عمل ہی سے اپنا اظہار کرتی ہے۔'' (۱۸)

''زمانِ مسلسل خُودی پر تبھی منفی اثر ڈالتا ہے جبکہ وہ اس نظام زمانی میں محصور ہو کر رہ جائے، مگر زمان خالص خُودی کی باطنی کیفیت ہے اور اگر خُودی کو زمانِ خالص کا احساس ہو جائے تو اسے حیات جاوداں کا سراغ مل سکتا ہے۔ خُودی کا آغاز اگرچہ زمانِ مسلسل میں ہوتا ہے لیکن اس کی بقا کا تعلق زمان خالص سے ہے، موت کے بعد واپس کرۂ ارض پر انسان کے لیے آنا اس لیے ممکن نہیں کہ جن منازل سے خُودی ایک بار گزر جاتی ہے وہ پھر کبھی واپس نہیں آتی۔'' (۱۹)

''اسلامی ثقافت کی تاریخ کے مطالعہ سے یہ بات عیاں ہے کہ اعلیٰ درجہ کے تصوّف نے جو نصب العین مسلمان کے سامنے رکھا ہے وہ یہ ہے کہ محدود انسان کسی طرح غیر محدود سے ہم آغوش ہو جائے اور جس ثقافت کا رجحان یہ ہو اس میں زمان و مکان کا مسئلہ دراصل زندگی اور موت کا سوال بن جاتا ہے۔''

اقبالؒ نے ایسے تمام نظریاتِ وقت کو باطل قرار دیا ہے جو انسان کو مجبور محض بنا دیں۔

''جب سب کچھ پہلے سے معین ہو تو اس میں آزادی اور اختیار کی کہاں گنجائش ہے، اس قسم کے جبر

میں نہ خُدا آزاد وخلاق رہتا ہے اور نہ انسان۔ اخلاق کی بنیاد اختیار پر ہے۔ اس کے مقدر معینہ میں انسان اپنے اعمال کا ذمہ دار بھلا کیسے ہو سکتا ہے اور اس تصور سے انسانی زندگی محض پتلیوں کا تماشا بن کر رہ جاتی ہے۔'' (۲۰)

''اقبالؒ کے نزدیک شعوری وجود سے مراد وہ زندگی ہے جو زمانے کے اندر گزاری جاتی ہے وہ کہتے ہیں کہ خُودی اپنی اندرونی زندگی میں مرکز سے باہر کی جانب حرکت کرتی ہے اور اقبالؒ نے اس کے دو پہلو بتائے ہیں ایک قدر آفریں خُودی (Appreciative Self) اور دوسرا پہلو ہے موثر خُودی (Effeicient Self) کا۔ موثر خُودی خارجی دنیائے مکانی سے واسطہ رکھتی ہے اور اس کا تعلق اس زمان سے ہے جس میں طوالت واختصار کا احساس موجود رہتا ہے جبکہ قدر آفریں خُودی کی نوعیت غیر منقسم ہوتی ہے اور اس میں زمانے کو اثر نہیں ہوتا۔ قدر آفریں خُودی کا زماں ایک آن واحد ہے جسے موثر خُودی خارجی دنیا میں مسلسل و منفرد آنات کے ایک سلسلے کی صورت میں پیش کرتی ہے جیسے ایک ڈوری میں پروئے ہوئے موتی۔'' (۲۱)

اقبالؒ نے اپنے اس تصور زمان میں استدلال پیش کرتے ہوئے قرآنی آیات کے حوالے دیے ہیں اور خاص کر اس آیت سے إِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنَاهُ بِقَدَرٍ وَمَا أَمْرُنَا إِلَّا وَاحِدَةٌ كَلَمْحٍ بِالْبَصَرِ۔
(سورۃ القمر: ۴۹-۵۰)

اپنے اس نظریہ کی تائید کی ہے جس کے مطابق تخلیق کا عمل پلک جھپکنے میں انجام پاتا ہے لیکن اسی کو باہر سے دیکھا جائے تو یہ ہزاروں سال پر پھیلا نظر آتا ہے، اس بات کو سمجھانے کے لیے ایک مثال دی ہے یعنی عالم طبعیات کے مطابق ہمارے سرخی کے احساس کی وجہ حرکت موجی کی تیزی ہے جس کا تعداد ایک سیکنڈ میں چار سو کھرب ہے اور اگر ہم خارجی طور پر اس بے انتہا تعداد کا شمار دو ہزار فی سیکنڈ کے حساب سے کریں تو اس کی گنتی کے لیے چھ ہزار سال سے زیادہ عرصہ لگے گا لیکن صورت حال یہ ہے کہ ہم کو ایک آن واحد میں سرخ رنگ کا احساس ہو جاتا ہے اور یہ بے انتہا تعداد امواج ایک ہی لحہ میں ہماری گرفت میں آجاتے ہیں۔

''تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ'' کے علاوہ اقبالؒ نے اپنے اشعار میں بیشتر مقامات پر اپنے اس تصور زمان و مکاں کو ترتیب خُودی کے حوالے سے بڑے خوب صورت پیرائے اور موثر انداز میں پیش کیا ہے۔

''جاوید نامہ'' میں زروان نے جو کہ روحِ زمان و مکان ہے انسان کو زمان کی حقیقت بتائی ہے اور اقبال نے تمثیلی انداز میں زمان کی تعریف کی ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ اگر کوئی شخص لی مع اللہ وقت لا یسعنی فیہ نبی مرسل وما ملک مقرب حدیث نبوی (مجھے اللہ کے ساتھ ایسا وقت حاصل ہے کہ اس انداز پر کوئی نبی مرسل اور نہ کوئی مقرب فرشتہ اس کے حضور میں بار پا سکتا ہے) کی حقیقت پالے اور زمان الٰہیہ میں زندگی بسر

کرنے لگے تو زمان مسلسل پر جس میں ہم اس عالم میں زندہ رہتے ہیں وہ غالب آ سکتا ہے۔ زمان و مکان پر غالب آنے کی اسی قوت تسخیر کائنات کا راز لی مع اللہ میں زندہ رہتے ہیں وہ غالب آ سکتا ہے۔ زمان و مکاں پر غالب آنے کی اسی قوت تسخیر کائنات کا راز لی مع اللہ میں پالینے کی تاکید اقبالؒ نے اسرار خُودی میں بھی کی ہے:

تا کجا در روز و شب باشی اسیر
رمز وقت از ''لی مع اللہ'' یادگیر
(۲۲)

(رات اور دن کے چکروں میں کب تک گرفتار رہو گے ایسا کرو کہ رسول اکرم ﷺ کی ذات والا صفات سے زمانِ خالص میں پہنچنے کا راز سیکھ لو)۔

''اقبالؒ کے نزدیک اگر انسان دوش وفردا کا اسیر ہو جائے تو زمان کا غلام بن جاتا ہے اور اس کی خُودی کبھی درجہ کمال پر نہیں پہنچتی لیکن اگر وہ اپنی قوت ارادی سے کائنات کو تسخیر کر کے زمان و مکاں کی قید سے آزاد ہو کر خُدائی وقت میں شامل ہو جائے تو اس کی خُودی مستحکم ہو جاتی ہے۔'' (۲۳)

اقبالؒ نے ''پیام مشرق'' میں اپنی نظم 'نوائے وقت'' میں زمانے اور وقت کی تعریف کے لیے بڑی دل کش شعری تراکیب استعمال کی ہیں اور انسان کو زمانے کا راکب بن جانے کا راز سکھایا ہے۔

''بال جبریل'' میں اپنی نظم ''زمانہ'' میں اقبال نے زمانے کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے۔

ہر ایک سے آشنا ہوں لیکن جدا جدا رسم و راہ میری
کسی کا راکب، کسی کا مرکب، کسی کو عبرت کا تازیانہ
(۲۴)

اقبالؒ کے نزدیک مسلمان زمان کا پابند نہیں ہے بلکہ وہ وقت کو تابع فرمان بنا لیتا ہے وہ فاتح کائنات ہے۔

مہر و مہ و انجم کا محاسب ہے قلندر
ایام کا مرکب نہیں راکب ہے قلندر

تکمیل خُودی اقبالؒ کی نظر میں اسی صورت میں ممکن ہے جب انسان زمان و مکاں کی حقیقت کو جان لے اور اس کی پابندیوں سے آزاد ہو کر اسے اپنے تصرف میں لے آئے۔ اقبالؒ تکمیل خُودی کے لیے تصورِ زمان کے ساتھ تصور مکاں کی اہمیت پر بھی زور دیتے ہیں کیوں کہ یہ زمان ہے جو تقدیر کو مکاں میں تدبیر کی صورت عطا

کرتا ہے اور اشیائے کائنات کی صورت گری کرتا ہے۔ اقبالؒ نے اسے اس طرح واضح کیا ہے:

وہی اصل مکان و لا مکاں ہے — مکاں کیا شے ہے انداز بیاں ہے
خرد کیونکر بتائے کیا بتائے — اگر ماہی کہے دریا کہاں ہے

(۲۶)

اقبال نے تشکیل جدید الٰہیات میں تصور مکان سے بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ نفس کا ایک پہلو اس کی مرکزی حیثیت ہے لیکن دوسرا پہلو خارج سے احساس و عمل کے ذریعے رابطہ قائم کرنا ہے اور اس عمل کے لیے عالمِ امکان کا ہونا ضروری ہے، دراصل یہ تصور مکاں ہے جو وقت کو مکانیت کے سانچے میں ڈھال دیتا ہے اور زمان سے اس کی خالص حیثیت کو ختم کر دیتا ہے اور اس کا رابطہ زمان لامکاں سے کم ہوتا چلا جاتا ہے حالاں کہ نفس کی اپنی ہستی زمان خالص میں ہے جہاں سلسلۂ روز و شب ہے نہ گردش شمس و قمر لیکن انسان اگر خود بینی و خودنگری سے کام نہ لے تو وہ مکان آلودہ وقت میں گم ہوجاتا ہے۔

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مومن کی یہ پہچان کہ گُم اس میں ہیں آفاق!

انائے مطلق اپنی خُودی کے لیے ماسوا کا محتاج نہیں اور خُدا کے لیے ماسوا کوئی خارجی حقیقت نہیں لیکن انسانی زندگی ایک خارجی عالم کے ساتھ وابستہ ہے اور ہمارے اسباب حیات ہم سے خارج میں ہیں اور ہماری خُودی کی معراج اس میں ہے کہ زمان مسلسل اور مکاں میں موجود خارج کی مزاحمتوں پر غالب آجائیں اور زمان خالص میں انائے مطلق کا قرب حاصل کرلیں۔ جب انسان لا الہ الا اللہ کی منزلیں طے کرتا ہوا لی مع اللہ کی عظمتوں پر پہنچ جاتا ہے تو زمان و مکان کی زنار خود بخود ٹوٹ کر گر جاتی ہے اور رُوحِ زمان و مکان (زروان) اسے یہ نوید سناتی ہے۔

لی مع اللہ ہر کہ را در دل نشست
آن جواں مردی طلسم من شکست

(۲۷)

حواشی

۱۔ جاوید اقبال، ڈاکٹر، افکار اقبال (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء) ص:۸۹
۲۔ جاوید اقبال، ڈاکٹر، افکار اقبال (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء) ص:۸۹
۳۔ رضی الدین صدیقی، ڈاکٹر، اقبال کا تصور زمان و مکان اور دوسرے مضامین (لاہور: مجلس ترقی ادب، جولائی، ۲۰۱۴ء) ص:۷۰
۴۔ نذیر نیازی، سیّد، تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ (لاہور: بزم اقبال، ۲۰۱۲ء) ص:۱۰
۵۔ رضی الدین صدیقی، ڈاکٹر، اقبال کا تصور زمان و مکان اور دوسرے مضامین (لاہور: مجلس ترقی ادب، جولائی، ۲۰۱۴ء) ص:۱۰۰
۶۔ اقبال، کلیات اقبال اردو (لاہور: شیخ غلام اینڈ سنز، جنُوری ۱۹۷۵ء) ص:۹۳
۷۔ رضی الدین صدیقی، ڈاکٹر، اقبال کا تصور زمان و مکان اور دوسرے مضامین (لاہور: مجلس ترقی ادب، جولائی، ۲۰۱۴ء) ص:۱۰۱
۸۔ رضی الدین صدیقی، ڈاکٹر، اقبال کا تصور زمان و مکان اور دوسرے مضامین (لاہور: مجلس ترقی ادب، جولائی، ۲۰۱۴ء) ص:۱۰۳
۹۔ اقبال، کلیات اقبال اردو (لاہور: شیخ غلام اینڈ سنز، جنُوری ۱۹۷۵ء) ص:۴۲۱، ۴۲۲
۱۰۔ رضی الدین صدیقی، ڈاکٹر، اقبال کا تصور زمان و مکان اور دوسرے مضامین (لاہور: مجلس ترقی ادب، جولائی، ۲۰۱۴ء) ص:۱۰۴
۱۱: اقبال، دوسرا خطبہ، "مذہبی وجدان کی فلسفیانہ جانچ"، مشمولہ فکرِ اقبال مرتبہ خلیفہ عبدالحکیم، ڈاکٹر، (لاہور: بزم اقبال، ۱۹۶۸ء) ص:۶۹۹ تا ۷۱۵

۱۲۔خالد اقبال یاسر، ڈاکٹر، جدید تحریکات اور اقبال (لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۲۰۱۵ء) ص:۵۳۸

۱۳۔برہان احمد صدیقی، ڈاکٹر: اقبال کا تصور زمان و مکان، مشمولہ منتخب مقالات، اقبال ریویو مرتبہ وحید قریشی، ڈاکٹر (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۸۳ء) ص:۱۳۱

۱۴۔مشمولہ ماہنامہ نقوش (لاہور: اقبال نمبر ۲، دسمبر ۱۹۷۷ء) ص:۱۳۹

۱۵۔مرتبہ، انُور سدید، ڈاکٹر، اقبال شناسی اور اوراق (لاہور: بزم اقبال، ۱۹۸۹ء) ص:۳۸

۱۶۔عبدالحکیم، خلیفہ، فکر اقبال (لاہور: بزم اقبال، اپریل ۲۰۱۳ء) ص:۵۱۹، ۵۲۰

۱۷۔عشرت حسین انُور، ڈاکٹر، اقبال کی مابعد الطبیعات، ترجمہ، ڈاکٹر، شمس الدین صدیقی (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۸۸ء) ص:۲۷، ۲۹

۱۸۔افتخار احمد صدیقی، ڈاکٹر، فروغ اقبال (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۹۶ء) ص:۹۵

۱۹۔جاوید اقبال، ڈاکٹر، افکار اقبال (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء) ص:۱۰۳

۲۰۔نواب عالم بارہوی، سیّد، کرنل، بصیرت اقبال (راولپنڈی: آرمی ایجوکیشن پریس، جی ایچ کیو، ۱۹۹۰ء) ص:۱۳۷

۲۱۔نواب عالم بارہوی، سیّد، کرنل، بصیرت اقبال (راولپنڈی: آرمی ایجوکیشن پریس، جی ایچ کیو، ۱۹۹۰ء) ص:۱۳۸، ۱۳۹

۲۲۔نواب عالم بارہوی، سیّد، کرنل، بصیرت اقبال (راولپنڈی: آرمی ایجوکیشن پریس، جی ایچ کیو، ۱۹۹۰ء) ص:۱۳۹

۲۳۔نواب عالم بارہوی، سیّد، کرنل، بصیرت اقبال (راولپنڈی: آرمی ایجوکیشن پریس، جی ایچ کیو، ۱۹۹۰ء) ص:۱۳۹، ۱۴۰

۲۴۔نواب عالم بارہوی، سیّد، کرنل، بصیرت اقبال (راولپنڈی: آرمی ایجوکیشن پریس، جی ایچ کیو، ۱۹۹۰ء) ص:۱۴۰

۲۵۔نواب عالم بارہوی، سیّد، کرنل، بصیرت اقبال (راولپنڈی: آرمی ایجوکیشن پریس، جی ایچ کیو، ۱۹۹۰ء) ص:۱۴۲

۲۶۔نواب عالم بارہوی، سیّد، کرنل، بصیرت اقبال (راولپنڈی: آرمی ایجوکیشن پریس، جی ایچ کیو، ۱۹۹۰ء) ص:۱۴۲

۲۷۔نواب عالم بارہوی، سیّد، کرنل، بصیرت اقبال (راولپنڈی: آرمی ایجوکیشن پریس، جی ایچ کیو، ۱۹۹۰ء) ص:۳

علامہ اقبالؒ کے تصورِ تقدیر اور تصور جبر و قدر

(''خطباتِ اقبال'' کے حوالے سے)

تقدیر یا جبر و قدر کے تصور میں جبر کے عقیدے کو فوقیت حاصل رہی ہے۔اس عقیدے کے مطابق انسان مجبورِ محض ہے اور اس کے ارادہ و عمل میں اس کی مرضی کا کوئی دخل نہیں ہوتا بلکہ وہ وہی کچھ کرتا ہے جو پہلے سے اس کے لیے مقرر ہو چکا ہے۔تقدیر کے اسی عقیدے کو جبر کا عقیدہ کہتے ہیں۔اس کی بنیاد قرآن مجید کی ان آیات مبارکہ پر ہے"جن کی رُو سے اللہ عزوجل ہر شے پر قادر و مطلق ہے، اس کی مرضی کے بغیر پتّا بھی حرکت نہیں کر سکتا، اللہ عزوجل جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے، عزت اور ذلت بھی اسی کے ہاتھ میں ہے۔

جبر کے مقابلے میں ایک گروہ نے یہ عقیدہ پیش کیا کہ انسان اپنے ارادہ اور اعمال میں بالکل آزاد ہے، پہلے سے اس کے لیے کسی نہ کسی راستہ کو مقرر کیا گیا ہے اور نہ کچھ معینہ اعمال اس کے لیے مقرر کر دیے گئے ہیں۔اس عقیدہ کو''قدر'' کا نام دیا گیا۔اس کی حمایت میں بھی قرآن مجید کی آیات مبارکہ پیش کی گئیں جن کا مفہوم یہ ہے کہ انسان اپنے اعمال کا جواب دہ ہے، اللہ عزوجل ان لوگوں کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد آپ کرتے ہیں۔

علامہ اقبالؒ نے خُودی کی پرورش اور استحکام کے لیے جن اثبات پر زور دیا ہے ان کی تکمیل کے لیے علامہ اقبالؒ کو تقدیر کے مسئلہ سے بھی لازماً دوچار ہونا پڑا کیوں کہ جب تک انسان اپنے ارادہ اور عمل میں

آزاد نہ ہو، وہ اپنی صلاحیتوں کو اپنی کوشش سے بروئے کار نہ لا سکے اور اپنے نیک و بد کا اندازہ نہ کر سکے اس وقت تک خُودی کی تربیت، پرورش یا تکمیل کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

''اقبالؒ کا نظریہ یہ ہے کہ انسان اپنے ارادہ میں پوری طرح آزاد ہے، ان کے خیال میں تقدیر ایک خارجی قوت نہیں جو انسان کو خاص اعمال کرنے پر مجبور کرے اور نہ انسانی اعمال ہی پہلے سے متعین شکل میں مستقبل میں پوشیدہ ہیں اور وقت کی رفتار سے ایک ایک کر کے نمودار ہوتے ہیں بلکہ حقیقت میں تقدیر اندرونی صلاحیتوں اور نا قابل حصول امکانات کا نام ہے۔ انسان کا ہر عمل پوری آزادی سے ظہور میں آتا ہے جس میں جبر کو کوئی دخل نہیں۔ انسان کے سامنے لامحدود امکانات موجود ہیں اور وہ اپنی بہت سی صلاحیتوں اور ارادے کے مطابق ان امکانات میں سے چنتا جاتا ہے اور عمل کی صورت میں ظاہر ہوتے جاتے ہیں۔''(۱)

انسان کی قوت اور خودارادیت کا سرچشمہ اگرچہ ذات باری سے ہے لیکن اس کے ارادے اور اعمال کی آزادی میں کسی مجبوری کو دخل نہیں، صرف اسی طرح اس کے اعمال کی ذمہ داری انسان پر ڈالی جا سکتی ہے اور خُدا کا قانون جزا و سزا برحق ہو سکتا ہے۔ اسی نظریے کے تحت انسانی خُودی اپنے ماحول کی تسخیر کرتی ہے اور اپنے اندر استحکام کی وہ قوت پیدا کرتی ہے کہ اسے وہ بلند مقام حاصل ہو جاتا ہے کہ

خُودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خُدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے!

(۲)

اقبالؒ کا یہ خیال ہے کہ انسان ہی کے حصے میں یہ سعادت آئی ہے کہ اس عالم کی گہری آرزوؤں میں شریک ہو، جو اس کے گرد و پیش موجود ہے اور اپنی علیحدہ کائنات کی تقدیر خود متشکل کرے۔ کبھی اس کی قوتوں سے توافق پیدا کرتے ہوئے اور کبھی پوری طاقت سے کام لیتے ہوئے اپنی غرض و غایت کے مطابق ڈھال کر، اس لحظہ بہ لحظہ پیش رس اور تغیر زا عمل میں خُدا بھی اس کا ساتھ دیتا ہے لیکن شرط یہ ہے کہ پہل انسان کی طرف سے ہو۔

إِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِأَنْفُسِهِمْ ۔ (سورۃ الرعد: آیت ۱۱)

ترجمہ: بے شک اللہ کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنی حالت نہ بدلیں۔

''لیکن اگر وہ پہل نہیں کرتا، اپنی ذات کی وسعتوں اور گوناگوں صلاحیتوں کو ترقی نہیں دیتا، زندگی کی بڑھتی ہوئی رَو کا کوئی تقاضا اپنے اندرون ذات میں محسوس نہیں کرتا تو اس کی رُوح پتھر کی طرح سخت ہو جاتی

ہے اور وہ گر کر بے جان مادے کی سطح پر جا پہنچتا ہے۔''(۳)

گویا انسان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی پوشیدہ صلاحیتوں کا سراغ لگائے اور انھیں روبعمل لائے۔ اس طرح وہ نہ صرف اپنے نفس میں تبدیلی پیدا کرے گا بلکہ دنیا اور کائنات کو بھی بہتر صورت عطا کرنے کا باعث بنے گا اور اپنے اس عمل کی قدرت جو اسے اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائی ہے۔

تیری خُودی میں اگر انقلاب ہو پیدا
عجب نہیں ہے کہ یہ چار سو بدل جائے!

(۴)

ایک زندہ اور متحرک ہونے کے باعث ہی انسان اپنے اعمال اور افعال میں آزاد اور ان کا ذمہ دار ہے اور اس آزادی کی بنا پر اس کی خُودی نشوونما پاتی ہے۔

اس قوم کو شمشیر کی حاجت نہیں رہتی   ہو جس کے جوانوں کی خُودی صورت فولاد!
نا چیز جہانِ مہ و پرویں تیرے آگے   وہ عالمِ مجبور ہے، تو عالمِ آزاد!

(۵)

''علم کلام کا ایک اہم مسئلہ جبر و قدر یا مسئلہ تقدیر ہے جس پر دیگر اہم مسائل کی طرح برابر بحث کی جاتی رہی ہے اس کا بنیادی پہلو یہ ہے کہ انسان اپنے اعمال میں مجبور ہے یا مختار۔ قرآن حکیم میں جا بجا تقدیر کا مفہوم موجود ہے، قرآن پاک میں ارشاد فرمایا گیا کہ اللہ تعالیٰ قادر مطلق ہے اور انسان اس کی مرضی کا تابع ہے۔ راہ ہدایت کی نعمت صرف اذن ربانی سے ہی ممکن ہے، وہ جسے چاہے سیدھے رستے پر چلنے کی توفیق دے اور جسے چاہے سیدھے رستے سے بھٹکا دے۔ دوسری طرف یہ بھی فرمایا کہ ہر کسی کو اپنے حصے کا بوجھ اٹھانا ہے، یعنی ہر شخص اپنے اعمال کا ذمہ دار ہے، یہ آزادی اور مجبوری عقائد کے اعتبار سے مسلمان دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے۔ ایک گروہ وہ تھا جو سمجھتا تھا کہ انسان اپنے اعمال میں آزاد ہے یہ گروہ قدری کہلایا۔ دوسرا گروہ وہ تھا جو خود کو قادر مطلق کے سامنے مجبور سمجھتے تھے یہ گروہ جبری کہلایا۔''(۶)

''جبر و قدر کا مسئلہ ایک بہت معرکۃ الآرا مسئلہ رہا ہے، جس پر دیگر اہم مسائل کی طرح برابر بحث ہوتی رہی ہے۔ اس مسئلے کا بنیادی پہلو یہ ہے کہ انسان اپنے اعمال میں مختار ہے یا مجبور۔ بات یہ ہے کہ اخلاق کے معیار اور جزا و سزا کے امکان کی بنیاد اس مسئلے کے حل پر منحصر ہے۔ سائنس کا اثر اس مسئلے پر اس زمانے سے شروع ہوا جبکہ نیوٹن کے اپنے کلیہ تجاذب کی بنیاد پر نظام عالم کی ایک نظری ترتیب پیش کی اور اس میں بتدریج

وسعت ہوتی گئی یہاں تک کہ علوم وفنون کی تمام شاخوں میں یہ اصول سرایت کر گیا۔'' (۷)

''نیوٹن کی میکانکس کا اہم ترین مسئلہ یہ ہے کہ اگر کسی وجود کی موجودہ حالت معلوم ہو تو آئندہ کسی خاص وقت پر وہ مجبور ہے کہ اسی حالت میں ہو اور اس کے علاوہ کوئی دوسری حالت اختیار نہیں کر سکتا۔ نیوٹن کی میکانکس کی کامیابی کے ساتھ ساتھ تعین (Determinism) کا یہ تصور بھی وسیع ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ اُنیسویں صدی کے آخر میں یہ اپنے انتہائی عروج کو پہنچ گیا اور تعین کی نظریے کو ساری کائنات پر چسپاں کر دیا گیا۔ یعنی سائنس دان یہ ماننے لگے کہ کائنات کی ابتدائی حالت میں اس کی ساری آیندہ تاریخ معین ہو گئی جس سے وہ ذرہ بھر نہیں ہٹ سکتی۔'' (۸)

فلاسفر کے اس گروہ نے جو جبریت کا قائل تھا، اس اصول کو مان لیا اور یہ سمجھنے لگے کہ اس سے ان کے عقیدے کی تصدیق ہوتی ہے۔ جب ہر چیز کا فعل معین ہو گیا تو پھر ایسی دنیا میں، ان کے نزدیک خُدا کے وجود کی ضرورت ہی باقی نہیں رہی اور اس طرح مادیت اور الحاد کے پیروؤں کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا۔ علامہ اقبالؒ نے جب ''فلسفہ عجم'' پر اپنا مقالہ لکھا اور اس ضمن میں فارسی ادب وتصوّف کا گہرا مطالعہ کیا تو انھیں محسوس ہوا کہ مسلمانوں کے زوال کا ایک بڑا سبب تقدیر اور قسمت کا وہ عجمی تصور ہے جو ہر شخص کے دل و دماغ پر مسلط ہو کر نفیِ خُودی کے نظریے کا باعث ہے۔ تقدیر و توکل کے غلط تصور نے مسلمانوں کو مایوسی، قنوطیت اور بے عملی کا عادی بنا دیا، اسی احساس کمتری اور بے عملی کو رفع کرنے کے لیے اقبال نے خُودی اور خود شناسی کا نیا تصور پیش کیا۔'' (۹)

اقبالؒ نے تقدیر کے اس غلط مفہوم کے خلاف اس قدر شد و مد سے جہاد کیا تھا کہ بعض اوقات اندیشہ یہ ہوتا تھا کہ وہ حد ادب سے آگے بڑھے جا رہے ہیں۔ اپنے منظوم کلام کے علاوہ ''تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ'' کے خطبات میں اس کے فلسفیانہ مضمرات پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اور اس زہر کا تریاق پیش کرنے کے لیے مسئلہ جبر وقدر کے صحیح اسلامی تصور کی وضاحت کی ہے۔ (۱۰)

یہاں اقبالؒ کے خطبات سے ایک عبارت پیش کی جاتی ہے:

"As the Quran says" God created all things and assigned to each its destiny. The destiny of a thing, then, is not unrelenting fate, working from without , like a task master; it is the inwared

rearch of a thing; its realisable possiblities which lie within the depths of its nature, and socially actualize themselves, with any feeling of eternal compulsion."

جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے:

خَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهُ تَقْدِيرًا

تقدیر کوئی قوت قاہرہ نہیں ہے جو خارج سے کسی شے پر بجبر عمل کر رہی ہو بلکہ وہ شے کی باطنی رسائی ہے اور اس کے وہ قابل تحقق امکانات، جو اس کی فطرت کی گہرائیوں میں مضمر ہیں اور بغیر کسی خارجی جبر کے اپنے وقت پر ظاہر ہوتے ہیں۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اقبالؒ کا مسلک اس معاملے میں درمیانی ہے، وہ انتہاؤں سے احتراز کرتے ہیں اور اپنے ایک شعر میں حدیث نبوی ﷺ کے حوالے سے فرماتے ہیں:

چنیں فرمودہ سلطانِ بدر است
کہ ایماں درمیانِ جبر و قدر است

انسان کے اختیار و آزادی کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ قرآن کریم میں اس کو نیک عمل کی ترغیب دی گئی ہے اور برے کام کے نتیجوں سے ڈرایا گیا ہے۔ اگر انسان مجبورِ محض ہوتا تو ظاہر ہے کہ اس وعدہ اور وعید کی ضرورت ہی نہ ہوتی۔ اقبالؒ نے اپنے خطبات میں تفصیل سے بتایا ہے کہ کس طرح قسمت اور تقدیر کے غلط تصور کی بنا پر مسلمانوں پر ایک عرصہ سے یاس و قنوطیت کا عالم طاری رہا ہے اور وہ انحطاط اور زوال کی طرف مائل ہوتے چلے گئے۔ تصوّف کے علاوہ اس معاملے میں وہ قدیم سائنس کی مادیت اور میکانکی نظریوں سے بھی بڑی حد تک متاثر ہوئے ہیں۔'' (۱۲)

غرض اقبالؒ بتاتے ہیں کہ جب انسان نقش حق اختیار کر لیتا ہے تو ساری دنیا اس کی تابع اور تقدیر اس کی تدبیر کے ہم رکاب ہو جاتی ہے۔ جس شخص میں قوت تخلیق نہ ہو، حق تعالیٰ کے نزدیک وہ کافر و زندیق سے بڑھ کر نہیں، اس لیے ضروری ہے کہ:

مرد حق برندہ چوں شمشیر باش
خود جہانِ خویش را تقدیر باش

متاخرین مسلمانوں میں جوں جوں تن آسانی اور کاہلی کا روگ سرایت کرتا گیا وہ قسمت اور تقدیر کے غلط معنی لے کر قوت عمل سے محروم ہوتے چلے گئے اور اس کو صبر و توکل اور تسلیم و رضا کے شاندار الفاظ سے بیان کرنے لگے۔ اقبالؒ نے اپنے کلام اور خطبات میں جا بجا اس مغالطے کو دور کرنے کی کوشش کی ہے۔

ترے دریا میں طوفاں کیوں نہیں ہے؟ خُودی تیری مسلماں کیوں نہیں ہے؟
عبث ہے شکوۂ تقدیرِ یزداں تو خود تقدیرِ یزداں کیوں نہیں ہے؟

(۱۳)

جو لوگ اپنے اعمال کی سزا بھگتنے سے بچنے کے لیے تقدیر اور قسمت کا حیلہ ڈھونڈتے ہیں، ان کی حالت کو اقبالؒ نے ضربِ کلیم میں "خُدا اور ابلیس" کے مکالمے کے لطیف پیرائے میں بیان کیا ہے۔

''قرآن مجید نے بار بار تقدیر کی طرف اشارہ کیا ہے۔ لہٰذا ہمیں تقدیر کے مسئلے پر بھی غور کر لینا چاہیے، بالخصوص اس لیے کہ زوالِ مغرب، میں اشپنگلر نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اسلام بھی خُودی کی نفی کا خواہش مند ہے۔'' (۱۴)

''ہم اسے (کائنات کو) موجودہ کہتے ہیں تو ان معنوں میں کہ وہ ایک غیر معین امکان ہے چناں چہ بطور ایک ''نامی کل'' زمانے کا یہی تصور ہے جس کو قرآن پاک نے تقدیر سے تعبیر کیا ہے لیکن جس کو نہ اسلامی دنیا ٹھیک ٹھیک سمجھ سکی نہ غیر اسلامی دنیا دراصل تقدیر عبارت ہے اس زمانے سے جس کا انکشاف ابھی باقی ہے۔'' (۱۵)

سلسلۂ روز و شب، تارِ حریرِ دو رنگ
جس سے بناتی ہے ذات اپنی قبائے صفات
(کلیاتِ اقبال، بالِ جبریل، ص: ۴۶۳)

یہ کائنات! ابھی نا تمام ہے شاید
کہ آرہی ہے دما دم صدائے کُن فیکوں!
(بالِ جبریل، ص: ۳۲۰/۲۸)

جہاں اور بھی ہیں، ابھی بے نمود!
کہ خالی نہیں ہے ضمیرِ وجود!
(بالِ جبریل، ص: ۴۲۰/۱۲۸)

یہ کائنات جسے حضرت علامہ ''نامی کل'' کہتے ہیں ایک غیر معین امکان اس لیے ہے کہ بڑھنے اور تکمیل کی راہیں طے کرنے کی آزادی ہے۔ اسے یکبارگی کامل و سالم و جامع بنا کر نہیں بھیج دیا گیا۔ اگر ایسا ہوتا تو پھر زمانہ تخلیق کے جوہر سے محروم ہوتا اور اس کا دوران محض گردشی پر کار ہوتا، جس کا مطلب ہے تکرارِ محض، یہی باعث ہے کہ وہ نطشے کے نظریہ Enternal Recurrence کو محض Eternal Repitition قرار دیتے ہیں۔ بالفاظ دیگر ''کڑی میکانیت''۔ اس مضمون کو ان کے اپنے بیان میں اس طرح پیش کیا جا سکتا ہے۔

قرآن پاک کا ارشاد ہے۔ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ لہٰذا زمانِ حقیقی کی زندگی زمانِ مسلسل کی زنجیروں سے آزادی اور ابداع کا عمل ہے اور اس لیے تخلیق کا فعل بھی آزادی کا فعل ہے کیوں کہ تخلیق تکرار کی ضد ہے اور تکرار خاصہ ہے میکانیاتی طریق کار کا۔'' (۱۵)

حضرت علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں:

''ہم زمانے کی حرکت کا تصور ایک پہلے سے کھینچے ہوئے خط کی شکل میں نہیں کریں گے کیوں کہ یہ خط ابھی کھینچ رہا ہے اور اس سے مطلب ہے وہ امکانات جو ہو سکتا ہے وقوع میں آئیں اور ہو سکتا ہے نہ آئیں۔''

''وہ ہستی جس سے اس کو جزو کل کا سا تعلق ہے، اس میں اضافہ ممکن ہے، ہم اس کو غیر محدود کہتے ہیں تو ان معنوں میں کہ اس کی وسعت پر کوئی حد قائم نہیں کی جا سکتی، یعنی وہ غیر محدود ہے تو بالقوۃ، بالفعل نہیں اور اس لیے فطرت کا تصور بھی ایک زندہ اور ہر لحظہ بڑھتی اور پھیلتی ہوئی وحدت نامیہ کی حیثیت سے کرنا چاہیے جس کے نشوونما پر ہم خارج سے کوئی حد قائم نہیں کر سکتے۔'' (۱۶)

فطرت افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے
کبھی کرتی نہیں ملّت کے گناہوں کو معاف
(کلیاتِ اقبال، ضربِ کلیم، ص: ۵۴۷)

علیٰ ہذا۔۔۔ یہ فرض کرتے ہوئے کہ علت و معلول کو جو آپس میں نسبت ہے زمانہ اس کی شرط ضروری ہے، ایک ایسے خُدا کا تصور قائم کیا جو موجوداتِ عالم سے ورا الورا قدیم ہی سے موجود ہے اور اس لیے خارج سے اس پر عمل کر رہا ہے، لہٰذا کہا گیا کہ علت و معلول کا سلسلہ چوں کہ بالآخر ذاتِ خُداوندی پر ختم ہو جاتا ہے، اندریں صورت جو کچھ بھی ہو رہا ہے خُدا ہی کے حکم سے ہو رہا ہے۔'' (۱۷)

''اقبالؒ کو مسلمان سے گلہ ہے کہ وہ تقدیر کا شکوہ کرنے کے بجائے نقشِ حق اختیار کر کے خود تقدیرِ الٰہی کیوں نہیں بن جاتا۔ تقدیر کے اسی تصور کے پیشِ نظر انھوں نے کہا ہے کافر تقدیر پر بھروسا کرتا ہے مگر مومن

خود تقدیر الٰہی ہے۔ مومن کے جوش کردار سے تقدیر کے راز کھل جاتے ہیں اور اسی جوش کردار سے میدان کار زار میں مومن کی آواز خُدا کی آواز بن جاتی ہے۔ اپنی تقدیر اپنے ہاتھ سے لکھنا زندہ اور بیدار دل افراد و امم کا شیوہ ہے، سروری اور برتری انھی کے حصے میں آتی ہے، جو اپنی تقدیر خود بناتے ہیں۔''(۱۸)

علامہ اقبالؒ نے جبر و قدر کے امتزاج کو ایک حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے واضح کیا ہے جس میں ارشاد ہوتا ہے: الایمان بین الجبر و الاختیار (۱۹)

''خُودی کے تحقق و نشو و نما کے لیے قدرت اور اختیار لازمی ہے لیکن یہ مسئلہ جس قدر اہم ہے اسی قدر پیچیدہ بھی ہے اور اس پیچیدگی کی وجہ یہ ہے کہ انسان کو دو نسبتیں حاصل ہیں، ایک نسبت تو اس کو خُدا کے ساتھ ہے اور اس حیثیت سے وہ خُدا کے مقابل میں ایک ہیچ، عاجز درماندہ اور بے بس و مجبور ہستی ہے اور ڈاکٹر صاحب نے بھی اس حیثیت سے خُدا کے سامنے نہایت نیاز مندی کے ساتھ عجز و مجبوری کا اعتراف کیا ہے۔''(۲۰)

''یہ سچ ہے کہ بغیر حکم الٰہی کے زمین کا کوئی ذرہ حرکت نہیں کرتا اور درخت کا کوئی پتّا نہیں ہل سکتا لیکن اس کے ساتھ اقبالؒ کا خیال ہے کہ انسان کے لیے یہ مقدر ہو چکا ہے کہ وہ اپنے گرد و پیش کی کائنات کی تقدیر کی تشکیل کرے۔ کبھی وہ کائنات کی قوتوں سے اپنے آپ کو مطابق بناتا ہے اور کبھی ان کو پوری قوت کے ساتھ اپنے مقاصد کے مطابق ڈھالتا ہے۔''(۲۱)

''انسان کو یہ اختیار حاصل ہے کہ اگر مسلسل جد و جہد کرے تو اپنی اس آزادی میں چنداں وسعت پیدا کر سکتا ہے، آزادی و اختیار ایک ایسی شے ہے جس کا تجربہ ہمیں ذات کی گہرائیوں میں ہو سکتا ہے، یہ تجربہ ہر ہر شے کو اپنی فطرت کے اعتبار سے ہوتا ہے، گویا یہ ایک طرح کی ''خود تعینی'' کی کیفیت ہے جس کی بدولت ذہن انسانی نئے نئے تصورات کی ایجاد و تخلیق دو چند مسرت و آزادی محسوس کرتا رہتا ہے اور بقول اقبال:

وہی ہے صاحب امروز جس نے اپنی ہمت سے
زمانے کے سمندر سے نکالا گوہر فردا
(۲۲)

علامہ اقبالؒ خطبات میں تقدیر انسانی کی حدود بتاتے ہیں:

''کسی شے کی تقدیر قسمت کا وہ بے رحم ہاتھ نہیں کہ ایک سخت گیر آقا کی طرح خارج سے کام کر رہا ہو بلکہ ہر شے کی حد وسیع ہے، یعنی اس کے وہ امکانات جن کا حصول ناممکن ہے اور جو اس کے اعماق وجود میں مضمر اور بغیر کسی خارجی دباؤ کے علی التواتر قوت سے وجود میں آتے ہیں۔''(۲۳)

"Iqbal points out that the centre of experience,i.e; the mind or self is the only reality in this world.And this is not the mere "thought" of Hegel, or the" experience" (sense-perception) of Bradley,but the whole of peronality,and that, too, "in a state of tension".It is an "attitude" poised like a knife-edge to receive stimuli,to judge the same, and to take action"(24)

قرآن کریم میں جا بجا تقدیر کا مفہوم موجود ہے جسے اکثر مسلمان مفکرین نے بھی صحیح طور پر نہ سمجھا اور مغرب کے متشرقین بھی اس کو جبر مطلق کہنے لگے۔''(۲۵)

''اگر مسلمان نے جبر کے بارے میں غلو سے کام لیا اور ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ گیا تو دوسری طرف مغرب کی مسیحی اقوام نے آزادی و اختیار کے تصور کو انتہا تک پہنچا دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں اعتدال کے راستے سے ہٹ گئے اور یہ عدم اعتدال دونوں کے لیے مہلک ثابت ہوا۔ علامہ اقبالؒ نے ایک رباعی میں روم میں کسی بوڑھے راہب سے اپنی ملاقات کا ذکر کیا ہے جس نے ان کے ساتھ گفتگو کے دوران ایک نہایت معنی خیز بات کہی تھی اور وہ یہ کہ تم لوگوں کو تقدیر نے اور ہمیں تدبیر نے مارا۔''(۲۶)

الغرض حضرت علامہ اقبالؒ کے تصور تقدیر سے جو تلقین ہمیں حاصل ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ جملہ معیار اور پیمانے آپ کی آنکھوں کے سامنے ہیں۔ گویا امکانات و تقدیرات کا کارخانہ کھلا ہے۔ خلوص کے ساتھ تقدیر انتخاب کیجیے اور پھر اس تقدیر کے حصول کی خاطر اپنے اندر اہلیت پیدا کیجیے۔ لہٰذا بہتر سے بہتر کی طرف بڑھتے جائیے اور تبدیلی، تقدیر کے باب میں اللہ کے حضور دعا گو رہ کر توفیق طلب کرتے رہیے۔

''خُودی کا نصب العین یہ نہیں کہ کچھ دیکھیے بلکہ یہ کہ کچھ بن جائیے۔''(۲۷)

نشان یہی ہے زمانے میں زندہ قوموں کا
کہ صبح و شام بدلتی ہیں ان کی تقدیریں
(۲۸)

حواشی

۱۔منیر احمد یزدانی، پروفیسر،شعورِ اقبال (لاہور: ادبستان،۲۰۰۱ء)ص:۲۰۰

۲۔محمد اقبال،علامہ،کلیات اقبال اردو (لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز،۱۹۷۹ء)ص:۳۴۷

۳۔نذیر نیازی،سیّد،تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، (لاہور: بزم اقبال،۱۹۸۶ء)ص:۱۸، ۱۹

۴۔محمد اقبال،علامہ،کلیات اقبال اردو (لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز،۱۹۷۹ء)ص:۶۲۷

۵۔محمد اقبال،علامہ،کلیات اقبال اردو (لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز،۱۹۷۹ء)ص:۵۳۴

۶۔محمد اکرم سعید، پروفیسر، اقبال کا خصوصی مطالعہ (لاہور: عبداللہ برادرز، ن،د)ص:۳۳۰

۷۔افتخار احمد صدیقی، ڈاکٹر،فروغ اقبال (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان،۱۹۹۷ء)ص:۴۲۸

۸۔افتخار احمد صدیقی، ڈاکٹر،فروغ اقبال (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان،۱۹۹۷ء)ص:۴۲۹

۹۔افتخار احمد صدیقی، ڈاکٹر،فروغ اقبال (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان،۱۹۹۷ء)ص:۴۲۹

۱۰۔افتخار احمد صدیقی، ڈاکٹر،فروغ اقبال (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان،۱۹۹۷ء)ص:۴۲۹

۱۱۔افتخار احمد صدیقی، ڈاکٹر،فروغ اقبال (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان،۱۹۹۷ء)ص:۴۳۰

۱۲۔افتخار احمد صدیقی، ڈاکٹر،فروغ اقبال (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان،۱۹۹۷ء)ص:۴۳۳

۱۳۔افتخار احمد صدیقی، ڈاکٹر،فروغ اقبال (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان،۱۹۹۷ء)ص:۴۳۶

۱۴۔نذیر نیازی،سیّد،تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، (لاہور: بزم اقبال،۱۹۸۶ء)ص:۱۶۹

۱۵۔محمد منوّر، پروفیسر، ایقانِ اقبال (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۱۲ء)ص:۴۸، ۴۹

۱۶۔محمد منوّر، پروفیسر، ایقانِ اقبال (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۱۲ء)ص:۵۰

۱۷۔محمد منوّر، پروفیسر، ایقانِ اقبال (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۱۲ء)ص:۵۵

۱۸۔عبدالشکور احسن، ڈاکٹر، اقبال کی فارسی شاعری کا تنقیدی جائزہ (لاہور: اقبال اکادمی، ۲۰۰۰ء)ص:۳۱۳

۱۹۔عبدالشکور احسن، ڈاکٹر، اقبال کی فارسی شاعری کا تنقیدی جائزہ (لاہور: اقبال اکادمی، ۲۰۰۰ء)ص:۳۱۵

۲۰۔عبدالسلام ندوی،مولانا،اقبال کامل (لاہور: الفیصل ناشران و تاجران کتب،۲۰۰۸ء)ص:۲۵۲

۲۱۔یوسف حسین خان، ڈاکٹر، رُوحِ اقبال (لاہور: القمر انٹر پرائزز،۲۰۱۰ء)ص:۳۵۶

۲۲۔قیصر السلام، قاضی، فلسفے کے بنیادی مسائل (لاہور: نیشنل بک فاؤنڈیشن، ن۔د)ص:۵۴۸، ۵۴۹

۲۳۔این میری شمل، پروفیسر، ڈاکٹر، شہپر جبریل، مترجم محمد ریاض، ڈاکٹر (لاہور: گلوب پبلشرز، ۱۹۸۵ء)ص:۳۸۳

۲۴۔محمد سعید، شیخ، پروفیسر، اقبال کے فکر و فن کے مطالعات (لاہور: بزم اقبال، ۱۹۷۲ء)ص:۶۷

۲۵۔عبدالحکیم خلیفہ، ڈاکٹر، تلخیص خطبات اقبالؒ (لاہور: بزم اقبال، ۱۹۸۸ء)ص:۹۰

۲۶۔عبدالشکور احسن، ڈاکٹر، اقبال کی فارسی شاعری کا تنقیدی جائزہ (لاہور: اقبال اکادمی، ۲۰۰۰ء)ص:۳۱۶

۲۷۔نذیر نیازی، سیّد، تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، (لاہور: بزم اقبال،۱۹۸۶ء)ص:۳۰۶

۲۸۔کلیات اقبال، ارمغان حجاز (حصہ اردو)ص:۶۸۴

اقبال کا ''مردِ مومن'' اور نطشے کا ''سپرمین''

اللہ سُبحانہ وتعالیٰ کی تخلیق کردہ تمام مخلوقات میں اعلیٰ اور افضل ترین درجہ (اشرف المخلوقات) انسان کو عطا کیا گیا اور انسان اس درجے پر فقط علم اور عقل کی بنیاد پر فائز کیا گیا ہے۔ اسی عقل وفہم اور خُدا کے عطا کردہ علم کی وجہ سے ہی اس نے کائنات کو تسخیر کیا ہے اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے کہ تسخیر کے کچھ مراحل طے کرنا باقی ہیں۔

کچھ لوگ ایسی خُداداد صلاحیتوں کے مالک ہوتے ہیں۔ ایسے صاحب بصیرت اور دُوراندیش ہوتے ہیں کہ آئندہ رونما ہونے والے واقعات کی سچی پیشن گوئی کر سکتے ہیں۔ ایسے لوگ صدیوں بعد پیدا ہوتے ہیں اور ان کا نام ہمیشہ کے لیے امر ہو جاتا ہے۔ وہ خود تو اس جہاں فانی سے پردہ کر جاتے ہیں مگر آنے والی نسلوں کے لیے علم وحکمت کی ایسی شمعیں روشن کر جاتے ہیں کہ نسل نو اس سے بھرپور مستفید ہوتی ہے ایسا ہی ایک نام علامہ محمد اقبالؒ کا ہے۔

''علامہ اقبالؒ کی حکیمانہ نگاہ مسلمان قوم کو تاریخ کے نئے تقاضوں کے مطابق ڈھلتا دیکھنا چاہتی تھی، اُنھوں نے قوم کے اوصاف اور کیفیات کا نئے زاویوں سے جائزہ لیا اور اپنے پیغام اور تعلیمات کے ذریعے مسلمانوں کو بے پناہ توانائی عطا کی۔ اقبالؒ نے قوم کو عین اس وقت خوابِ غفلت سے جگانے کی سعی کا آغاز کیا جب مادی آسائشوں کے حصول کے حوالے سے شدید تلخیوں اور بدترین حقائق کا سامنا ہو رہا تھا۔ اِضطراب اور پریشانی کے اس عالم میں اقبالؒ نے امید، جستجو اور حوصلے کا پیغام دیا۔''(۱)

خُدائے لم یزل کا دستِ قدرت تُو، زباں تُو ہے — یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تُو ہے
پرے ہے چرخِ نیلی فام سے منزل مسلماں کی — ستارے جس کی گردِ راہ ہوں، وہ کارواں تُو ہے
تیری فطرت امیں ہے ممکناتِ زندگانی کی! — جہاں کے جوہرِ مضمر کا گویا امتحاں تُو ہے
یہ نکتہ سرگذشتِ ملّتِ بیضا سے ہے پیدا — کہ اقوامِ زمینِ ایشیا کا پاسباں تُو ہے!
سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا — لیا جائے گا تجھ سے کام دُنیا کی امامت کا

(۲)

مردِ مومن کوئی خوش خیالی یا خوابناکی نہیں ہے بلکہ ایک امید ہے، ایک روشنی ہے ایک آسمان پر بارشوں کے بعد گردش کرنے والی دھنک ہے۔ جس نے مسلمانوں کو اپنے عقائد کی ست رنگی میں نہلا دیا ہے۔ تو اقبالؒ کا مردِ مومن تو خُودی کی عظمتوں اور وحدت الوجود کی حقیقتوں کا دانائے راز بنتا ہے۔ یہ مردِ مومن موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر زندگی کو امر بنا دیتا ہے۔ اس مردِ مومن کا جذبہ چٹان کو سرنگوں ہونے پر مجبور کر دیتا ہے۔ سو اقبالؒ کی بہت ساری توقعات اپنے مردِ مومن اور اس کی خُودی سے قائم ہیں۔ اقبالؒ کی محبتیں بھی اسی مردِ مومن کے لیے ہیں۔

'' مردِ مومن اقبالؒ کے پورے تفکرانہ مضامین میں اقبالؒ کے ساتھ ساتھ رہتا ہے جس کے لیے اقبالؒ نئے نئے راستے تلاش بھی کرتے ہیں اور اس کو نئے سورج کے ٹھکانوں سے بھی آگاہ کرتے ہیں۔ مردِ مومن کا تصور پیش کرتے ہوئے علامہ اقبالؒ کو امید تھی کہ ان کا یہ تصور ایک تابندہ حقیقت میں ڈھل جائے گا۔ اقبالؒ کا مردِ مومن خُودی کی عظمتوں کا علمبردار اور توحید کی رفعتوں کا شناسا ہے۔ یہ مردِ مومن شاہین کی صورت جھپٹتا اور طوفان کی صورت آگے بڑھتا ہے، ستاروں پر کمندیں ڈالتا اور چاند سورج کی خبر رکھتا ہے۔''(۳)

بندۂ مومن کا دِل بیم و ریا سے پاک ہے
قوتِ فرماں روا کے سامنے بے باک ہے

(کلیات اقبال، بانگ درا، صفحہ نمبر ۷۷)

''اقبال کے یہاں انسانِ کامل کا جو تصور ہے وہ ابن عربی کے تصور انسان کامل اور نطشے کے فوق البشر سے ماخوذ ہے۔ یہ کارلائل کے ہیرو سے بھی مختلف ہے اور یہ Chrismatic Person سے بھی کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ اس میں عبدہٗ بقول اقبالؒ چیزے دیگر ہے مگر محض عبد بھی یقین وایمان کی توانائی سے اوپر اٹھتا اور اطاعت اور ضبطِ نفس کے ذریعے نائب حق کے منصب پر فائز ہو کر ستاروں سے بھی آگے بڑھ جانے کی آرزو رکھتا

ہے۔''(۴)

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں　　جو ہو ذوق یقین پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں
کوئی اندازہ کرسکتا ہے اس کے زور بازو کا؟　　نگاہ مردمؤمن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں!
یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم　　جہاد زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

(کلیاتِ اقبال، بانگ درا، ص:۳۳۱، ۳۳۲)

''مردمومن کی اولوالعزمی، مہم جوئی، خلوص و بےغرضی، اس کی نزاہت و پاکیزگی، مصنوعی معیاروں اور غیرحقیقی قدروں سے گریز اور غیرفطری خوف و دہشت سے پرہیز کی قدر کسی سے نہیں پہچانی جاسکی۔ اے مرد مسلماں: تو ناموسِ ازل کا امین و پاسباں اور خُدائے لم یزل کا رازداں ہے، تیرا ہاتھ خُدا کا ہاتھ ہے، تیری اُٹھان مٹی سے ہے لیکن تجھی سے اس عالم کا وجود و بقا متعلق ہے، مے خانۂ یقین سے پی اور ظن و تخمیں کی پستیوں سے بلند ہوجا، فرنگ کی دلآویزی کی نہ داد ہے نہ فریاد، جس نے عقل و دل دونوں کو مسحور و مخمور اور ناکارہ بنادیا ہے فریاد ان بازیگروں سے جو کبھی ناز و انداز سے پکڑتے اور کبھی بیڑیوں میں جکڑتے ہیں، کبھی شیریں کا پارٹ ادا کرتے اور کبھی ''پرویز'' کا رُوپ بھرتے ہیں، دنیا ان کی تباہ کاریوں سے ویرانہ ہوگئی ہے۔''(۵)

''اقبال کے مردمومن کو نطشے کے فوق الانسان (Superman) کے تصور سے ماخوذ اور مساوی خیال کرتے ہیں لیکن اقبال اور نطشے کے فوق البشر میں زمین و آسمان کا فرق ہے، جب کہ سطحی نظر سے دیکھنے والے اسی غلط فہمی کا شکار رہتے ہیں۔

بقول سیّد عبداللہ ''نطشے اور اقبالؒ میں جو وحدت پائی جاتی ہے اس سے مغربی نقادوں کو غلط فہمی ہوئی ہے کہ اقبالؒ نے انسان کامل کا خیال اسی جرمن فلسفی سے مستعار لیا ہے، حالاں کہ اقبال علانیہ کہتے ہیں۔

''میں نے یہ خیال نطشے سے نہیں لیا بلکہ تصوّف کا ''مردمومن'' آج سے بیس سال قبل میرے پیش نظر آرہا ہے، انگریزوں کو اپنے ایک ہم وطن فلسفی کے خیالات کا مطالعہ کرنا چاہیے۔''(۶)

''اقبالؒ اور نطشے کے ''سپرمین'' میں سب سے بڑا جو بنیادی فرق ہے وہ اخلاقی قدروں کے فاصلے ہیں یعنی اقبالؒ کا ''انسان کامل'' اسلامی قوانین کی پاسداری کرنے کی بنا پر اخلاق فاضلہ کا نمونہ ہے جو اپنی زندگی میں اعلیٰ قدروں کی تخلیق کرتا ہے جبکہ نطشے کا ''سپرمین'' کسی اخلاقی قدر کا قائل نہیں کیوں کہ وہ دھریہ اور لامذہب ہے اس لیے اخلاقی قدریں جن کی اساس مذہب ہوتا ہے اس کے مطابق انسان کو کمزور اور ضعیف کرتی ہیں۔''(۷)

''نطشے کا فوق البشر کمزوروں پر غلبہ حاصل کرنے کے لیے قوت کو رزم حیات کے لیے ضروری قرار

دیتا ہے، اس کا سپرمین چوں کہ اخلاقی خوبیوں کو کمزوری پر محمول کرتا اور خیر و شر کو محض اضافی حیثیت دیتا ہے اس کے نزدیک قوی شخص ہی نیکوکاری کا اعلیٰ نمونہ پیش کرسکتا ہے۔ عدل و مساوات جیسی اعلیٰ اقدار جو معاشرے کے لیے ضروری ہیں اس کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتی کیوں کہ یہ بقائے اصلح کے خلاف ہیں۔ وہ اصل میں بقائے اصلح کا قائل ہے۔ وہ زندگی کا واحد مقصد عزم قوت کو قرار دیتا ہے۔ چوں کہ وہ قوت و اقتدار کو اہمیت دیتا ہے جس سے آقائی کا ظہور ہوتا ہے اس لیے قوت اور ڈنڈے کے زور پر انسانی مقدر کا فیصلہ ہونا چاہیے نا کہ عدل و انصاف کے تقاضوں پر، نطشے خُدا کا منکر تھا اس کے نزدیک انسان کی غلامانہ ذہنیت اس وقت تک دور نہیں ہو سکتی جب تک خُدا کے تصور کو دلوں سے مٹا نہ دیا جائے۔ نطشے کا قول تھا کہ ''خُدا مر گیا (نعوذ باللہ) تا کہ فوق البشر (مردمومن) زندہ رہے۔''(۸)

''اقبالؒ کا مردمومن، یقین محکم، عمل پیہم اور محبت فاتح عالم کے علاوہ ہر لحظہ نئی شان نئی آن لیے ہوئے ہے۔ گفتار و کردار کے علاوہ قہاری و غفاری و قدوس و جبروت کے عناصر اس کے مزاج میں شامل ہیں ان عناصر کا اکتساب اور ان کو اپنی ذات کا جزو لاینفک بنانا اسے پہلے جذبہ خُودی کو صیقل کرنے پر ابھارتا ہے اور پھر جذبہ عشق سے تقویت دے کر فقر و استغنا پیدا کرتا ہے۔''(۹)

''اقبالؒ نے مرد کامل کو مرد حُر، مرد قلندر، مرد بزرگ، مردمومن اور شاہین کے ناموں سے یاد کیا ہے اور جاوید نامہ کا زندہ رود بھی یہی مرد کامل ہے۔ بندہ مومن یا مرد حر ایک ہی فرد کے دو نام ہیں، فقر اور عشق کے امتزاج سے جو ہیئت ترکیبی بنتی ہے، وہی بندۂ مومن ہے۔''(۱۰)

"خلیفه الله فی لارض، مردِ تمام، مردِ مومن، مردِ درویش، فقرِ قلندران سب اصطلاحات میں ممکن ہے۔''(۱۱)

''اقبالؒ کا ''مردمومن'' یا ''مرد فقر'' ایک صاحب خُودی ہے۔''(۱۲)

''گویا اقبال کا انسانِ کامل احکام قرآنی اور پیروی اسوہ حسنہ میں تعمیر و تشکیل شخصیت کرتا ہے۔ یہی اسلامی تعلیمات کے مطابق زندگی بسر کر کے خود کامل بننے والا نیابت الٰہی کے درجے پر فائز ہو کر دوسروں کو بھی تکمیل کی راہ پر لگاتا ہے۔ جب اقبالؒ مومن کہتے ہیں تو ایمان کا سب سے بلند درجہ ان کے پیش نظر ہوتا ہے۔''(۱۳)

وہ سحر جس سے لرزتا ہے شبستانِ وجود
ہوتی ہے بندۂ مومن کی اذاں سے پیدا

(کلیات اقبال، ضرب کلیم، صبح، صفحہ نمبر ۵۶۷)

اقبالؒ کے ''مردِ مومن'' نے اسی عصری رجحان کے خلاف اعلان جنگ کیا۔ مردِ مومن زندگی کی

فرسودہ قدروں کو ڈھا کر تعمیرِ حیاتِ نو کا خواہاں ہے۔'' (۱۴)

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان، نئی آن — گُفتار میں، کردار میں، اللہ کی بُرہان
قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت — یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان
ہمسایہ جبریل امیں، بندۂ خاکی — ہے اس کا نشیمن، نہ بخارا نہ بدخشانی
یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن — قاری نظر آتا ہے حقیقت میں قرآن
قدرت کے مقاصد کا عیار اس کے ارادے — دنیا میں بھی میزان، قیامت میں بھی میزان
جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم — دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

(کلیاتِ اقبال، ضربِ کلیم، مردِ مسلمان، صفحہ نمبر ۵۲۲)

''اقبالؒ خاص طور پر نوجوان مسلمانوں کے دل سے زوال کے احساس، تن آسانی اور پژ مردگی کو دور کر کے ان میں غیرت، آزادی، بلند پروازی، تیز نگاہی اور قلندری جیسی صفات پیدا کرنے کے آرزومند ہیں تا کہ انسان ان خوبیوں کو تسخیرِ فطرت کے لیے، انقلاب کے لیے، مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کے لیے اور دنیا اور آخرت میں سرخروئی کے لیے کام میں لائے۔'' (۱۵)

''اگرچہ دنیا کی امامت کا یہ خواب نطشے نے بھی دیکھا تھا لیکن اس کے اور اقبال کے تصور کے مابین ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ مغرب کا فوق البشر کمزور انسان کی مغلوبیت پر اپنی شان و شوکت کی بنیاد رکھتا ہے اور نسلی برتری کے زعم میں اپنی سَطْوَت کو ایک مستقل حیثیت دینا چاہتا ہے جبکہ اقبال کا مردِ مومن کسی نسلی فوقیت میں ملوث نہیں ہے اور نہ وہ امامت کو حاکمیت کی خصوصیات سے مشروط کرتا ہے، اقبال کا مردِ مومن دنیا کا رہبر بھی ہے اور ساتھی بھی، وہ حاکم بھی ہے اور خادم بھی اور اس کا جذبۂ تسخیر کسی ادنیٰ خواہش کی بجائے اسی پیغام سے نمو پاتا ہے جو پروردگارِ عالم کے حکم کے مطابق اسے چودہ سو سال پہلے بطحا کی وادیوں میں سنایا گیا تھا۔''

''نطشے کے خیال میں انسانی معاشرے کا مقصد تمام افراد کی یکساں ترقی اور نشو و نما ہرگز نہیں ہے بلکہ وہ صرف بہترین اور طاقتور افراد کی ترقی کا حامی ہے۔ نطشے فوق البشر کی تعلیم و تربیت پر زور دیتے ہوئے فطرت سے یہ شکایت بھی کرتا ہے کہ وہ صرف اوسط اور ادنیٰ درجے کے افراد کی حفاظت کرتی ہے اور غیر معمولی افراد سے ہمیشہ لاپروائی برتتی ہے۔ نطشے کا فوق بشر خیر و شر کے معیار سے ماورا ہے۔ نطشے اس کی برتری کے لیے ہر قسم کی جنگ کو جائز اور درست قرار دیتا ہے۔'' (۱۶)

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا — نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

ولایت، پادشاہی، علمِ اشیا کی جہاں گیری — یہ سب کیا ہیں، فقط اک نکتۂ ایماں کی تفسیریں

(کلیاتِ اقبال، ص: ۴۲۴)

علامہ اقبالؒ نے ایمان کو ایک بے حد وسیع المعانی لفظ کے طور پر استعمال کیا ہے، وہ اللہ، اس کے رسول ﷺ، اس کی کتاب اور یومِ آخرت پر ایمان لانے کی تلقین کرتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ وہ چاہتے ہیں کہ ان کا انسانِ کامل اپنے آپ پر بھی ایمان لائے۔ یعنی من عرف نفسه فقد عرف ربه (۱۷) انسانِ کامل کی منزل کا ایک اہم زینہ ہے۔

اقبالؒ کا مردِ مومن ان کے نظریۂ معرفتِ نفس اور خُودی کا مظہر ہے۔ انھوں نے احساسِ خُودی اور عرفانِ نفس کے تصورات کو جس انداز سے بیان کیا ہے، مردِ کامل کی تشکیل اس کا منطقی نتیجہ تھا۔ اقبالؒ کا انسانِ کامل اس عالمِ رنگ و بو کا حکمران ہے اور کائنات کے تمام خزانے اس کے قدموں میں بکھرے پڑے ہیں لیکن وہ دیوانگی کے عالم میں دولتِ دنیا کی جانب نہیں بڑھتا بلکہ ایک شان بے نیازی سے اسے زیرِ قدم لاتا ہے۔

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ — غالب و کار آفریں، کار کشا، کار ساز
خاکی و نُوری نہاد، بندۂ مولا صفات — ہر دو جہاں سے غنی اس کا دل بے نیاز
اس کی امیدیں قلیل، اس کے مقاصد جلیل — اس کی ادا دل فریب، اس کی نگہ دل نواز
نرم دمِ گفتگو، گرم دمِ جستجو — رزم ہو یا بزم ہو، پاک دل و پاک باز
نقطۂ پرکارِ حق، مردِ خُدا کا یقیں — اور یہ عالم تمام، وہم و طلسم و مجاز

(کلیاتِ اقبال، صفحہ نمبر ۳۶۹)

مردِ مومن جب اپنی خُودی سے آشنا ہوتا ہے تو کائنات اس کے قدموں میں ہوتی ہے، قرآن میں انسان کو بار بار تسخیرِ کائنات کی تلقین کی گئی ہے۔ مردِ مومن عناصرِ فطرت کو اپنے ارادوں کے مطابق استعمال میں لاتا ہے، وہ زندگی اور ماحول کی تسخیر کے ذریعے اس کے ارتقا کا خواہش مند ہوتا ہے۔

عالم ہے فقط مومنِ جاں باز کی میراث
مومن نہیں جو صاحبِ لولاک نہیں ہے

(کلیاتِ اقبال، صفحہ نمبر ۵۷۳)

مہر و مہ و انجم کا محاسب ہے قلندر
ایام کا مرکب نہیں راکب ہے قلندر

(کلیاتِ اقبال، صفحہ نمبر ۳۸۸)

''اقبالؒ کا انسان کامل رمردمومن مثبت اندازفکر اورتوانا ذہنیت کا مالک ہے۔ وہ رُوحانی بلندنظری اور عالی حوصلگی کی علامت ہے، اقبال کا مردمومن سپاہی بھی ہے اور درویش بھی، حکمران بھی ہے اور قلندر بھی، وہ بلندحوصلہ بھی ہے اور بے نیاز بھی۔ جب وہ میدانِ عمل میں قدم رکھتا ہے تو قدرت اس کی فتح کا ساماں پیدا کرتی ہے، یہی انسان مردمومن زمین پر آسمان کی حکومت قائم کرتا ہے اور فرش کا ہم پایہ بناتا ہے۔''(۱۸)

وہ مردکامل میں صفات الٰہیہ کا نظارہ دیکھنا چاہتا ہے وہ قہاری کے ساتھ غفاری اور قدوسی کے ساتھ جبروت کا قائل ہے۔''

''اقبالؒ کے نزدیک ''مردمومن'' کا نصب العین یہ ہے کہ اس کی ذات میں جلالی اور جمالی صفات کی موزوں ترکیب موجود ہے، اس میں ندی کا سا جوش خرام ہے جس کی سیرت میں سخت کوشی اور نرمی کی آمیزش ہوتی ہے لیکن جہاں سبزہ ہو وہاں گنگناتی گزر جاتی ہے، مردمومن کی اس خصوصیت کو اقبالؒ اشعار کے سانچے میں ڈھال کر یوں پیش کرتے ہیں۔''(۱۹)

مصافِ زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کر	شبستانِ محبّت میں حریر و پرنیاں ہو جا
گزر جا بن کے سیلِ تند رَو کوہ بیاباں سے	گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا

(کلیات اقبال، بانگ درا، نظم طلوع اسلام، ص: ۲۱۲)

''یعنی اقبالؒ کا ''مردمومن'' سوز و ساز زندگی کا رمز شناس ہوتا ہے جو حالات کے مطابق اپنے آپ کو ڈھال لیتا ہے جہاں ضرورت پڑے تو فولاد کی طرح قوی ہو جاتا ہے اور جب اپنوں میں ہوتا ہے تو ریشم کی طرح ملائم ہو جاتا ہے۔''(۲۰)

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

(ضرب کلیم، صفحہ نمبر ۴۰)

اقبالؒ کے ہاں جو قوت کا تصور ہے وہ متوازن صورت میں ہے جبکہ نطشے کے ہاں یہ تصور انتہا کو چُھو رہا ہے جو اخلاقی قدروں کو پامال کرتا ہے، بقول عزیز احمد

"The conception of Neitzsehean Superman is a romantic in an extreme form. It denies the essential of indivdualisum." (21)

''موجودہ نوعِ انسان کو چاہیے کہ اپنے آپ کو منسوخ کر کے ایک نئی نوع کے خواص پیدا کرے

زندگی کو فوق البشر کا انتظار ہے جس کی اخلاقیات موجودہ اخلاقیات سے برعکس ہوں گی وہ تمام اقدار حیات کی نئی تقدیر کرے گا، وہ زندگی سے مقابلہ کرنے والا سخت کوشش، مشکل پسند اور مشکلات اور خطرات سے غذا حاصل کرے گا وہ نفس کو مادی جسمانی یا حیوانی قوتوں کا مظہر خیال کرتا تھا۔''(۲۲)

اقبال کا مردِ مومن واقعی ''سپر مین پر فوقیت'' رکھتا ہے: اقبال کا مردمومن (فوق البشر) سپر مین سے بالکل مختلف ہے اور اس کے برعکس ہے۔

''مردمومن ایمان و یقین کی قوت سے دنیا کو مسخر کرتا ہے، مردمومن کے ایمان کی یہ قوت اور یقین کی ناقابل تسخیر طاقت دنیا کے ان انسانوں سے جو شکوک و شبہات میں مبتلا ہیں ان سے اسے ممتاز کرتی ہے۔ وہ بزدلی کے مقابلے میں اپنی شجاعت و مردانگی کی وجہ سے تمام انسانوں سے مختلف ہے۔ مردمومن کا توحید پر ایمان اسے مال و زر کے غلاموں سے الگ ایک بلند مقام عطا کرتا ہے، اس کی آفاقیت اور انسانی دوستی وطن پرستی اور تعصّبانہ سوچ کی نفی کر دیتی ہے اور اس کی زندگی کی اقدار کا سرچشمہ دین اسلام ہے۔''

مردمومن اللہ کی ذات پر کامل ایمان کی بدولت، عزم و استقلال اور ناقابل شکست، جرأت و ہمت کا حامل ہوتا ہے اور راہِ حق میں بڑی بڑی طاقت کے بالمقابل عزم و ہمت کی ایک چٹان بن جاتا ہے، مردمومن کے اخلاق و کردار قرآنی ہوتے ہیں اس کی مثال قرآن پاک نے ان الفاظ میں دی ہے۔

ترجمہ: ''اس کی مثال ایسے پاک درخت کی ہے جس کی جڑیں جمی ہوں اور شاخیں آسمان کو چھو رہی ہوں۔ مردمومن کے کردار میں جلالی و جمالی دونوں صفات موجود ہوتی ہیں۔ وہ گفتار و کردار میں اللہ کی برہان ہوتا ہے۔ اقبالؒ نے جس مردمومن کا تصور پیش کیا وہ نائبِ خُدا اور خلیفۃ اللہ ہے وہی تخلیق کائنات کا مقصود ہے۔ حقیقی اور انسان کامل ہے وہ ان تمام اوصاف و کمالات سے متصف ہے جو مشیت الٰہی میں اس کے لیے امانت رکھے گئے اور جن کی بدولت اسے ''احسن التقویم'' کے معزز لقب سے نوازا گیا۔''

''علامہ اقبالؒ کے نزدیک تمام عالم کی رہنمائی صرف مردمومن ہی کو زیب دیتی ہے اسے پیدا ہی عالم کی حق کی جانب رہنمائی کرنے کے لیے کیا گیا تھا۔ مومن جو سچائی انصاف اور بہادری کا ایسا خوب صورت امتزاج ہے کہ دنیا کی کوئی بھی طاقت کوئی بھی شخص اور کوئی بھی حکومت اس کے مقابلے پہ ہیچ ہے۔''(۲۳)

مومن کے جہاں کی حد نہیں ہے
مومن کا مقام ہر کہیں ہے

(کلیات اقبال، بال جبریل، ص: ۳۹۵)

شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن
نہ مالِ غنیمت نہ کِشور کشائی

(کلیاتِ اقبال، بالِ جبریل، ص: ۳۹۷)

اقبالؒ کا مردِ مومن اولاً پیکرِ عشق ہے۔اقبالؒ کے مردِ مومن کا عشق صاحب عزم وعمل ہے یہ جہد مسلسل اور حرکت سے عبارت ہے۔اقبالؒ کا مردِ مومن وہ ہو ہی نہیں سکتا جو معرکہ حیات میں لرزہ براندام ہو جائے اور ہنگامِ عمل سے اس کے پائے استقلال میں لغزش آجائے۔اقبال کی نظر میں عشق تو وہ ناقابلِ تسخیر قوت ہے جو غلاموں کو بھی خودآگاہی کی دولت عطا کر کے ان پر اسرارِ شہنشاہی آشکار کر دیتی ہے۔

جب عشق سکھاتا ہے آدابِ خود آگاہی
کھلتے ہیں غلاموں پر اَسرارِ شہنشاہی

(۲۴)

اقبالؒ کے مردِ مومن کا ایک وصف اس کا اپنے اندر ایمان کے بعد ایقان کا پیدا کرنا بلکہ سرتاپا پیکر یقین ہونا ہے۔قرآن مردانِ حق کے ذکرِ الٰہی میں منہمک رہنے کی کیفیت کو یوں بیان کرتا ہے۔

ترجمہ: ”وہ اٹھتے بیٹھتے اور لیٹتے ہر حالت میں اللہ تعالیٰ کی یاد میں مگن رہتے ہیں۔“ (۲۵)

اقبالؒ کے مردِ مومن کا ایک امتیازی وصف پیکرِ استغنا ہے۔مومن کو استغنا تب نصیب ہوتا ہے جب کوئی سی بڑی مادی منفعت اور بڑے سے بڑا عہدہ ہو منصب اس کے دل کو للچا نہ سکے اور وہ ہر دنیوی منافع کو پائے حقارت سے ٹھکرا دے۔استغنا کو علامہ اقبالؒ نے اپنے ایک شعر میں معراجِ مسلمانی سے تعبیر کیا ہے۔

نہ ڈھونڈ اِس چیز کو تہذیبِ حاضر کی تجلّی میں
کہ پایا میں نے استغنا میں معراجِ مسلمانی

(۲۶)

جب علامہ اقبالؒ ساری کائنات کو مردِ مومن کی میراث قرار دیتا ہے۔مردِ مومن اللہ کا ہو جاتا ہے اور اللہ اس کا۔پھر ساری کائنات اس مردِ مومن کو اپنا مرکز ومحور بنا لیتی ہے۔آفاق اس کی ذات میں گم ہو جاتے ہیں۔کائنات کی ہر شے مومن کی متلاشی ہو جاتی ہے اور مومن اللہ کی رضا کا متلاشی ہوتا ہے۔

اقبالؒ کے مردِ مومن کا ایک وصف یہ ہے کہ وہ بارگاہِ ایزدی میں مظہریتِ حق سے سرفراز کیا جاتا ہے

جب وہ اپنے آپ کو رضائے مولا میں گم کر دیتا ہے اس طلب میں اپنی تمام خواہشات کو مٹا دیتا ہے تو پھر وہ اللہ تعالیٰ کے رنگ میں رنگ جاتا ہے۔

علامہ اقبالؒ عصرِ حاضر کے مسلمانوں کو متنبہ کرتے ہیں کہ جب تک تیری آرزوؤں کا مرکز غیر رہے گا تیری دعاؤں سے قضائیں نہیں بدل سکتیں۔ہاں جب تیری آرزو کا رُخ بدل جائے گا تو پھر تیری آرزو کے ساتھ قضائیں بدلتی جائیں گی اور تیری نگاہ جدھر اٹھے گی تقدیریں بدلنے کا باعث بنے گی۔

اک فقر سکھاتا ہے صیّاد کو نخچیری — اک فقر سے کھلتے ہیں اسرارِ جہاں گیری
اک فقر سے قوموں میں مسکینی و دلگیری — اک فقر سے مٹی میں خاصیتِ اکسیری
اک فقر ہے شبیری، اِس فقر میں ہے میری — میراثِ مسلمانی، سرمایہ شبّیری!

(۲۷)

اقبالؒ نے ہمیں وہ بھولا ہوا سبق یاد دلایا ہے جو زمانے کی گردش اور ادنیٰ اقدار کے تسلط کے زیر اثر ہمارے ذہن سے محو ہو گیا ہے۔نطشے کا سپرمین اپنی ذات میں کھویا ہوا ہے، لیکن اقبالؒ کا مردِ مومن ایسے نظام حیات کا ضامن ہے جس میں بندگی اور خواجگی کی کوئی حیثیت نہیں بلکہ وہ تمام مخالف قوتوں پر غلبہ پا کر اپنی حقیقی منزل تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔اس میں درویشی، فقر اور قلندری کے اوصاف موجود ہوتے ہیں اور وہ غرور و تکبر کا مجسمہ نہیں ہوتا۔یہ خصوصیت اس کے کردار اور گفتار میں نمایاں ہوتی ہے۔

یقیں پیدا کر اے ناداں! یقیں سے ہاتھ آتی ہے
وہ درویشی، کہ جس کے سامنے جھکتی ہے فغفوری

(۲۸)

الغرض، اقبال کا انسانِ کامل / مردِ مومن اپنی شخصیت اور کردار کے اعتبار سے نطشے کے سپرمین سے زیادہ متوازن اور حقیقی انسان ہے۔اقبال کا مردِ مومن رزم و بزم، ہر میدان کا شہ زور ہوتا ہے اگر حلقہ یاراں ہو تو بریشم کی طرح نرم ہو جاتا ہے اور اگر حق و باطل کا معرکہ آن پڑے تو صورتِ فولاد بن جاتا ہے اور مصافِ زندگی میں ہر چٹان سے ٹکرا جاتا ہے۔

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق

(۲۹)

حواشی

۱۔رابعہ سرفراز،اقبال آثار(فیصل آباد:قرطاس پبلشرز،۹نومبر ۲۰۰۳ء)ص:۱۲۲
۲۔اقبال،کلیات اقبال(لاہور:اقبال اکادمی پاکستان،۲۰۰۰ء)ص:۳۰۰
۳۔آصف جاہ جعفری،سیّد،مفکر پاکستان علامہ اقبال(لاہور:سوھنی دھرتی پبلشرز،۲۰۰۷ء)ص:۱۴۰
۴۔عبداللہ،سیّد،ڈاکٹر،مطالعہ اقبال کے چند نئے رخ(لاہور:بزم اقبال،۱۹۹۹ء)ص:۹۰
۵۔ابوالحسن ندوی،سیّد،مولانا،نقوش اقبال(کراچی:مجلس نشریات اسلام،ن۔د)ص:۱۳۶،۱۳۷،۱۳۸
۶۔عبداللہ،سیّد،ڈاکٹر،مسائل اقبال(لاہور:اردو اکیڈمی،۱۹۷۴ء)ص:۱۵۵،۱۵۶
۷۔خالدہ جمیل،مباحث اقبال(لاہور:اپنا ادراہ،۲۰۰۴ء)ص:۱۴۱،۱۴۲
۸۔یوسف حسین خان،ڈاکٹر،رُوح اقبال(لاہور:القمر انٹر پرائزز،مارچ ۲۰۱۰ء)ص:۱۸۵
۹۔ہارون الرشید،ڈاکٹر،قندیل اقبال(لاہور:مکتبہ تعمیر انسانیت،۲۱اپریل ۲۰۱۴ء)ص:۳۱۴
۱۰۔طاہر فاروقی،سیرت اقبال(لاہور:قومی کتب خانہ،۱۹۳۹ء)ص:۲۶۶
۱۱۔عزیز احمد،اقبال نئی تشکیل(لاہور:گلوب پبلشرز،۱۹۶۸ء)ص:۲۹۴
۱۲۔غلام عمر خان،ڈاکٹر،رُوح اسلام(کراچی:صفیہ اکیڈمی،۱۹۶۷ء)ص:۱۴۵
۱۳۔عابد علی عابد،شعر اقبال(لاہور:بزم اقبال،۱۹۵۹ء)ص:۴۴۵
۱۴۔حاتم رامپوری،ڈاکٹر،تصور بشر اور اقبال کا مرد مومن(نئی دہلی:مکتبہ جامعہ لمیٹڈ،۱۹۷۹ء)ص:۳۱۴
۱۵۔خالد اقبال یاسر،ڈاکٹر،جدید تحریکات اور اقبال(لاہور:ادارہ ثقافت اسلامیہ،۲۰۱۵ء)ص:۲۶۰
۱۶۔رابعہ سرفراز،اقبال آثار(فیصل آباد:قرطاس پبلشرز،۹نومبر ۲۰۰۳ء)ص:۱۲۳

۱۷۔رابعہ سرفراز،اقبال آثار(فیصل آباد:قرطاس پبلشرز،۹نومبر ۲۰۰۳ء)ص:۱۲۴
۱۸۔رابعہ سرفراز،اقبال آثار(فیصل آباد:قرطاس پبلشرز،۹نومبر ۲۰۰۳ء)ص:۱۲۶
۱۹۔خالدہ جمیل،مباحث اقبال(لاہور:اپنا ادارہ،۲۰۰۴ء)ص:۱۴۲،۱۴۳
۲۰۔خالدہ جمیل،مباحث اقبال(لاہور:اپنا ادارہ،۲۰۰۴ء)ص:۱۴۳
23."Studies in Iqbal's Thought and Art" Edited by M. Saeed Sheikh, P No: 107
۲۲۔عبدالحکیم،خلیفہ،ڈاکٹر،فکر اقبال(لاہور:بزم اقبال،۲۰۰۳ء)س:۳۵۳
۲۳۔محمد اکرم سعید،پروفیسر،اقبال کا خصوصی مطالعہ(لاہور:عبداللہ برادرز،۲۰۰۷ء)ص:۱۳۳،۱۳۴
۲۴۔محمد اقبالؒ،کلیات اقبال(اُردو)(لاہور:الفیصل ناشران،ذاہد بشیر پرنٹر،فروری ۲۰۰۶ء)ص:۴۲۰
۲۵۔قرآن مجید،آل عمران'۳:۱۹۱)
۲۶۔محمد اقبالؒ،کلیات اقبال(اُردو)(لاہور:الفیصل ناشران،ذاہد بشیر پرنٹر،فروری ۲۰۰۶ء)ص:۴۹۶
۲۷۔محمد اقبالؒ،کلیات اقبال(اُردو)(لاہور:الفیصل ناشران،ذاہد بشیر پرنٹر،فروری ۲۰۰۶ء)ص:۵۴۳
۲۸۔رابعہ سرفراز،اقبال آثار(فیصل آباد:قرطاس پبلشرز،۹نومبر ۲۰۰۳ء)ص:۱۲۷
۲۹۔رفیع الدین ہاشمی،ڈاکٹر،اقبال شناسی اور محور(لاہور:بزم اقبال،فروری ۱۹۸۹ء)ص:۱۵۸

علامہ اقبالؒ اور عقیدہ ختم نبوت ﷺ

(بحوالہ پانچویں خطبہ ''اسلامی ثقافت کی رُوح'')

ختم نبوت کا مفہوم

''جہاں اقبال پیغمبر اسلام ﷺ کی اس عظمت کے قائل ہیں کہ آپ عین ذات کو بے پردہ دیکھنے کی صلاحیت رکھتے تھے اور کائنات کے پردہ ہائے حجاب آپ کی نگاہوں پر سے اُٹھے ہوئے تھے:

سیّد کل ﷺ، صاحب اُم الکتاب
پردگیہا بر ضمیرش بی حجاب

(۱)

لیکن اس کے باوجود علم وتحقیق وتجسس اور رانسانی ارتقا کے لیے آپ کی خواہش کا یہ عالم تھا کہ

گرچہ عین ذات را بی پردہ دید
''رَبِّ زِدْنی'' از زبان او چکید

(کلیات اقبال (فارسی) پیام مشرق، صفحہ نمبر:۲۸۱)

اگرچہ آپ ﷺ عین ذات کو دیکھنے کی صلاحیت رکھتے تھے اور دیکھتے تھے لیکن اس کے باوجود آپ کی زبان پر اپنے علم میں اضافہ کی دعا جاری رہتی تھی۔

اس طرح علامہ اقبالؒ کے نزدیک یہ بھی جناب ختمی مرتبت کا امت مسلمہ بلکہ پورے عالم انسانیت پر احسان عظیم ہے کہ آپ نے ان پر سے پیغمبر کا بوجھ بھی اٹھا لیا اور اپنے بعد آنے والے نسل آدم کو یہ افتخار بخشا اور انھیں ذہنی بلوغت کی اس منزل پر فائز قرار دیا کہ اب انھیں کسی نبی کی ضرورت نہیں ہے بلکہ وہ ختمی مرتبت ﷺ تک کے پیغامات وحی والہام اور آخری پیغام قرآن مجید کی بنیاد پر اپنے مسائل حیات کا حل خود تلاش کریں۔

''لَا نَبِیَّ بَعْدِی'' ز احسانِ خُداست
پردۂ ناموس دین مصطفیٰ است

(کلیات اقبال (فارسی) رموز بےخُودی، صفحہ نمبر:۱۶۸)

رسول اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں، یہ اللہ عزوجل کا بہت بڑا احسان ہے اور یہ دین مصطفیٰ کے ناموس کا پردہ ہے۔قوم کو قوت ملتی ہے تو رسول ﷺ ہی سے ملتی ہے اور اسی سے قوم کا اتحاد اور ملّی قوت کو بقا ملتی ہے،

قوم را سرمایہ قوت ازو
حفظ سرّ وحدتِ ملّت ازو

(کلیات اقبال (فارسی) رموز بےخُودی، صفحہ نمبر:۱۶۸)

ختم نبوت کے ان معانی و مفاہیم کو اقبالؒ نے اپنے خطبوں میں زیادہ وضاحت سے پیش کیا ہے۔''(۲)

علامہ اقبالؒ نے اپنی تمام ذہنی و دماغی صلاحیتوں کو خدمتِ انسانیت اور دینِ اسلام کی اشاعت میں صرف کیا۔آپ مرتے دم تک عقیدہ ختم نبوت ﷺ کے مختلف پہلوؤں کے حق میں دلائل پیش کرتے رہے اور اس سلسلہ میں ناقابل فراموش خدمات سرانجام دیں۔علامہ اقبالؒ بہت بڑے عاشق رسول ﷺ تھے۔یہ جذبہ عشق رسول ﷺ ہی تھا جس نے علامہ اقبالؒ کو غفلت، بےیقینی اور دہریت کی دنیا سے نکال کر کامل اور سچا عاشق رسول ﷺ بنا دیا تھا۔علامہ اقبالؒ نے اپنی فارسی کتاب ''رموز بےخُودی'' میں نظم ''عرض حال مصنف بحضور رحمۃ للعالمین ﷺ''، لکھی جس سے اُن کی شخصیت کا پرتو کھل کر سامنے آجاتا ہے۔

ای ظہورِ تو شباب زندگی — جلوہ ات تعبیرِ خوابِ زندگی
ای زمین از بارگاہت ارجمند — آسمان از بوسۂ بامت بلند

شش جہت روشن زتابِ روی تو   ترک و تاجیک و عرب ہندوی تو

از تو بالا پایۂ این کائنات   فقرِ تو سرمایۂ این کائنات

در جہاں شمعِ حیات افروختی   بندگان را خواجگی آموختی

کلیاتِ اقبال (فارسی) رموزِ بےخُودی، صفحہ نمبر: ۲۵۱)

اقبالؒ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ کا ظہور (تشریف لانا) زندگی کا عہدِ شباب تھا اور آپ ﷺ کا جلوہ زندگی کے خواب کی تعبیر تھا۔ ہماری زمین نے اسی وجہ سے اونچا درجہ حاصل کر لیا کہ آپ ﷺ کی بارگاہ سے شرف پایا۔ فلک آپ ﷺ کے لبِ بام کو چومنے کی بدولت سربلند ہوا۔ اس کائنات کا ہر پہلو آپ ﷺ کے روئے مبارک کی چمک دمک سے روشن ہے۔ تُرک ہوں یا تاجک ہوں یا عرب ہوں، سب آپ ﷺ کے غلام ہیں۔ اس کائنات کا رتبہ صرف آپ کی بدولت اونچا ہوا اور اس کی دولت آپ کے فقر کے سوا کچھ نہیں۔ آپ ﷺ نے دنیا میں زندگی کا چراغ روشن کیا اور غلاموں کو آقائی کا طریقہ سکھایا۔

ای فروغت صبحِ اعصار و دہور

چشمِ تو بینندۂ مَا فِی الصُّدُور

کلیاتِ اقبال (فارسی) رموزِ بےخُودی، صفحہ نمبر: ۲۵۳)

علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ کی روشنی تمام زمانوں کے لیے صبح کا سروسامان ہے اور آپ کی آنکھ سینے کے اندر کی سب چیزیں دیکھ رہی ہے۔

''اسلامی ثقافت کی رُوح'' علامہ اقبالؒ کا ایک بصیرت افروز خطبہ ہے جو انگریزی میں The Spirit of Muslim Culture کے عنوان سے لکھا گیا ہے اور ان کی کتاب The Reconstruction of Religious Thought in Islam میں شامل ہے، علامہ اقبالؒ کے انگریزی خطبات کا یہ مجموعہ ۱۹۳۴ء میں شائع ہوا تھا، سیّد نذیر نیازی نے ان خطبات کا اردو ترجمہ ''تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ'' کے نام سے کیا ہے۔'' (۳)

''اسلامی ثقافت کی رُوح'' خطبے کے اہم نکات

ثقافت کے کچھ خارجی مظاہر ہوتے ہیں، جیسے رسم و رواج، لباس، ادب و فنون وغیرہ۔ ثقافت کے کچھ داخلی پہلو بھی ہوتے ہیں جن پر ثقافت بنی ہوتی ہے، علامہ اقبالؒ کے اس خطبہ میں چند اہم داخلی پہلوؤں کا ذکر کیا گیا ہے، اس خطبے کا موضوع اسلامی ثقافت نہیں بلکہ اس کی رُوح ہے یعنی جن عناصر نے باطنی طور پر اسلامی

ثقافت کی تشکیل میں حصہ لیا، صرف انہی کی تفصیل اس خطبے میں آئی ہے، خطبے کے اہم نکات مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ نبوت و ولایت کا فرق
۲۔ وحی و الہام کے مختلف مدارج
۳۔ عقیدۂ ختمِ نبوت کی اہمیت
۴۔ اسلام میں عقل کی اہمیت
۵۔ اسلام میں مطالعہ انفس و آفاق کی یکساں اہمیت
۶۔ ذرائع علم
۷۔ یورپی تہذیب پر اسلامی اثرات
۸۔ مسئلہ زمان و مکان
۹۔ مسئلہ ارتقا
۱۰۔ ابن خلدون کا نظریہ تاریخ
۱۱۔ اسلامی تعلیمات کا عالمگیر پہلو
۱۲۔ اسلامی ثقافت کے بارے میں اشپنگلر کی رائے اور اس پر تنقید (۴)

علامہ اقبالؒ نے اپنی تمام ذہنی و دماغی صلاحیتوں کو خدمتِ انسانیت اور دینِ اسلام کی اشاعت میں صرف کیا۔ وہ آخر دم تک عقیدہ ختمِ نبوت کے مختلف پہلوؤں کے حق میں دلائل پیش کرتے رہے اور اس سلسلہ میں ناقابلِ فراموش خدمات سرانجام دیں۔

''ایک اعتبار سے نبوت کی تعریف یوں بھی کی جا سکتی ہے کہ یہ شعورِ ولایت کی وہ شکل ہے جس میں وارداتِ اتحاد اپنے حدود سے تجاوز کر جاتیں اور ان قوتوں کو پھر سے رہنمائی، یا از سرِ نو تشکیل کے وسائل ڈھونڈتی ہیں جو حیاتِ اجتماعیہ کی صورت گر ہیں۔ گویا انبیا کی ذات میں زندگی کا متناہی مرکز اپنے لامتناہی اعماق میں ڈوب جاتا ہے۔ تو اس لیے کہ پھر ایک تازہ قوت اور زور سے ابھر سکے، وہ ماضی کو مٹاتا ہے اور پھر زندگی کی نئی راہیں اس پر منکشف کر دیتا ہے۔ لیکن اپنی ہستی اور وجود کی اساس سے انسان کا یہ تعلق اسی کے لیے مخصوص نہیں۔ قرآن مجید نے لفظ وحی کا استعمال جن معنوں میں کیا ہے ان سے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ وحی خاصۂ حیات ہے اور ایسا ہی عام جیسی زندگی۔ یہ دوسری بات ہے کہ جوں جوں اس کا گز مختلف مراحل سے ہوتا یا یوں کہیے کہ جیسے جیسے وہ ارتقا اور نشوونما حاصل کرتی ہے ویسے ہی اس کی ماہیت اور نوعیت بھی بدلتی رہتی ہے، یہ کسی پودے کا زمین کی پہنائیوں میں آزادانہ سر نکالنا، یہ کسی حیوان میں ایک نئے ماحول کے مطابق کسی نئے عضو کا نشوونما، یہ انسان کا خود اپنی ذات اور وجود میں زندگی کی گہرائیوں سے نُور اور روشنی حاصل کرنا، یہ سب وحی کی مختلف شکلیں ہیں جو اس لیے بدلتی چلی گئیں کہ اس کا تعلق جس فرد سے تھا یا جس نوع میں اس کا شمار ہوتا تھا اس کی مخصوص ضروریات کچھ اور تھیں۔ اب بنی نوع انسان کے عالمِ صغرسنی میں ایسا بھی ہوا کہ اس کی نفسی توانائی تو نشوونما شعور کی وہ صورت اختیار کر لے جسے ہم نے شعورِ نبوت سے تعبیر کیا ہے اور جس کے معنی یہ ہیں کہ اس شعور کی موجودگی میں نہ تو افراد کو

خود کسی چیز پر حکم لگانا پڑے گا نہ ان کے سامنے یہ سوال ہوگا کہ ان کی پسند کیا ہو اور ناپسندیدگی کیا۔ انھیں یہ بھی سوچنے کی ضرورت نہیں ہوگی کہ وہ اپنے لیے کیا راہِ عمل اختیار کریں۔ یہ سب باتیں گویا پہلے ہی سے طے شدہ ہوں گی۔ یہ نہیں کہ انھیں اس بارے میں خود اپنے فکر اور انتخاب سے کام لینا پڑے۔''(۵)

''شعورِ نبوت کو گویا کفایتِ فکر اور انتخاب سے تعبیر کرنا چاہیے لیکن جہاں عقل نے آنکھ کھولی اور قوتِ تنقید بیدار ہوئی تو پھر زندگی کا مفاد اسی میں ہے کہ ارتقائے انسانی کے اولین مراحل میں ہماری نفسی توانائی کا اظہار جن ماورائے عقل طریقوں سے ہوا تھا ان کا ظہور اور نشوونما رک جائے، انسان جذبات کا بندہ ہے اور جبلتوں سے مغلوب رہتا ہے۔''(۶)

''پیغمبرِ اسلام ﷺ کا مقام دنیائے قدیم اور جدید کے درمیان ایک واسطے کا ہے۔ بہ اعتبار اپنے سرچشمہ وحی کے آپ کا تعلق دنیائے قدیم سے ہے لیکن بہ اعتبار اس کی رُوح کے دنیائے جدید سے۔ یہ آپ ہی کا وجود ہے کہ زندگی پر علم و حکمت کے وہ تازہ سرچشمے منکشف ہوئے جو اس کے آئندہ رخ کے عین مطابق تھے۔ لہٰذا اسلام کا ظہور جیسا کہ آگے چل کر خاطر خواہ طریق پر ثابت کر دیا جائے گا، استقرائی عقل کا ظہور ہے۔ اسلام میں نبوت چوں کہ اپنی معراجِ کمال کو پہنچ گئی۔ لہٰذا اس کا خاتمہ ضروری ہوگیا۔ اسلام نے خوب سمجھ لیا تھا کہ انسان ہمیشہ سہاروں پر زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ اس کے شعورِ ذات کی تکمیل ہوگی تو یونہی کہ وہ خود اپنے وسائل سے کام لینا سیکھے، یہی وجہ ہے کہ اسلام نے دینی پیشوائی کو تسلیم نہیں کیا یا موروثی بادشاہت کو جائز نہیں رکھا یا بار بار عقل اور تجربے پر زور دیا، یا عالمِ فطرت اور عالمِ تاریخ کو علمِ انسانی کا سرچشمہ ٹھہرایا تو اس لیے کہ ان سب کے اندر یہی نکتہ مضمر ہے کیوں کہ یہ سب تصورِ خاتمیت ہی کے مختلف پہلو ہیں۔''(۷)

اسلامی ثقافت کی حقیقی رُوح کیا ہے؟

علم کی ابتدا محسوس سے ہوتی ہے کیوں کہ جب تک ہمارا ذہن اسے اپنی گرفت اور قابو میں نہیں لے آتا فکرِ انسانی میں یہ صلاحیت پیدا نہیں ہوتی کہ اس سے آگے بڑھ سکے۔''(۸)

"نوعِ انسان کے دورِ نابالغی میں فطرت نے تعلیم و تلقین کا یہی طریقہ استعمال کیا کہ افکار و اعمال کے معین سانچے ایک شخص کی فطرت میں رکھ دیے تاکہ وہ دوسروں کے لیے بے چوں و چرا اُسوۂ عمل بن جائے۔ لیکن ارتقا کے ایک درجے تک پہنچ کر فطرت نے یہ طریقہ ترک کر دیا جس کا ماخذ ماورائے عقل و استدلال تھا، انسانیت کے بلوغ میں فطرت کا تقاضا یہ تھا کہ انسان مشاہدے، مطالعے اور استقرا سے اپنے ماحول کو تسخیر کرے

اور ماورائے عقل ذرائع کو اس منزل میں ترک کر دے۔''(۹)

''بچوں کی طرح نبوت کی انگلی پکڑ کر قدم اٹھانا اس کی ترقی میں حارج ہوگا، اسی کے ساتھ بادشاہی بھی ختم ہوگئی اور کاہنوں اور پروہتوں کا اقتدار بھی واسوخت ہوگیا۔ بالغ انسانیت کے لیے اب یہ بھی غیر ضروری ہوگئے اور قرآن نے بالتکرار یہ تلقین شروع کی کہ تدبر اور تفکر کرو اور مشاہدہ انفس و آفاق سے اپنی زندگی کے لیے ہدایت حاصل کرو۔ اس کے ساتھ ہی تاریخِ انسانی سے بھی سبق لو۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ ولایت کے اندر جو رُوحانی وجدان و عرفان ہے اور جو نبوت میں بھی پایا جاتا ہے، اس کے دروازے بند ہوگئے ہیں، وہ دروازے بدستور رکھے ہیں۔''(۱۰)

''سہیل عمر فرماتے ہیں کہ اقبالؒ نے ''نبوت'' کی جو تعریف بیان کی ہے اس سے ظاہر ہے کہ وہ نبی کو ایک ''نابغہ'' سمجھتے ہیں۔ بظاہر نبی کا یہ تصور خُدا سے منقطع لگتا ہے اور ''سماجی مصلح'' یا ''تخلیقی فن کار'' سے زیادہ مشابہ معلوم ہوتا ہے مگر قرآنی اصطلاح کے نبی وہ شخص ہے جس پر خاص عنایتِ ربانی ہوا اور جسے اللہ کا پیغام فرشتہ کے وسیلے (یا دیگر ذرائع) سے نوعِ انسان کی ہدایت کے لیے دیا جائے۔۔۔۔۔''(۱۱)

''اسلام میں نبوت چوں کہ اپنے معراجِ کمال کو پہنچ گئی لہٰذا اس کا خاتمہ ضروری ہے اسلام نے خوب سمجھ لیا تھا کہ انسان ہمیشہ سہاروں پر زندگی بسر نہیں کر سکتا، اس کے شعورِ ذات کی تکمیل ہوگی تو یوں ہی کہ وہ خود اپنے وسائل سے کام لینا سیکھے۔ اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ اب نبوت کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ اس ضرورت کی تکمیل کا اہتمام خود قدرت نے رسول کریم ﷺ کی بعثت سے کیا ہے آپ ﷺ پر ایمان لانے کے بعد مزید کسی نبی پر ایمان لانے کی حاجت نہیں رہتی کیوں کہ آپ کی ہدایت ہر اعتبار سے کامل ہے اور ساری دنیا کے انسانوں کے لیے ہے خواہ ان کا تعلق کسی علاقے یا زمانے سے ہو حضور ﷺ پر نبوت کی تکمیل کر دی گئی۔''(۱۲)

اقبالؒ فرماتے ہیں کہ: ''ہندوستان کی سرزمین پر بے شمار مذہب بستے ہیں۔ اسلام دینی حیثیت سے ان تمام مذاہب کی نسبت زیادہ گہرا ہے کیوں کہ ان مذاہب کی بنا کچھ حد تک مذہبی ہے اور ایک حد تک نسلی۔ اسلام نسلی تخیل کی سراسر نفی کرتا ہے اور اپنی بنیاد محض مذہبی تخیل پر رکھتا ہے اور چوں کہ اس کی بنیاد صرف دینی ہے، اس لیے وہ سراپا رُوحانیت ہے اور خونی رشتوں سے کہیں زیادہ لطیف ہے اس لیے خطرناک ہیں۔ چناں چہ ہر ایسی مذہبی جماعت جو تاریخی طور سے اسلام سے وابستہ ہو لیکن اپنی بنیاد نبوت پر رکھے اور بزعمِ خود اپنے الہامات پر اعتقاد نہ رکھنے والے تمام مسلمانوں کو کافر سمجھے مسلمان اسے اسلام کی وحدت کے لیے ایک خطرہ تصور کرے گا

اور یہ اس لیے کہ اسلامی وحدت ختم نبوت ہی سے استوار ہوتی ہے۔'' (۱۳)

''عقیدہ ختم نبوت کے حوالے سے اقبال نے جو دلائل پیش کیے ہیں ان کو مکمل طور پر احاطہ تحریر میں لانا ایک مشکل امر ہے، جو دلائل ایک سمندر کی مانند ہیں۔ اختصار کے پیش نظر ہم نے اس کے چند سطروں پر ہی قناعت کی ہے۔'' (۱۴)

''ڈاکٹر صاحب کو رسول ﷺ کی نبوت پر اعتقاد ہی نہ تھا بلکہ آپ کے ساتھ انتہا درجہ کا عشق تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب حضور ﷺ کا نام مبارک کسی کی زبان پر آ جاتا تو ان کی آنکھیں بے اختیار اشک بار ہو جاتیں۔'' (۱۵)

''اقبالؒ نے ختم نبوت کو عقیدے کے طور پر ماننے کے ساتھ ساتھ اس بات پر بھی زور دیا ہے کہ ہم اس عقیدے کی بدولت تہذیب و تمدن کی دنیا میں رونما ہونے والے انقلاب کا گہرا شعور بھی اپنے اندر پیدا کریں تاکہ ہم اپنی سیاسی، اجتماعی، اخلاقی اور رُوحانی زندگی کی عمارت اس عقیدے کی بنیاد پر تعمیر کر سکیں۔ نبوت اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کی جاتی ہے۔ نبوت ایک منصب کہ رُوحانی اور مادی دنیا کی اصلاح اور تعمیر جس کی ذمہ داری ہے۔ نبوت کا مقصد اللہ کے عطا کردہ علم اور حکمت کی روشنی میں ایک نئی اخلاقی فضا کا قیام ہے، جس میں پرورش پا کر فرد اپنے کمال تک پہنچتا ہے۔۔۔۔۔۔ اسلام الہامی دین ہے، اس کا ماخذ وحی ربانی ہے، اس لیے اس کے زیر اثر پروان چڑھنے والی تہذیب و ثقافت کا مطالعہ اسلام کے دو بنیادی عقیدوں، نبوت و رسالت اور حضور اکرم ﷺ کی ختم نبوت کی روشنی میں اس پر بحث کرنا ایسا کارنامہ ہے جس میں غالباً کوئی دوسرا مفکر اقبالؒ کا شریک نہیں۔'' (۱۶)

"ختم نبوت کے معنی یہ ہیں کہ کوئی شخص بعد اسلام اگر یہ دعویٰ کرے کہ مجھ میں ہر دو اجزا نبوت کے موجود ہیں یعنی یہ کہ مجھے الہام وغیرہ ہوتا ہے اور میری جماعت میں داخل نہ ہونے والا کافر ہے تو وہ شخص کاذب ہے۔" (۱۷)

سلسلہ نبوت اسلام میں یہ عقیدہ بنیادی حیثیت رکھتا ہے کہ چوں کہ وہ وحی جو پیغمبر اسلام پر نازل ہوئی، مکمل تھی۔ اس لیے مزید کسی وحی کی ضرورت نہیں، وہ خاتم الانبیا اور نبی آخر الزماں تھے۔ اس عقیدے کی حکمت بیان کرتے ہوئے اقبال کہتے ہیں کہ

''آپ کی بدولت زندگی پر علم و حکمت کے وہ نئے سرچشمے منکشف ہوئے جو اس کے آئندہ رخ کے عین مطابق تھے۔'' (۱۸)

علامہ اقبالؒ نے ختم نبوت کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار جن الفاظ میں کیا ان کی مذکورہ بالا تعبیر جس کا لب لباب یہ ہے کہ دور جدید میں انسان کی ہدایت کے لیے وحی کی جگہ عقل نے لے لی، ان کے لیے بالکل قابل قبول نہیں ہوگی، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب وہ اپنے خطبات تیار کر رہے تھے تو انھیں اس بات کا قطعاً اندازہ نہیں ہوگا کہ ان کے خیالات کی یہ تعبیر بھی ہو سکے گی۔''

رسول اکرم ﷺ کے بارے میں اقبال کہتے ہیں کہ:

''بہ اعتبار سرچشمہ وحی کے آپ ﷺ کا تعلق دنیائے قدیم سے ہے لیکن بہ اعتبار اس کی رُوح کے آپ کا تعلق دنیائے جدید سے ہے، یہ جملہ میرے نزدیک بہت پر معنی ہے۔ یہ ایسے مضمرات کا حامل ہے کہ ان کو کھول کر بیان کر دینے سے ختم نبوت کا ایک ایسا تصور سامنے آئے گا جس کو شاید آپ اقبالؒ سے آگے کچھ فکری پیش قدمی کہہ سکیں۔ وحی محمدی ﷺ کی رُوح کے بارے میں اقبالؒ کہتے ہیں کہ اس قدر و قیمت کا فیصلہ یہ دیکھ کر بھی کر سکتے ہیں اس کے زیر اثر کس قسم کے انسان پیدا ہوئے اور تہذیب و تمدن کی وہ کیا دنیا تھی جو اس رُوح کی بدولت ظہور میں آئی۔'' (۱۹)

کی محمد ﷺ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں
(کلیات اقبال، صفحہ نمبر ۲۰۸)

حواشی

۱۔ نواب عالم بارہوی، سیّد، کرنل، بصیرت اقبالؒ (راولپنڈی، آرمی ایجوکیشن پریس، ۱۹۹۰ء) ص: ۱۶۱
۲۔ نواب عالم بارہوی، سیّد، کرنل، بصیرت اقبالؒ (راولپنڈی، آرمی ایجوکیشن پریس، ۱۹۹۰ء) ص ۱۶۱
۳۔ علامہ اقبال کی تحریروں کا متن، ۷۰۳ (اسلام آباد: علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، شعبہ اقبالیات، ۲۰۰۵ء) ص: ۳۱
۴۔ علامہ اقبال کی تحریروں کا متن، ۷۰۳ (اسلام آباد: علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، شعبہ اقبالیات، ۲۰۰۵ء) ص: ۳۲، ۳۳

۵۔نذیر نیازی، سیّد، تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، (لاہور: بزم اقبال، ۲ کلب روڈ، ۲۰۱۲ء) ص:۱۹۱

۶۔نذیر نیازی، سیّد، تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، (لاہور: بزم اقبال، ۲ کلب روڈ، ۲۰۱۲ء) ص:۱۹۲

۷۔نذیر نیازی، سیّد، تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، (لاہور: بزم اقبال، ۲ کلب روڈ، ۲۰۱۲ء) ص:۱۹۳

۸۔نذیر نیازی، سیّد، تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، (لاہور: بزم اقبال، ۲ کلب روڈ، ۲۰۱۲ء) ص:۱۹۸

۹۔عبدالحکیم، خلیفہ، ڈاکٹر، تلخیص خطبات اقبال (لاہور: بزم اقبال، جون، ۱۹۸۸ء) ص:۱۰۰

۱۰۔عبدالحکیم، خلیفہ، ڈاکٹر، تلخیص خطبات اقبال (لاہور: بزم اقبال، جون، ۱۹۸۸ء) ص:۱۰۱

۱۱۔جاوید اقبال، ڈاکٹر، خطبات اقبال، تسہیل و تفہیم (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء) ص:۱۶۳

۱۲۔شعبہ اقبالیات، تسہیل خطبات اقبال (اسلام آباد: علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، ۱۹۹۷ء) ص:۱۴۵

۱۳۔رئیس احمد جعفری، اقبال اور سیاست ملی (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۸۱ء) ص:۳۱۲

۱۴۔رابعہ سرفراز، اقبال آثار (فیصل آباد: قرطاس، ۹ نومبر، ۲۰۰۳ء) ص:۲۰۵

۱۵۔عبدالسلام ندوی، مولانا، اقبال کامل (لاہور: الفیصل ناشران و تاجران کتب، ۲۰۰۸ء) ص:۶۶، ۶۷

۱۶۔محمد وسیم انجم، ڈاکٹر، مطالعہ اقبالیات (راولپنڈی: انجم پبلشرز، ۲۰۰۷ء) ص:۱۲۷

۱۷۔محمد وسیم انجم، ڈاکٹر، مطالعہ اقبالیات (راولپنڈی: انجم پبلشرز، ۲۰۰۷ء) ص:۱۳۵

۱۸۔مرتبین، رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر، محمد سہیل عمر، ڈاکٹر وحید عشرت، اقبالیات کے سو سال (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۱۲ء) ص:۴۵۶

۱۹۔مرتبین، رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر، محمد سہیل عمر، ڈاکٹر وحید عشرت، اقبالیات کے سو سال (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۱۲ء) ص:۴۵۷

علامہ اقبالؒ کی مغربی تہذیب پر تنقید

سیاسی غلامی کا دائرہ کار انفرادی اور اجتماعی زندگی کے تمام پہلوؤں پر اثر انداز ہوتا ہے۔غلام قوم کے لوگ سوچنے سمجھنے اور عمل کرنے میں دوسروں کی پیروی کے قائل ہو جاتے ہیں اور اس کا اثر اس قدر گہرا ہوتا ہے جس قدر غلامی کا دورانیہ زیادہ ہوتا ہے۔علامہ اقبالؒ جس قوم کے مُصلح تھے وہ صدیوں تک حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں رکھنے کے بعد برسوں تک غلامی کی چکی میں پس رہی تھی۔کم و بیش تین سو برس سے اُمت مسلمہ خصوصاً ایسا متواتر رو بہ زوال رہی جبکہ یورپی اقوام میں فکر و عمل کی کوششیں پروان چڑھتی گئیں اور مسلمانوں میں علوم و فنون کی ترقی مسدود ہوگئی۔ایسے میں طبقہ اشرافیہ نے بہادر اور قومی آقاؤں کی پیروی کرنے کو ہی منزل مقصود سمجھ لیا اور تمام شعبۂ ہائے زندگی میں ارادی یا غیر ارادی طور پر اس امر کے قائل ہو گئے کہ زندگی کی طاقت اور جان بخشی اسی میں ہے کہ مغربی اقوام کے طور طریقوں کو اپنایا جائے اور انہی سے مشابہت و مماثلث اختیار کی جائے۔

سمجھ رہے ہیں وہ یورپ کو ہم جوار اپنا
ستارے جن کے نشیمن سے ہیں زیادہ قریب!
(کلیات اقبال (اُردو) بالِ جبریل، صفحہ:۱۹۱)

بعض مؤرخین اس بات کو بڑی فراخ دلی سے قبول کرتے ہیں کہ یورپ نے اپنی بیداری کی شروعات اسلامی کتب کے عربی سے لاطینی میں تراجم سے کی اور کئی مترجم کتابیں ان کی درسگاہوں کی زینت بھی رہیں۔اہل مغرب نے مُسلم دنیا سے ہی علم میں مشاہدے، تجربے اور استعمال سیکھے اور ترقی کی نئی منازل کو سر کرنے لگے جب کہ مسلمان عیش و نشاط میں کھو گئے اور اپنی زندگی کا اصل مقصد بھلا بیٹھے اور اس کے نتیجے میں

مُسلمانوں میں فکر وعمل کی سعی کا جذبہ سرد پڑ گیا اور ان کے انحطاط کا آغاز ہو گیا ان کے برعکس یورپی اقوام علوم و فنون کی شمعیں لے کر میدانِ عمل میں آ کھڑی ہوئیں۔

بُجھ کے بزمِ ملّتِ بیضا پریشان کر گئی
اور دِیا تہذیبِ حاضر کا فروزاں کر گئی

(کلیات اقبال (اُردو) بانگ درا، صفحہ:۷۸)

بلاشبہ آج یورپی تہذیب ترقی کے حوالے سے بلندیوں کو چُھو رہی ہے اور مادی دنیا کی رنگا رنگ تسخیریں انسان کو سحر زدہ کر دیتی ہیں مگر اس ظاہری چمک ودمک اور انتہائی ترقی کا باطن اتنا ہی اندھیرا اور تاریک ہے۔ اس ترقی کے نتیجے میں اخلاقی اقدار اس معاشرے سے بالکل ختم ہو گئیں ہیں۔ بے پناہ ترقی اور آسائش سے بھرپور زندگی کے باوجود بھی مغربی انسان سکون کے مزے سے انجان ہے۔

مسلماں کو مسلماں کر دیا طوفان مغرب نے
تلاطم ہائے دریا ہی سے ہے گوہر کی سیرابی

(کلیات اقبال (اُردو) بانگ درا، صفحہ:۱۳۶)

ترقی کے جنون میں خاندانی نظام زبوں حالی کا شکار ہو گیا۔ طلاق کی شرح دن بدن بڑھ رہی ہے اور اس کا زیادہ اثر بچوں کی ذہنی اور جسمانی نشو ونُما پر پڑتا ہے۔ وہ والدین کی شفقت اور توجہ سے محروم ہو جاتے ہیں اور عدم توجہی کے باعث جرائم پیشہ اور اخلاقی بے راہ روی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ عورت کو بہت آزاد کر کے اسے ترقی اور آزادیِ نسواں قرار دیا اور مرد کے ہاتھوں کٹھ پتلی بنا دیا۔ عورت کی سوچ کہ مرد کے شانہ بشانہ کھڑا ہونے کے لیے سب کچھ کرنے پر آمادہ اور راغب ہو جاتی ہے۔ دوسری طرف بزرگوں کو اولڈ ہومز/نرسنگ ہومز میں ہی پناہ ملتی ہے کہ ان کی اولادیں ان کو وقت دینے سے قاصر ہیں۔ یہی ایسی تلخ اور دل خراش حقیقتیں ہیں جن کی بنیاد پر علامہ اقبالؒ نے مغرب کو کڑی تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔

یورپ میں بہت روشنیِ علم و ہُنر ہے
حق یہ ہے کہ بے چشمۂ حیواں ہے یہ ظُلمات

(کلیات اقبال (اُردو) بال جبریل، صفحہ ۲۰۵)

''مغربی تہذیب جس سے مراد زیادہ تر وہ تہذیب وتمدن ہے جو گزشتہ تین سو سال میں پیدا ہوا، زیادہ تر عقلیت، مادیت یا نیچریت کی پیداوار ہے لیکن عقلیت جو اپنے کمال اور کُلیت میں بھی پوری طرح

حقیقت رس نہیں ہو سکتی اسے مغرب نے اور زیادہ محدود ومحصور کر دیا۔ اس نے فقط مادی فطرت کے مظاہر کا مشاہدہ اور مطالعہ کیا اور اس کے قوانین کا ادراک کرنے کے بعد اس کو زیادہ تر مادی اور جسمانی اغراض کے لیے مسخر کیا، اس تسخیر نے مغرب کو مادی حیثیت سے غیر معمولی طاقت بخشی۔ اس اقتدار اور تسخیر سے سرشار ہو کر اس نے علمی اور عملی طور پر نظریہ حیات قائم کر لیا کہ عالم مادی یا عالم محسوسات ہی حیثیت کلی ہے۔ حاضر کے باہر غائب کوئی چیز نہیں، یہاں تک کہ انسان اپنی رُوح ہے کے وجود سے منکر ہو گیا، اس کا نتیجہ وہی ہوا جو عارف رومی کے ارشادات میں ملتا ہے، علم ایک بے طرف قوت ہے، وہ حکمت رُوحانی اور عشق الٰہی کے ساتھ یار جان ہو سکتا ہے لیکن خالی علم وہنر سے وہ زیرکی پیدا ہوتی ہے جو ابلیس کی صفت ہے۔"(۱)

''انیسویں صدی کے اَواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں مسلم نوجوانوں میں مغربی تعلیم اور تربیت کا شوق ہوا جس کے نتیجے میں وہ یونیورسٹیوں کا رخ کرنے لگے اس سے اتنا فائدہ ہوا کہ فاتح قوم کا خوف اور دہشت ان کے دل سے نکل گئی، علمی روابط بڑھے، ثقافتی تعلقات پیدا ہوئے اور مغربی تعلیم گاہوں میں مقیم رہ کر اونچی سے اونچی تعلیم حاصل کی جانے لگی اور اس طرح مغربی ماہرین کی نگرانی میں انھوں نے مغرب کو بہت قریب سے دیکھا اور پرکھا اور مغربی زندگی کی ہر قدر کو پہچاننے کی کوشش کی۔''(۲)

''فلسفہ، شعر وادب اور دوسرے نظامِ فکر کے ذریعے مغربی تہذیب کے اسرار و رموز اس کا مادہ پرستانہ مزاج، خود پسند قومیت اور جانبدرانہ وطنیت کو بھی دیکھا، مغربی تہذیب کے دوسرے کمزور پہلو افلاس اقدار اور تہذیب کے زوال کے آثار بھی ان کے سامنے آئے، انھیں ان تعمیری قدروں کا بھی خیال پیدا ہوا جن سے یہ تہذیب خالی تھی اور اس کے راہنما بھی ان سے غافل تھے۔"(۳)

''ایمان کی دبی ہوئی چنگاری آخر جب بھڑکی تو جدید تعلیم یافتہ طبقے میں مغرب کی طرف سے مایوسی پیدا ہوئی اور گہری، صحیح اور جرأت مندانہ تنقید کی طاقت بیدار جو مبالغہ اور واقعات وحقائق کے انکار سے خالی تھی۔ اقبال ان باغی ناقدین کی صف اوّل میں تھے۔ عالم اسلامی نے اس سو سال میں جدید طبقہ میں شاید ان سے بڑا کوئی دیدہ ور نہیں پیدا کیا بلکہ وہ عصر حاضر کے مشرق کے سب سے بڑے مفکر وفلسفی ہیں۔ ہم دوسرے تمام مشرقی فضلا میں مغربی تہذیب پر اقبالؒ کی طرح گہری نگاہ اور ان جیسا جرأت مندانہ تنقیدی نقطہ نظر ڈھونڈنے سے بھی نہیں پا سکتے۔ اقبالؒ نے فرنگی تہذیب کی بنیادی کمزوریوں، اس کے دبتے ہوئے پہلوؤں اور اس عنصری فساد اور بگاڑ کو دیکھ لیا تھا جو اس کی سرشت اور اس کی طنیت میں موجود تھے۔ انھوں نے دیکھا کہ مغربی تہذیب سے متاثر ذہن مذہب اور اخلاقی ورُوحانی اقدار کے ساتھ کیسا معاملہ کرتا ہے۔ انھوں نے فسادِ قلب ونظر کو اس

تہذیب کی رُوح کی ناپاکی کا ثمر بتایا ہے جس نے اس سے قلبِ سلیم کی دولت چھین لی۔'' (۴)

فسادِ قلب و نظر ہے فرنگ کی تہذیب   کہ رُوح اس مدنیّت کی رہ سکی نہ عفیف
رہے نہ رُوح میں پاکیزگی تو ہے ناپید   ضمیرِ پاک و خیالِ بلند و ذوقِ لطیف

(کلیاتِ اقبال (اُردو) ضربِ کلیم، صفحہ: ۵۷۸)

وہ کہتے ہیں کہ تہذیب کی رونق و بہار حکومتوں کی وسعت اور اقتدار کے باوجود اس تہذیب کے زیر سایہ دوامی بے چینی و اضطراب سے چھٹکارا نہیں۔ برق و بخارات اس کی پوری فضا پر دھند کی طرح چھا گئے ہیں، بجلی کی روشنی ضرور ہے لیکن اس سے کوئی فکری راہ روشن نہیں اور نہ عالمِ غیب کی نُورانیت کی اس میں کوئی جھلک ملتی ہے۔

یہ عیشِ فراواں، یہ حکومت یہ تجارت   دل سینۂ بے نُور میں محرومِ تسلّی
تاریک ہے افرنگ مشینوں کے دُھویں سے   یہ وادیِ ایمن نہیں شایانِ تجلّی
ہے نزع کی حالت میں یہ تہذیبِ جواں مرگ   شاید ہوں کلیسا کے یہودی مُتولّی!

(کلیاتِ اقبال (اُردو) ضربِ کلیم، صفحہ: ۶۸۴)

اقبالؒ نے اس پر بہت زور دیا کہ لادینی تہذیب کی اساس ہی دین و اخلاق کی دائمی دشمنی پر ہے اور ہر زمانے میں مادیت کے بتکدے میں نئے بت تراشنا اس کا محبوب مشغلہ ہے۔ اقبالؒ ''مثنوی پس چہ باید کرد'' میں فرماتے ہیں کہ یہ بے خُدا تہذیب ہمیشہ اہلِ حق کے ساتھ نبرد آزما رہی ہے۔ یہ فتنۂ روزگار حرم میں لات وعزیٰ کے صنم کو جگہ دے کر ہمیشہ نئے نئے فتنے پیدا کرتا رہا ہے قلب اس کے سحر سے بے بصیرت اور رُوح سرابِ تشنگی سے ہلاک ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس سے دل کی تب وتاب ہی نہیں ختم ہوتی بلکہ قالب ہی اس سے خالی ہو جاتا ہے۔ یہ وہ دزدِ دلاور ہے جو دن دھاڑے ڈاکا ڈالتا اور انسان کو بے رُوح اور بے قیمت بنا کر رکھ دیتا ہے۔

''وہ کہتے ہیں کہ اس تہذیب کا شعار انسانیت کی تباہی اور نوعِ بشری کی ہلاکت اور اس کا پیشہ تجارت ہے۔ مغربی تہذیب کے ہوتے ہوئے دنیا میں امن و اطمینان، پاک محبت اور خالص خُدا پرستی ممکن نہیں۔'' (۵)

نئی تہذیب کا خاص نشانہ وہی انسان ہے جو اس کی گرمیٔ بازار کا سبب اور اس کی تجارت کا آلہ کار ہے۔ یہ بلند معیارِ زندگی اور بڑھتے ہوئے مصرف ان چالاک یہودیوں کے مکر کی پیداوار ہیں جس نے نبی آدم

کے دل سے حق کی روشنی چرالی ہے۔ عقل، تہذیب اور دین و مذہب اس وقت تک محض خواب ہیں جب تک کہ یہ موجودہ نظام سرے سے نہیں بدل دیا جاتا۔

تہذیبِ حاضر اپنی عمر کے لحاظ سے جوان ہے، لیکن دراصل عالمِ نزع میں موت کی ہچکیاں لے رہی ہے۔

''اقبالؒ مغربی معاشرے کی تصویر کشی کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس میں حرکت اور ترقی بغیر طبقاتی اور وحشیانہ مقابلے کے ممکن نہیں۔ دینی اور سیاسی قدروں کی تفریق اور دین و دنیا کی علیحدگی کے تصور نے اس کی وحدت ختم کر دی ہے۔ وہ ہر صاحبِ نظر کی طرح سرمایہ داری اور اشتراکیت دونوں کی مادیت ہی کی دو شکلیں سمجھتے ہیں جس میں ایک مشرقی اور دوسری مغربی ہوتے ہوئے بھی مادیت اور محدود انسانیت کے نقطے پر مل جاتی ہے۔ وہ جاوید نامہ میں سیّد جمال الدین افغانی کی زبان سے کہتے ہیں کہ مغرب رُوحانی قدروں اور غیبی حقائق کو کھو کر رُوح کو معدے میں تلاش کر رہا ہے، حالاں کہ رُوح کی قوت و حیات کا جسم سے کوئی تعلق نہیں لیکن اشتراکیت کی نظر بطن و معدہ سے آگے جاتی ہی نہیں اور وہ حد سے حد مساواتِ شکم ہی تک سوچتی ہے۔ اُخوتِ انسانی کی تعمیر مادی و معاشی مساوات پر ممکن نہیں بلکہ اس کے لیے قلبی محبت، انسانی اقدار اور معنوی و رُوحانی بنیادوں کی بھی ضرورت ہے۔'' (۶)

ظاہر میں تجارت ہے، حقیقت میں جوا ہے   سود ایک کا لاکھوں کے لیے مرگِ مفاجات
یہ علم، یہ حکمت، یہ تدبر، یہ حکومت   پیتے ہیں لہو، دیتے ہیں تعلیمِ مساوات
بیکاری و عریانی و مے خواری و افلاس   کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کے فتوحات

(۷)

''بلاشبہ آج امریکا، انگلستان، فرانس اور دیگر یورپی ممالک سائنسی ترقی کی معراج پر ہیں اور مادی دنیا کی گوناگوں ترقیاں دیکھنے والوں کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیتی ہیں لیکن افسوس صد افسوس کہ اس نظامِ حیات میں دلوں اور رُوحوں کی دنیا اجڑ کر رہ گئی ہے۔ یورپ کا انسان تمام تر مادی سہولتوں کے باوجود آج بے حد پریشان حال ہے۔ خاندانی زندگی درہم و برہم ہونے کی وجہ سے بوڑھے لوگ نرسنگ ہومز میں ذہنی مریض بن کر زندہ درگور ہو جاتے ہیں اور ان کا کوئی عزیز یا رشتے دار کرسمس کی تقریب میں بھی انھیں ملنے کی زحمت نہیں کرتا۔" (۸)

"مغربی تہذیب کی مزاج دانی نے اقبالؒ کو زندگی کے بنیادی مسائل کی طرف کچھ زیادہ ہی متوجہ کیا ہے اور ان کے فکر و فن میں صحیح انسان دوستی کی لہر دوڑا دی ہے اور انھیں صحیح معنوں میں ایک ایسا انقلابی شاعر بنا دیا ہے جو زندگی کا گہرا شعور رکھتا ہے۔ جس کے پیش نظر سرمایہ و محنت کی کشمکش کا وہ تمام نقشہ موجود ہے جو طبقاتی

تفریق کوختم کر کے ایک نئے نظام اقدار کو قائم کرنے کا خواب دیکھتا ہے اوران تمام باتوں کو عملی شکل دینے کے لیے انقلاب کا نعرہ بلند کرتا ہے۔"(۹)

خلیفہ عبدالحکیم صاحب لکھتے ہیں:

''اقبالؒ کے ہاں مغربی تہذیب میں خوبی کا کوئی پہلو نظر نہیں آتا اس کے اندر اور باہر فساد ہی فساد دکھائی دیتا ہے گویا یہ تمام کارخانۂ ابلیس کی تجلی ہے، بعض نظمیں تو خالص اسی مضمون کی ہیں۔''

خلیفہ عبدالحکیم صاحب مزید لکھتے ہیں:

''اقبالؒ مغرب کے عیوب کے ساتھ ساتھ اس کی خوبیوں سے بھی واقف اور ان کا مداح تھا، وہ چاہتا تھا کہ مسلماں وہ خوبیاں اپنے اندر پیدا کریں۔

''علامہ اقبالؒ یورپ کو شیطان کی کارگاہ اسی لیے کہتے ہیں کہ یورپ نے مادہ پرستی کے نظریات کو فروغ دے کر چھینا جھپٹی کو تہذیب وتمدن کی علامت بنا کر پورے عالم انسانیت کو بنیادی قدروں سے محروم کر دینے میں بڑا پُرزور کردار ادا کیا ہے۔''(۱۱)

''پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات گرامی کی حیثیت دنیائے قدیم وجدید کے درمیان ایک واسطہ ہے۔ بہ اعتبار اپنے سرچشمۂ وحی کے آپ کا تعلق دنیائے قدیم سے ہے لیکن بہ اعتبار اس کی رُوح کے دنیائے جدید سے یہ آپ ہی کا وجود ہے کہ زندگی پر علم وحکمت کے وہ تازہ سرچشمے منکشف ہوئے جو اس کے آئندہ رخ کے عین مطابق تھے۔۔۔۔۔۔۔اسلام کا ظہور استقرائی عقل کا ظہور ہے۔''(۱۲)

''اقبالؒ کے یہاں مغرب کے بے شمار مصلحین ومفکرین اور شعرا وعلما کا ذکر ملتا ہے، اقبالؒ نے سب کو داد دی ہے اور جس دے جو کچھ لیا ہے اس کا اعتراف کیا ہے۔''(۱۳)

پیر مغاں! فرنگ کی مے کا نشاط ہے اثر — اس میں وہ کیفِ غم نہیں، مجھ کو تو خانہ ساز دے
تجھ کو خبر نہیں ہے کیا ؟ بزمِ کہن بدل گئی — اب نہ خُدا کے واسطے ان کو مئے مجاز دے

(کلیات اقبال، بانگ درا، پیام، صفحہ ۱۱۳)

علامہ اقبالؒ جب اپنی قوم وملّت کے افراد کو مغربی تہذیب کی طرف جاتے ہوئے دیکھتے ہیں تو بے چین ہو جاتے ہیں اور اس المیے پر آنسو بہاتے ہیں۔ علامہ اقبالؒ کو غم ہے تو یہی کہ تہذیب مغرب جو زندگی سے ایک فرار ہے، اس نے ہماری قوم کے افراد اور خصوصاً نوجوانوں کو تن آسان بنا دیا ہے، خُودی ان میں باقی نہیں رہی ہے اور اس وجہ سے ان کی حیثیت ایک ایسے نیام کی رہ گئی ہے جو زرنگار تو ضرور ہے لیکن جو بے شمشیر

ہے۔ علامہ اقبالؒ تو اپنے ہر نوجوان کو ایک شمشیر کی صورت میں دیکھنا چاہتے ہیں تا کہ حق وباطل کی اس جنگ میں اپنے جوہر دکھا سکے جو اس وقت دنیا میں جاری ہے اور جس کے مضر اثرات سے ہر فرد پریشان حال ہے۔ ان کے خیال میں تہذیب مغرب کی کاٹ ضروری ہے، انھوں نے اس کے لیے اپنی شاعری سے جہاد کیا ہے اور اس کے اثرات خاطر خواہ ہوئے ہیں۔''(۱۴)

پردۂ تہذیب میں غارت گری، آدم کشی

(کلیات اقبال، ضرب کلیم، مسولینی، ص: ۶۱۲)

''یہ حقیقت ہے کہ علامہ اقبالؒ نے مغربی تہذیب اور علوم وفنون کے چند پہلوؤں پر تنقید بھی کی ہے اور بعض پہلوؤں کو سراہا بھی ہے لیکن چند حدود وقیود کے ساتھ۔ دراصل علامہ اقبالؒ نے ایک مفکر عالم کی حیثیت سے دنیا کے تقریباً ہر نظام کا بغور جائزہ لیا اور ان کی خوبیوں اور خامیوں پر نظر ڈالی۔ اقبالؒ نہ تو مغربیت کے دلدادہ اور اسلام سے بیزار مسلمان تھے اور نہ ایسا متعصّبانہ ذہن رکھتے تھے کہ اپنی ہر شے کو برتر ثابت کیا جائے۔ علامہ اقبالؒ نے جہاں کہیں کوئی خوبی دیکھی اس کی ضرور تعریف کی ہے۔ اس طرح مغربی تہذیب کے بھی دونوں رخ ان کے سامنے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے مغرب کو بہت قریب سے دیکھا، مغربی علوم وفنون سے مستفید ہوئے لیکن مغربیت کے شکار نہیں ہوئے اور مغرب میں رہ کر اس تہذیب کا تنقیدی جائزہ لیا اور اسلامی اصولوں کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔''(۱۵)

زمستانی ہوا میں گرچہ تھی شمشیر کی تیزی
نہ چھوٹے مجھ سے لندن میں بھی آدابِ سحر خیزی (۱۶)

''کیوں کہ انھیں معلوم تھا کہ مغربی تہذیب انسانیت کی تعمیر وترقی کے لیے سمِ قاتل کی حیثیت رکھتی ہے، اقبالؒ اس حد تک تو مغربی تہذیب ومعاشرت کے حامی تھے کہ انھوں نے مختلف علوم وفنون میں ترقی کر کے خود کو ترقی یافتہ معاشرے کے طور پر منوا لیا ہے اور ان کے علوم وفنون سے مسلمانوں کو بھی سبق سیکھنا چاہیے لیکن بے مہار آزادی، مادیت پرستی اور عقلیت پسندی کی انتہا ایسے پہلو ہیں جو ان کے نزدیک کسی طرح بھی قابل تحسین نہیں ہو سکتے تھے۔ علامہ اقبالؒ نے مغربی تہذیب کو تہذیب حاضر، فرنگی تہذیب، عصرِ حاضر اور شبِ تاریک قرار دیا ہے لیکن اقبالؒ مغرب سے بیزاری کی تعلیم نہیں دیتے بلکہ اس شب کو سحر میں بدلنے کا مشورہ دیتے ہیں۔''(۱۷)

مشرق سے ہو بیزار، نہ مغرب سے حذر کر
فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سحر کر

(کلیاتِ اقبالؒ، ص:۵۷۱)

علامہ اقبالؒ نے تہذیبِ مغرب کی کھوکھلی بنیادوں کو دیکھ لیا تھا اور ان کے نزدیک مغرب کی ظاہری چمک دمک دراصل دھوکا اور فریب ہے اور اس کے پیچھے ایک مکروہ شکل پوشیدہ ہے۔ علما کے نزدیک جن بنیادوں پر مغربی تہذیب وتمدن پروان چڑھ رہے تھے وہ بنیادیں کمزور اور ناپائیدار ہیں۔

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیبِ حاضر کی — یہ صنّاعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے
وہ حکمت ناز تھا جس پر خردمندانِ مغرب کو — ہوس کے پنجۂ خونیں میں تیغِ کارزاری ہے
تدبّر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا — جہاں میں جس تمدّن کی بنا سرمایہ داری ہے

(۱۸)

”عصرِ حاضر کی ذہنی سرگرمیوں سے جو نتائج مرتب ہوئے ان کے زیرِ اثر انسان کی رُوح مردہ ہو چکی ہے یعنی وہ اپنے ضمیر اور باطن سے ہاتھ دھو بیٹھا ہے۔ خیالات اور تصورات کی جہت سے دیکھیے تو اس کا وجود خود اپنی ذات سے متصادم ہے۔“ (۱۹)

دیارِ مغرب کے رہنے والو! خُدا کی بستی دکاں نہیں ہے — کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زر عیار ہو گا
تمھاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی — جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا، ناپائدار ہوگا

(کلیاتِ اقبال، بانگِ درا، مارچ ۱۹۰۷ء، صفحہ نمبر ۱۴۱)

”تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ“ میں لکھتے ہیں: ”مغرب تہذیب کی جدوجہد بتدریج ختم ہو رہی ہے۔“ (۲۰)
یورپی اقوام خود کو ترقی یافتہ کہتی ہیں اور اپنے معاشرے کو تہذیب یافتہ معاشرہ قرار دیتی ہیں لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے، ترقی ضرور ہوئی ہے لیکن اس ترقی کو مادی ترقی کہا جاتا ہے جس سے رُوحانیت کی موت واقع ہو جاتی ہے جو انسانیت کی بقا کے لیے بہت ضروری ہے، مغربی تہذیب میں مادیت اور رُوحانیت میں چپقلش جاری ہے۔

دنیا کو ہے پھر معرکۂ رُوح و بدن پیش
تہذیب نے پھر اپنے درندوں کو ابھارا

(کلیاتِ اقبال، صفحہ نمبر: ۶۵۷)

”علامہ اقبالؒ نے تہذیب کے انھی درندوں کو بے نقاب کیا ہے جنھوں نے کمزور اور غلام قوموں پر ظلم وستم روا رکھے اور غلام قوموں کے دل ودماغ کو بھی اپنی گرفت میں کر لیا۔

مادیت

”دراصل یورپ نے سائنسی ترقی کے زعم میں خود کو مادیت پرستی کی اتھاہ گہرائیوں میں گرا لیا ہے۔ مادیت نے انھیں ظاہری شان وشوکت اور غیر معمولی طاقت تو بخش دی ہے لیکن انسانیت کے اصل جوہر کو نقصان پہنچا ہے اس کے علوم وفنون انسان کو حقیقی راحت، آسودگی اور آرام بخشنے کے بجائے اس کی تباہی کا ذریعہ بن گئے۔“ (۲۱)

عقلیت پرستی

”نئی تہذیب کی یہ بدقسمتی ہے کہ اس عقل کو کلی اختیار دے دیا ہے کہ قافلہ انسانی کو جس طرف چاہے لے جائے حالاں کہ زندگی کے ارتقا کے لیے اخلاق کی پابندیاں اور رُوحانی راہبری عقل کے لیے ضروری ہے۔ عقل یقیناً انسان کا بیش بہا جوہر ہے لیکن اس راہوار کی باگیں عشق کے ہاتھ میں ہوں تب ہی یہ سیّدھے راستے پر رہتا ہے ورنہ بہت جلد بھٹک جاتا ہے۔“ (۲۲)

سائنس کی ہلاکت آفرینی

”مغربی تہذیب کی ایک خامی یہ بھی ہے کہ اس کے فرزندوں نے سائنسی ترقی کی مدد سے مظاہرِ فطرت کو تسخیر کر کے صرف اپنے فائدے کو مدِنظر رکھا اور بحیثیت مجموعی انسانیت کی ہلاکت کے اسباب پیدا کیے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی میں بے پایاں ترقی نے اقوامِ یورپ کو تو بے پناہ مادی قوت حاصل کرنے میں مدد دی لیکن اس قوت کو انھوں نے کمزور اقوام کو ہوس کا نشانہ بنانے کے لیے استعمال کیا، طرح طرح کی مشینیں ایجاد کر کے انھوں نے انسانیت کو فائدہ پہنچانے کے بجائے عالمگیر پیمانے پر معاشی استحصال کا نظام قائم کر لیا۔“ (۲۳)

نہ کر افرنگ کا اندازہ اس کی تابناکی سے
کہ بجلی کے چراغوں سے ہے اس جوہر کی براقی

(کلیاتِ اقبال، ص: ۳۵۰)

''مغربی تہذیب کا کوئی شعبہ ہو مادیت اور عقلیت اس کے بنیادی اجزا ہیں۔تعلیم نے مادہ پرستی اور عقلیت پسندی کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا۔مغرب کا سارا نظامِ تعلیم رُوحانیت کش عناصر سے پر ہے۔ اقبالؒ نے مغرب میں رہ کر اعلیٰ تعلیم حاصل کی لیکن انھوں نے اپنے مذہب، معاشرت اور اپنے مزاج سے مطابقت رکھنے والی اقدار کو اپنایا اور اس کے مقابلے میں ہر شے کو تنقید کی نظر سے دیکھا۔یعنی اقبالؒ نے اپنے کام کی چیز کو اپنا لیا لیکن مغربی تہذیب میں کھو نہیں گئے کیوں کہ انھیں معلوم تھا کہ یہ نظامِ تعلیم دین و مروّت کے خلاف ایک سازش ہے۔''(۲۴)

اور یہ اہلِ کلیسا کا نظامِ تعلیم
اک سازش ہے فقط دین و مروّت کے خلاف
(کلیاتِ اقبال،ص:۵۴۸)

''مغرب کے لادینی معاشرے نے انسان کو بے مہار آزادی دے کر انسانیت کی ہلاکت کے سامان پیدا کر دیے ہیں۔آزادی اس کا نام نہیں کہ انسان حیوانوں کی طرح اپنی جنس اور وحشیانہ خصلتوں کا مظاہرہ سرِ عام کرتا پھرے۔پس یہ سب کچھ مغرب کے آزاد معاشرے میں موجود ہے اور اس بے مہار آزادی پر اقبالؒ نے تنقید کی ہے۔''(۲۵)

مجھے تہذیبِ حاضر نے عطا کی ہے وہ آزادی
کہ ظاہر میں تو آزادی ہے، باطن میں گرفتاری
(کلیاتِ اقبال،ص نمبر ۵۴۸)

ڈاکٹر سیّد عبداللہ نے یوں بیان کیا ہے:

''اول اقدار کا (خصوصاً اخلاقی اقدار کا) بحران ہے۔دوم منزلی زندگی کا خاتمہ، سوم فرد کا احساس تنہائی اور خود بیزاری، چہارم یعنی شرف انسانی کی تذلیل یا انکار یا اس سے بے اعتنائی، پنجم نفسیاتی توازن کا بگاڑ جو افراد کو بے ترتیبی، بدنظمی اور تشدد کا عادی اور تعاون باہمی کا انکاری بنا دیتا ہے اور خود غرضی اور نفسا نفسی کا خالق ہے، ششم شہواتِ نفس کی غلامی۔''(۲۶)

علامہ اقبالؒ نے یورپی تہذیب کو بہت قریب سے دیکھا اور یورپ میں رہ کر تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ یورپی علوم وفنون کے ارتقا اور یورپی اقوام کی ترقی کے اسباب کا گہری نظر سے مطالعہ کیا تو اس نتیجے کہ یورپی اقوام میں ہزار خرابیوں کے باوجود بہت سی خوبیاں بھی ہیں اور وہ اقوام چند ایسے مثبت اصولوں پر عمل پیرا

ہیں جن کی بدولت انھیں بقا حاصل ہے اور وہ ترقی کرتی جارہی ہیں۔

''یورپین تہذیب کی اصل رُوح ایجاد وتسخیر اور اثباتِ خُودی میں مضمر ہے، جس کی بدولت انسان کائنات میں ایسے تصرفات حاصل ہوئے جو پہلے کبھی نہ ہوئے تھے۔''(۲۷)

''اسلام نے ہمیں قدم قدم پر محنت کی عظمت کا احساس دلایا ہے لیکن ہم محنت سے جی چراتے ہیں جبکہ یورپی اقوام نے محنت کے راز کو پالیا ہے اور دنیا پر اپنی برتری، محنت کی وجہ سے ثابت کر دی ہے، اقبالؒ بھی اسی وجہ سے مغربی تہذیب میں محنت کے عنصر کو پسند کرتے ہیں۔''(۲۸)

''اقبالؒ عظیم اس لیے ہیں کہ ان کے ہاں تنگ نظری نہیں ہے۔مغربی تہذیب اور مغربی فکر کا ان پر اثر ہے کیوں کہ وہاں کی روشنی علم و ہنر سے انھوں نے اپنے آپ کو علیحدہ نہیں رکھا۔انھوں نے اس تہذیب کے اچھے اور مثبت پہلوؤں پر نظر رکھی اس سے استفادہ بھی کیا ہے۔لیکن وہ اس سے مرعوب نہیں ہوئے ہیں، کیوں کہ ان کے سامنے اسلامی اور مشرقی تہذیب کی وہ عظیم روایت موجود تھی جسے انھوں نے زندگی بھر عزیز رکھا اور آخری دم تک انھوں نے اپنے فکر کے لہو سے جس کی آبیاری کی، ایک ایسے شخص پر ظاہر ہے کہ مغرب اور مغربی تہذیب کا جادو نہیں چل سکتا تھا، اس کی آنکھیں ظاہری چمک دمک سے خیرہ نہیں ہوسکتی تھیں۔''(۲۹)

بقول اقبالؒ:''حقیقت یہ ہے کہ یورپ کی آب و ہوا نے مجھے مسلمان کر دیا۔''(مرتبہ بشیر ڈار، انوارِ اقبال)

علامہ اقبالؒ کو مغربی تہذیب میں اگر کچھ خامیاں نظر آتی ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ مِلت اسلامیہ اور اس کی مروجہ تہذیب سے خوش ہیں۔حقیقت یہ ہے کہ انھیں اپنی قوم میں بہت سی خامیاں نظر آتی ہیں وہ دیکھتے ہیں کہ اس قوم کے آگے کوئی نصب العین نہیں۔ان کے دل گرمی، تڑپ اور حرارت سے محروم ہیں۔دین اسلام کا نام لینے والے تو بہت ہیں لیکن دین کے اصولوں پر چلنے والے بہت کم ہیں۔اسے نہ راستے کا پتا ہے اور نہ منزل کا۔

تیرے محیط میں کہیں گوہرِ زندگی نہیں
ڈھونڈ چکا میں موج موج، دیکھ چکا صدف صدف
(کلیاتِ اقبال (اُردو) بالِ جبریل، صفحہ:۱۹۱)

اگرچہ اقبالؒ مشرق و مغرب دونوں کی موجودہ حالت سے مایوس ہیں لیکن اُسے ایک امید ہے کہ مُسلمان قوم کے پاس دینِ اسلام کی شکل میں ایک ایسا لائحہ عمل ہے جس کی مدد سے وہ زندگی کی دوڑ میں مغربی اقوام سے آگے بھی بڑھ سکتے ہیں اور اپنی اصلاح بھی کر سکتے ہیں لیکن شرط یہ ہے کہ وہ جدید مغربی علوم وفنون

سے بھی واقف ہوں اور اپنے ورثے سے بھی بیگانہ نہ ہوں۔علامہ اقبالؒ ایسے معاشرے کا خواب دیکھتے ہیں جس میں سائنسی ترقی کے ساتھ ساتھ اسلامی معاشرت کے بنیادی اصول بھی لاگو ہوں۔مغربی تہذیب ظاہر میں اُلجھ کر باطن کو فراموش کر بیٹھی ہے۔

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزر گاہوں کا — اپنے افکار کی دُنیا میں سفر کر نہ سکا
اپنی حکمت کے خم و پیچ میں اُلجھا ایسا — آج تک فیصلۂ نفع و ضرر کر نہ سکا
جس نے سُورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا — زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا!

(کلیاتِ اقبال (اُردو) ضربِ کلیم، صفحہ:۶۲۰)

مختصر یہ کہ یہی وہ تہذیب اسلامی ہے جس کے علامہ اقبالؒ آرزو مند ہیں۔اس تہذیب کے عناصر میں آزادی، اخوت، انصاف پسندی، احترام انسانی، علم دوستی، شائستگی، رُوحانی بلندی، اخلاقی پاکیزگی اور مساوات شامل ہیں اور ان کی بنیاد پر یقیناً ایک صحت مند اور متوازن معاشرہ کا خواب دیکھا جا سکتا ہے۔علامہ اقبالؒ جو کہ امید کا شاعرِ مشرق ہے جو اپنی قوم اور تہذیب اسلامی سے مایوس نہیں۔

نہیں ہے نا اُمید اقبالؒ اپنی کشتِ ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

(کلیاتِ اقبال (اُردو) بالِ جبریل، صفحہ ۳۶۸)

حواشی

۱۔عبدالحکیم، خلیفہ، فکرِ اقبال (لاہور: بزمِ اقبال، ۲۔کلب روڈ، اپریل ۲۰۱۳ء) ص:۱۶۶
۲۔ابوالحسن علی ندوی، سیّد، مولانا، نقوشِ اقبال، مترجم شمس تبریز خان، مولوی (لاہور: مجلس نشریات اسلام، ن۔د) ص:۷۰
۳۔ابوالحسن علی ندوی، سیّد، مولانا، نقوشِ اقبال، مترجم شمس تبریز خان، مولوی (لاہور: مجلس نشریات اسلام، ن۔د) ص:۷۱
۴۔ابوالحسن علی ندوی، سیّد، مولانا، نقوشِ اقبال، مترجم شمس تبریز خان، مولوی (لاہور: مجلس نشریات اسلام، ن۔د) ص:۷۲
۵۔ابوالحسن علی ندوی، سیّد، مولانا، نقوشِ اقبال، مترجم شمس تبریز خان، مولوی (لاہور: مجلس نشریات اسلام، ن۔د) ص:۷۳

۶۔ابوالحسن علی ندوی، سیّد، مولانا، نقوشِ اقبال، مترجم شمس تبریز خان، مولوی (لاہور: مجلس نشریات اسلام، ن۔د) ص:۷۸
۷۔افتخار احمد صدیقی، ڈاکٹر، فروغِ اقبال (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۹۶ء) ص:۴۵۵
۸۔افتخار احمد صدیقی، ڈاکٹر، فروغِ اقبال (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۹۶ء) ص:۴۵۷،۴۵۸
۹۔عبادت بریلوی، ڈاکٹر، اقبال احوال و افکار (لاہور: مکتبہ عالیہ، ۱۹۷۷ء) ص:۹۰
۱۰۔نواب عالم بارہوی، سیّد، کرنل، بصیرتِ اقبال (راولپنڈی: پیپ بورڈ پرنٹر، ۱۹۹۰ء) ص:۱۹۴،۱۹۵
۱۱۔محمد منوّر، پروفیسر، ایقانِ اقبال (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۱۲ء) ص:۲۰
۱۲۔نذیر نیازی، سیّد، تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، (لاہور: بزمِ اقبال، جون ۲۰۱۲ء) ص:۱۹۶
۱۳۔فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اقبال سب کے لیے (لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء) ص:۳۱۴
۱۴۔عبادت بریلوی، ڈاکٹر، اقبال احوال و افکار (لاہور: مکتبہ عالیہ، ۱۹۷۷ء) ص:۸۸
۱۵۔منیر احمد یزدانی، پروفیسر، فوزِ اقبالؒ (میر پور: گوشۂ تحقیق علامہ اقبالؒ، مئی ۲۰۱۴ء) ص:۸۶
۱۶۔محمد اقبال، علامہ، کلیاتِ اقبال اردو (لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۷۹ء) ص:۱۲۴
۱۷۔محمد اقبال، علامہ، کلیاتِ اقبال اردو (لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۷۹ء) ص:۸۶
۱۸۔محمد شریف بقا، اقبالؒ کے شعری موضوعات (لاہور: علم و عرفان پبلشرز، دسمبر ۲۰۱۳ء) ص:۲۵۱
۱۹۔نذیر نیازی، سیّد، تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، (لاہور: بزمِ اقبال، ۱۹۶۷ء) ص:۲۸۹،۲۹۰
۲۰۔قاسم محمود، سیّد، پیامِ اقبال (لاہور: مکتبہ خُدام القرآن، ۲۰۱۲ء) ص:۱۲۶
۲۱۔منیر احمد یزدانی، پروفیسر، فوزِ اقبالؒ (میر پور: گوشۂ تحقیق علامہ اقبالؒ، مئی ۲۰۱۴ء) ص:۹۰
۲۲۔منیر احمد یزدانی، پروفیسر، فوزِ اقبالؒ (میر پور: گوشۂ تحقیق علامہ اقبالؒ، مئی ۲۰۱۴ء) ص:۹۲
۲۳۔منیر احمد یزدانی، پروفیسر، فوزِ اقبالؒ (میر پور: گوشۂ تحقیق علامہ اقبالؒ، مئی ۲۰۱۴ء) ص:۹۲
۲۴۔منیر احمد یزدانی، پروفیسر، فوزِ اقبالؒ (میر پور: گوشۂ تحقیق علامہ اقبالؒ، مئی ۲۰۱۴ء) ص:۹۳
۲۵۔منیر احمد یزدانی، پروفیسر، فوزِ اقبالؒ (میر پور: گوشۂ تحقیق علامہ اقبالؒ، مئی ۲۰۱۴ء) ص:۹۳
۲۶۔عبداللہ، سیّد، ڈاکٹر، مطالعہ اقبال کے چند نئے رخ (لاہور: بزمِ ادب، ن۔د) ص:۸۸
۲۷۔یوسف حسین خان، رُوحِ اقبال (لاہور: آئینہ ادب، ن۔د) ص:۲۶۲
۲۸۔منیر احمد یزدانی، پروفیسر، فوزِ اقبالؒ (میر پور: گوشۂ تحقیق علامہ اقبالؒ، مئی ۲۰۱۴ء) ص:۹۷
۲۹۔عبادت بریلوی، ڈاکٹر، اقبال احوال و افکار (لاہور: مکتبہ عالیہ، ۱۹۷۷ء) ص:۹۵

علامہ اقبالؒ کا فلسفۂ تعلیم

علامہ اقبالؒ ملّت اسلامیہ کی ان شخصیات میں سے ہیں جو ہماری تاریخ کا انمول اثاثہ ہیں اور ان کے گراں قدر علمی و ادبی سرمایہ سے انکار ممکن نہیں۔ انھوں نے ملّت کے وقار اور استحکام کے لیے مثالی کام کیا ہے۔ علامہ اقبالؒ کے تمام افکار و نظریات کی بنیاد اسلام پر ہے اور ان کے نظریۂ تعلیم کی بنیاد بھی اسلام ہی ہے۔ وہ آفاقی نظریۂ اسلام کے علمبردار ہیں وہ اسلام جو زندگی کے ہر شعبے کے بارے میں انسان کی رہنمائی کرتا ہے۔ علامہ اقبالؒ کا فلسفۂ تعلیم درحقیقت ان کے فلسفۂ خُودی کے تابع ہے۔

اسلامی مفکرین میں علامہ اقبالؒ کا مقام بہت بلند ہے۔ وہ رُوح اسلام سے پوری طرح واقف تھے۔ درحقیقت زیست کے سارے پہلوؤں پر ان کی نظر تھی۔ آپ نے اُمتِ مسلمہ کے لیے اپنا نظریۂ تعلیم بھی پیش کیا۔ جو ایک قوم کی خُودی، اس کی تعلیمات کی رُوح اور اس کے تصور تربیت و تشکیل کردار کی بہترین انداز میں نمائندگی کرتا ہے۔ اقبالؒ کے افکار کا بنیادی نکتہ خُودی ہے۔ لیکن خُودی تعلیم و تربیت کے عمل سے گزر کر انسان کامل کی صورت میں مکمل ہوتی ہے۔

فکرِ اقبال کی عمارت اسلامی تعلیمات پر اُستوار ہوئی ہے اور اقبالؒ کے افکار و نظریات اپنے اندر ایک مکمل نظامِ حیات کا عملی خاکہ رکھتے ہیں کیوں کہ علامہ اقبالؒ اپنی تعلیمات کے ذریعے مُسلمان قوم کی تربیت خالصتاً اسلامی اصولوں پر کرنا چاہتے تھے۔ علامہ اقبالؒ کے نزدیک ''علم'' سے کیا مراد ہے؟ اس ضمن میں وہ خود خواجہ غلام السیّدین کے نام اپنے خط میں لکھتے ہیں: ''علم سے میری مراد وہ علم ہے جس کا دار و مدار حواس پر ہے۔ عام طور پر میں نے علم کا لفظ انہی معنوں میں استعمال کیا ہے۔ اس علم سے ایک طبعی قوت ہاتھ آتی ہے جسے یقیناً دین کے ماتحت رہنا چاہیے۔ اگر علم دین کے ماتحت نہ رہے تو محض شیطانیت ہے۔ یہ علم، علمِ حق کی ابتدا ہے

اور وہ علم جو علم حق کی آخری منزل ہے اس کا دوسرا نام عشق ہے۔ مسلمان کے لیے لازم ہے کہ وہ علم کو مسلمان کرے یعنی بولہب را حیدرِ کرار کن۔''

علمِ حق اول حواس، آخر حضور　　　آخرِ او می نگنجد در شعور! (۱)

وہ علم جو شعور میں سما نہیں سکتا اور جو علم کی آخری منزل ہے اس کا نام عشق ہے۔

کسی قوم کو کس قسم کی تعلیم و تربیت کی ضرورت ہوتی ہے اس کا فیصلہ مفکرینِ تعلیم اور ماہرینِ تعلیم اپنے مذہبی، معاشرتی، تمدنی اور اخلاقی ماحول کو سامنے رکھ کر کرتے ہیں اس ضمن میں ڈاکٹر محمد ریاض اپنی تصنیف ''برکاتِ اقبال'' کے باب بعنوان ''اقبال کا تصور تعلیم'' میں رقم طراز ہیں:

''مشاہیرِ تعلیم میں علامہ اقبالؒ ہم پاکستانیوں کی خاطر ایک غیر معمولی اہمیت رکھتے ہیں۔ اقبالؒ نے جو کچھ امکان فکر سے سوچا وہ اسلامی تعلیمات کو اعماقِ قلب میں اتارنے کے مترادف تھا۔ ہمارے اس قومی فلسفی شاعر کے نظریات ہمارے ہی مخصوص ماحول میں ارتقا پذیر ہوئے۔'' (۲)

''عصر حاضر کے مفکرین اسلام میں علامہ اقبالؒ کا رتبہ و مقام بلانزاع بے حد بلند ہے اور انھوں نے زندگی کے جملہ اُمور کے بارے میں نہایت جامع تصورات دیے ہیں ان تصورات میں تعلیم اور اس کے متعلقات بھی ہیں۔'' (۳)

۱۔ علامہ اقبالؒ کے فلسفہ تعلیم کا پہلا بنیادی مقصد حقیقت کی تلاش و جستجو کا پُرزور اور بھرپور جذبہ ہے۔ علامہ اقبالؒ کے نزدیک وہ نظامِ تعلیم محض بے کار ہے اور یہ روزگار کے حصول کے لیے ایک پروانہ راہداری حاصل کرنے کا داعیہ پیدا کرتا ہو۔ وہ چاہتے ہیں کہ طالب علم کو ایسی تعلیم دی جائے جس کے ذریعے وہ کائنات کو مسخر کر سکے۔ ان کے نزدیک تفتیش و تحقیق، مسلسل جدوجہد اور ایک بلند ترین نصب العین کے حصول کی تڑپ پیدا کرنا ایک نظام تعلیم کا بُنیادی وصف اور مزاج ہونا چاہیے۔

جس سے دلِ دریا متلاطم نہیں ہوتا　　　اے قطرۂ نیساں وہ صدف کیا، وہ گُہر کیا
بے معجزہ دُنیا میں اُبھرتی نہیں قومیں　　　جو ضربِ کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا! (۴)

اسی جدوجہد اور کش مکش کو تعلیم کا حقیقی مقصد قرار دیتے ہوئے جب وہ اپنی قوم کے نوجوانوں کو دیکھتے ہیں اور ان کی آرام طلبی پر نگاہ ڈالتے ہیں تو بے ساختہ ان کا دل دکھ درد سے بھر آتا ہے۔

ترے صوفے ہیں افرنگی، ترے قالیں ہیں ایرانی　　　لہو مُجھ کو رُلاتی ہے جوانوں کی تن آسانی
عقابی رُوح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں　　　نظر آتی ہے اُس کو اپنی منزل آسمانوں میں
نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر　　　تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں (۵)

اس طرح علامہ اقبالؒ نوجوانوں کو جستجو، تحقیق، علم، محنت اور جدوجہد کی تعلیم دیتے ہیں اور اس ساری جدوجہد کے ذریعے انھیں ابھارتے ہیں کہ وہ اس موتی کو تلاش کریں جو تخلیق کائنات کا حقیقی مقصود و مدعا ہے۔

۲۔علامہ اقبال کے فلسفۂ تعلیم کا دوسرا بنیادی مقصد خُودی کی پرورش ہے۔ علامہ اقبالؒ کے نزدیک تعلیم کا یہ مقصد بھی نہایت اہم ہے۔ انسان سازی درحقیقت انسان کی خُودی کی پرورش کا ہی دوسرا نام ہے۔ اس لیے کہ یہی وہ جوہر ہے جس سے انسان اشرف المخلوقات بنتا ہے۔ انسان میں شعور ذات نہ ہو تو وہ بھی مختلف انواع حیوانات میں سے ایک نوع حیوان ہے۔ اس کے علاوہ علامہ اقبالؒ جسم و جان اور تن و توش کی گرانی کو بھی قوت و شوکت کا مظہر نہیں سمجھتے۔ اس لیے کہ یہ وجود تو حیوانی غذائیت کی بہتات و افراط سے تشکیل پاتا ہے بلکہ علامہ اقبالؒ انسان کے اندر جذبہ خُودی، حریت فکر اور ذوق و شوق اور ایمان و عزیمت کو انسانیت کا سرچشمہ قرار دیتے ہیں۔ چناں چہ علامہ اقبالؒ اپنی قوم کی نئی نسل کو پرورش تن کے بجائے پرورش خُودی پر ابھارتے ہیں۔

ہر چیز ہے محوِ خُود نمائی ہر ذرّہ شہیدِ کبریائی
بے ذوقِ نمود زندگی، موت تعمیرِ خُودی میں ہے خُدائی
رائی زورِ خُودی سے پربت پربت ضعفِ خُودی سے رائی
تیری قندیل ہے ترا دل تُو آپ ہے اپنی روشنائی
اِک تو ہے کہ حق ہے اِس جہاں میں باقی ہے نُمودِ سیمیائی

(۶)

علامہ اقبالؒ تعلیم کے ذریعے خُودی کو جِلا دے کر قوم کے افراد کو جہاد زندگی کے مردانِ غازی بنانا چاہتے ہیں اور اس مقصد کے لیے نظام تعلیم کو رُوحِ جہاد پیدا کرنے کا سب سے مؤثر ذریعہ سمجھتے ہیں۔

شنیدم شبے در کتب خانۂ من به پروانه می گفت کِرم کتابی
به اوراقِ سینا نشیمن گرفتم بسے دیدم از نسخۂ فاریابی

(۷)

علامہ اقبالؒ نے اس حقیقت کو انھوں نے ایک کِرم کتابی اور پروانے کے مکالمے میں رَقم کیا ہے۔ اس حکایت میں علامہ اقبالؒ نے خُودی کے راز کو منکشف کیا ہے جب ایک کرم کتابی پروانے سے کہتا ہے کہ میں نے فارابی، سینا اور غزالی کا مطالعہ کیا اور ان کے اوراق علم و حکمت میں زندگی کو تلاش کرنے کی پیہم کوشش کی۔

نفہمیدہ ام حکمتِ زندگی را هماں تیرہ روزم ز بے آفتابی
نکو گفت پروانۂ نیم سوزے که ایں نکته را در کتابے نیابی

(۸)

افسوس کہ میں اتنی دماغ سوزی کے باجود میں زندگی کی حکمت سے اب تک انجان ہوں سورج کے نہ ہونے سے میرے دن اس طرح تاریک ہیں۔ مراد ہے میں زندگی کی اس حقیقت کو نہیں پا سکا جو تو نے پالی ہے اس کے جواب میں پروانے نے جو بات کہی، ایک ادھ جلے پتنگے نے کیا خوب کہا کہ تو اس بھید کو کسی کتاب میں نہیں پائے گا۔ وہی علامہ اقبالؒ کا فلسفہ تعلیم ہے جو ہمہ تن تجسس و جستجو ہے۔

تپش می کند زنده تر زندگی را
تپش می دهد بال و پر زندگی را

(۹)

علامہ اقبالؒ استاد کی عظیم ذمہ داری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں

شیخِ مکتب ہے اک عمارت گر
جس کی صنعت ہے رُوحِ انسانی

(۱۰)

۳۔علامہ اقبالؒ کے فلسفہ تعلیم کا تیسرا بنیادی مقصد زندگی کا تعین ہے۔ اقبالؒ کا نظریہ تعلیم مقصدِ زندگی کو بنیادی اہمیت دیتا ہے۔ علامہ اقبالؒ کے نزدیک وہ نظامِ تعلیم عبث ہے جو نوجوان نسل کو اس کے مقصدِ حیات سے بے خبر رکھے۔ مقصدِ زندگی کے بغیر زندگی بے لنگر جہاز کی مانند ہے جسے خواہشات کے طوفانی اور خام آرزوؤں کے تھپیڑے وقت کے ناپید کنار سمندر میں بھٹکائے پھرتے ہیں۔

علامہ اقبالؒ نے کائنات کا وسیع و عریض میدان قدرت کی طرف سے انسان کے تصرف میں دینے کی طرف بڑے خوب صورت اشعار میں اشارہ کیا ہے۔

کھول آنکھ، زمیں دیکھ، فلک دیکھ، فضا دیکھ مشرق سے اُبھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ
اس جلوۂ بے پردہ کو پردوں میں چھپا دیکھ ایامِ جدائی کے ستم دیکھ، جفا دیکھ
یہ گنبدِ افلاک یہ خاموش فضائیں یہ کوہ، یہ صحرا، یہ سمندر، یہ ہوائیں
تھیں پیشِ نظر کل تو فرشتوں کی ادائیں آئینہ ایام میں آج اپنی ادا دیکھ!

(۱۱)

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سُراغ زندگی ۔۔۔ تُو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن، اپنا تو بن
من کی دنیا! من کی دنیا سوز و مستی، جذب و شوق ۔۔۔ تن کی دنیا، تن کی دنیا سُود و سَودا، مکر و فن
من کی دولت ہاتھ آتی ہے تو پھر جاتی نہیں ۔۔۔ تن کی دولت چھاؤں ہے، آتا ہے دھن جاتا ہے دھن

(۱۲)

یہ ہے وہ نصب العین اور زندگی کا مقصد جو علامہ اقبالؒ اپنے فلسفہ تعلیم کے متعین کرتے ہیں۔

پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات
تو جھکا جب غیر کے آگے، نہ من تیرا نہ تن!

(۱۳)

صرف اللہ عزوجل کی اطاعت اور اس کی حاکمیت کا اقرار اور اللہ عزوجل کی بندگی اور اطاعت انسانی زندگی کا منتہائے مقصود ہے اور انسانی زندگی اطاعت حق سے عبارت ہے۔

۴۔ علامہ اقبالؒ کے فلسفۂ تعلیم کا چوتھا بنیادی مقصد اجتماعیت سے ربط و وفاداری ہے۔ علامہ اقبالؒ کے نزدیک مُسلمانوں کے فلسفۂ تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ وہ نئی نسل میں مسلمان معاشرے کی ہمدردی، محبت، وفاداری اور خیر خواہی کا جذبہ پیدا کرے۔

فرد قائم ربطِ ملّت سے ہے، تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں (۱۴)

رائج الوقت نظامِ تعلیم پر تنقیدی نظر

یورپی نظامِ تعلیم

علامہ اقبالؒ مغربی تہذیب اور مغربی نظام تعلیم کے اثرات سے پوری طرح آگاہ تھے خود انھوں نے مغرب میں رہ کر اعلیٰ تعلیم حاصل کی وہ کس طرح مغربی تعلیم کے خلاف ہو سکتے تھے حقیقت یہ ہے کہ علامہ اقبالؒ کسی نظام تعلیم کے اس لیے خلاف نہیں کہ وہ مغربی ہے یا مشرقی بلکہ انھیں اعتراض یہ تھا کہ مروجہ تعلیم میں اسلامی عقائد، خُودی اور فرد کی تربیت کا مناسب بندوبست نہیں تھا۔ کالجوں اور یونی ورسٹیوں کے طلبہ کو دیکھ کر انھوں نے رائے قائم کی۔

''موجودہ دور کا مُسلمان قومی سیرت کے اسالیب کے لحاظ سے ایک بالکل نئے اسلوب کا ماحاصل ہے جس کی عقلی زندگی کی تصویر کا پردہ اسلامی تہذیب کا پردہ نہیں ہے، حالاں کہ اسلامی تہذیب کے بغیر میری رائے میں وہ صرف نیم مسلمان بلکہ اس سے بھی کچھ کم ہے اور وہ بھی اس صورت میں کہ اس کی خالص دنیوی تعلیم نے اس کے مذہبی عقائد کو متزلزل نہ کیا ہو۔ اس کا دماغ مغربی خیالات کی جولاں گاہ بنا ہوا ہے۔۔۔۔۔۔ اور اس نے اپنی قومی زندگی کے ستون کو اسلامی مرکز ثقل سے بہت پرے ہٹا دیا ہے۔''(۱۵)

بانگ درا میں شامل علامہ اقبالؒ کی ایک نظم بعنوان ''مسلمان اور تعلیم جدید'' کے مطالعے سے اقبالؒ کے نظریۂ تعلیم کی خبر ملتی ہے۔ علامہ اقبالؒ کی شاعری میں جا بجا مشرقی اور مغربی تعلیم کے بارے میں ان کے نظریات آشکار ہیں۔

مرشد کی یہ تعلیم تھی اَے مسلمِ شوریدہ سر ۔۔۔ لازم ہے رہرو کے لیے دُنیا میں سامانِ سفر
بدلی زمانے کی ہوا، ایسا تغیر آ گیا ۔۔۔ تھے جو گراں قیمت کبھی، اب ہیں متاعِ کس مخر

(۱۶)

اس دَور میں تعلیم ہے امراضِ مِلّت کی دوا ۔۔۔ ہے خُونِ فاسد کے لیے تعلیم مثلِ نیشتر
رہبر کے ایما سے ہوا تعلیم کا سَودا مجھے ۔۔۔ واجب ہے صحرا گرد پر تعمیلِ فرمانِ خضر

(۱۷)

علامہ اقبالؒ کے خیال میں مغربی تعلیم میں جو ضرر رساں مواد ہے جس سے ہماری اسلامی رُوح مجرُوح ہوتی ہے اس کی تفصیل مختصراً درج ذیل ہے:

1۔ سیرت و کردار سے بے بہرہ تعلیم

سیرت کی تعلیم دینی تعلیم میں مضمر ہے، مغربی تعلیم ذہن کو تو روشن کرتی ہے لیکن دل کو بیدار کرتی ہے نہ اس میں حرکت پیدا کرتی ہے۔ مغربی تعلیم فکر کو مربوط اور منظم طریقے سے پیش نہیں کرتی جس سے کردار میں بھی وحدت پیدا نہیں ہوتی اور نہ سیرت میں پختگی آتی ہے جو بالغ نظری کی پہلی سیڑھی ہے۔

آزادیِ افکار سے ہے اُن کی تباہی ۔۔۔ رکھتے نہیں جو فکر و تدبُّر کا سلیقہ
ہو فکر اگر خام تو آزادیٔ افکار ۔۔۔ انسان کو حیوان بنانے کا طریقہ!

(۱۸)

پختہ افکار کہاں ڈھونڈنے جائے کوئی
اس زمانے کی ہوا رکھتی ہے ہر چیز کو خام
مُردہ، لادینیِ افکار سے افرنگ میں عشق
عقل بے ربطیِ افکار سے مشرق میں غلام!(۱۹)

2۔ دین سے دُوری

مغربی تعلیمی اداروں میں سائنس کی تعلیم پر زور دیا جاتا ہے لیکن سائنس کی بنیاد مادیت پر ہے۔ جب سائنس کے ساتھ دین کی مربوط اور جامع تعلیم نہ دی جائے تو مسلمان کو قوانین فطرت میں آیات الٰہیہ نظر نہیں آتیں۔ دین کو پس پشت ڈالنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک خاص قسم کی مادیت نظامِ تعلیم پر غالب آ گئی۔

اور یہ اہلِ کلیسا کا نظامِ تعلیم
ایک سازش ہے فقط دین و مروت کے خلاف
(۲۰)

محسوس پر بنا ہے علومِ جدید کی
اس دور میں ہے شیشہ عقائد کا پاش پاش
(۲۱)

3۔ فضول جدت پسندی

اُس دور میں علی گڑھ کالج اگرچہ جدید و قدیم دونوں طرح کی تعلیم دے رہا تھا لیکن اس جدید دارالعلوم اور اس جیسے دوسرے دارالعلوم نے جس قسم کی معاشرتی اور ذہنی تبدیلی پیدا کی وہ جدید و قدیم کا امتزاج ہونے کے بجائے فرنگی تہذیب کی نقالی ثابت ہوئی جس کا اسلامی تعلیمات سے دور کا بھی کوئی تعلق نہ تھا۔

جو عالمِ ایجاد میں ہے صاحبِ ایجاد
ہر دَور میں کرتا ہے طواف اس کا زمانہ
تقلید سے ناکارہ نہ کر اپنی خُودی کو
کر اس کی حفاظت کہ یہ گوہر ہے یگانہ
اُس قوم کو تجدید کا پیغام مبارک!
ہے جس کے تصور میں فقط بزمِ شبانہ
لیکن مجھے ڈر ہے کہ یہ آوازۂ تجدید
مشرق میں ہے تقلیدِ فرنگی کا بہانہ
(۲۲)

4۔ مذہب سے بیگانگی

مغرب کی اندھی تقلید نے مُسلمانوں کو اسلام سے بہت دور کر دیا ہے۔ مغربی تعلیم کی بنیاد مادیت پرستی پر ہے۔ وہ عقل پرستی، تن پروری، تعیش و آرام کو دلدادگی کا سبق دیتی ہے۔ اس سے مسلمان جوانوں کے عقائد متزلزل ہو جاتے ہیں۔ یہ بے دینی اور الحاد انھیں احساس کمتری میں مبتلا کر دیتی ہے اور ان شاہین بچوں کو خاکبازی کا سبق دیتی ہے اور انھیں توحید کے نظریے سے دور لے جاتی ہے۔

شکایت ہے مجھے یارب! خُداوندان مکتب سے
سبق شاہیں بچوں کو دے رہے ہیں خاکبازی کا (۲۳)

5۔ اعلیٰ مقاصد کا فقدان

مغربی تعلیم بلند مقاصد سے خالی ہے اس کا نصب العین صرف معاش کا حصول ہے۔ اس طرح نوجوان پیٹ کا غلام بن کر دنیاوی لذتوں میں کھو جاتا ہے اور بلند مقاصد کو بھول جاتا ہے۔

نو مید نہ ہو ان سے اے رہبرِ فرزانہ!
کم کوش تو ہیں لیکن بے ذوق نہیں راہی
اے طائرِ لاہُوتی! اُس رزق سے موت اچھّی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی
(۲۴)

6۔ مادرانہ شفقت کی تشنگی

مغربی تعلیم کا بڑا نقصان یہ ہے کہ اس نے عورت کو جذبہ امومت سے بے گانہ کر دیا ہے۔ عورت اس فرض کو بھول رہی ہے جو نئی نسل کی تخلیق اور تعلیم و تربیت کی صورت میں قدرت نے اس کے سپرد کیا تھا۔

جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن
کہتے ہیں اسی علم کو اربابِ نظر موت
بیگانہ رہے دیں سے اگر مدرسۂ زن
ہے عشق و محبت کے لیے علم و ہنر موت
(۲۵)

7۔ اساتذہ کی اپنے فرائض سے کوتاہی

مغربی تعلیم حاصل کرنے والے اساتذہ خود بے راہ ہوتے ہیں۔ وہ نہ تو ان علوم پر گہری نظر رکھتے

ہیں جو پڑھاتے ہیں اور نہ تعلیم کے حقیقی مقاصد سے آشنا ہوتے ہیں۔ علامہ اقبالؒ نے ضرب کلیم میں ''اساتذہ'' کے عنوان سے لکھا ہے۔

مقصد ہو اگر تربیتِ لعلِ بدخشاں — بے سُود ہے بھٹکے ہوئے خورشید کا پرتَو
دنیا ہے روایات کے پھندوں میں گرفتار — کیا مدرَسہ، کیا مدرَسے والوں کی تگ و دَو!
کر سکتے تھے جو اپنے زمانے کی امامت — وہ کُہنہ دماغ اپنے زمانے کے ہیں پیرو!

(۲۶)

علامہ اقبالؒ کے فلسفۂ تعلیم کو یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ تعلیم کا اصل مقصد انسانی سیرت و کردار کی تعمیر کر کے اس کی تسخیرِ حیات کی استعداد کو تقویت دینا ہے۔ محض رُوحانی تعلیم کو مقصود ٹھہرا لینا درست نہیں، رُوح اور مادہ کو ایک دُوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا اور تعلیم کا فرض ہے کہ تن اور من دونوں کی ضروریات کو پیش نظر رکھے اور جسمانی اور رُوحانی تقاضوں کو یکساں اہمیت دے۔

جوانوں کو مری آہِ سَحر دے — پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے
خُدایا! آرزو میری یہی ہے — مرا نُورِ بصیرت عام کر دے

(۲۷)

اس رباعی میں علامہ اقبالؒ نے اپنی قوم کے جوانوں کے لیے تین چیزوں کی خُداوند تعالیٰ سے دُعا مانگی ہے، ایک آہِ سحر، دوسرے بال و پر اور تیسری چیز نُور بصیرت، یہ تینوں چیزیں دراصل انسان کی تخلیقی استعداد کے بُنیادی عناصر ہیں۔ جب تک یہ تینوں خوبیاں اور صلاحیتیں انسان میں پائی نہ جائیں وہ نہ کارنامے انجام دے سکتا ہے اور نہ ایجاد واختراع اور تخلیق وصنّاعی سے کام لے سکتا ہے۔

تعلیم کا مقصد انسان کو تسخیر کائنات کے لیے تیار کرنا ہے اور ایسے سانچے میں ڈھالنا بھی کہ وہ خود کو مفید شہری بنا کر صالح معاشرے کو وجود میں لانے میں مدد دے اور تعلیم کا آخری اور بڑا مقصد خُودی کی تقویت اور استحکام ہے۔ وہ اسلامی علوم وفنون کو جدیدہ دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ کر کے مسلمان نوجوانوں کی تعلیم کے خواہاں تھے ایسی تعلیم جس کے ذریعے نوجوان نسل کی رُوحانی تربیت کا سامان ہو سکے اور اس مقصد کے لیے معلم کلیدی کردار ادا کر سکتا ہے۔

حواشی

۱۔حمیداللہ شاہ ہاشمی، پروفیسر، شرح کلیاتِ اقبال فارسی (لاہور: مکتبہ دانیال۔ن۔د) ص: ۸۷۳
۲۔محمد ریاض، ڈاکٹر، برکات اقبال (لاہور: مقبول اکیڈمی، ۱۹۸۲ء) ص: ۲۶۹، ۲۷
۳۔محمد ریاض، ڈاکٹر، افادات اقبال (لاہور: مقبول اکیڈمی، ۱۹۸۳ء) ص: ۶۶، ۶۷
۴۔محمد اقبالؒ، کلیات اقبال (اُردو) ضربِ کلیم (لاہور: الفیصل ناشران، فروری ۲۰۰۶ء) ص: ۶۶۴
۵۔محمد اقبالؒ، کلیات اقبال (اُردو) بال جبریل (لاہور: الفیصل ناشران، فروری ۲۰۰۶ء) ص: ۴۹۵، ۴۹۶
۶۔محمد اقبالؒ، کلیات اقبال (اُردو) بال جبریل (لاہور: الفیصل ناشران، فروری ۲۰۰۶ء) ص: ۴۱۷، ۴۱۸
۷۔حمیداللہ شاہ ہاشمی، پروفیسر، شرح کلیاتِ اقبال فارسی (لاہور: مکتبہ دانیال۔ن۔د) ص: ۳۶۰
۸۔حمیداللہ شاہ ہاشمی، پروفیسر، شرح کلیاتِ اقبال فارسی (لاہور: مکتبہ دانیال۔ن۔د) ص: ۳۶۱
۹۔حمیداللہ شاہ ہاشمی، پروفیسر، شرح کلیاتِ اقبال فارسی (لاہور: مکتبہ دانیال۔ن۔د) ص: ۳۶۱
۱۰۔محمد اقبالؒ، کلیات اقبال (اُردو) بال جبریل (لاہور: الفیصل ناشران، فروری ۲۰۰۶ء) ص: ۵۴۶
۱۱۔محمد اقبالؒ، کلیات اقبال (اُردو) بال جبریل (لاہور: الفیصل ناشران، فروری ۲۰۰۶ء) ص: ۵۱۰، ۵۱۱
۱۲۔محمد اقبالؒ، کلیات اقبال (اُردو) بال جبریل (لاہور: الفیصل ناشران، فروری ۲۰۰۶ء) ص: ۳۹۱، ۳۹۲
۱۳۔محمد اقبالؒ، کلیات اقبال (اُردو) بال جبریل (لاہور: الفیصل ناشران، فروری ۲۰۰۶ء) ص: ۳۹۲
۱۴۔محمد اقبالؒ، کلیات اقبال (اُردو) بانگ درا (لاہور: الفیصل ناشران، فروری ۲۰۰۶ء) ص: ۲۳۶
۱۵۔عبدالواحد معینی، سیّد، مرتب، مقالات اقبال (لاہور: آئینہ ادب، ۱۹۸۸ء) ص: ۱۷۲
۱۶۔محمد اقبالؒ، کلیات اقبال (اُردو) بانگ درا (لاہور: الفیصل ناشران، فروری ۲۰۰۶ء) ص: ۲۹۸
۱۷۔محمد اقبالؒ، کلیات اقبال (اُردو) بانگ درا (لاہور: الفیصل ناشران، فروری ۲۰۰۶ء) ص: ۲۹۸
۱۸۔محمد اقبالؒ، کلیات اقبال (اُردو) ضرب کلیم (لاہور: الفیصل ناشران، فروری ۲۰۰۶ء) ص: ۶۲۶
۱۹۔محمد اقبالؒ، کلیات اقبال (اُردو) ضرب کلیم (لاہور: الفیصل ناشران، فروری ۲۰۰۶ء) ص: ۶۳۱
۲۰۔محمد اقبالؒ، کلیات اقبال (اُردو) ضرب کلیم (لاہور: الفیصل ناشران، فروری ۲۰۰۶ء) ص: ۶۳۶
۲۱۔محمد اقبالؒ، کلیات اقبال (اُردو) بانگ درا (لاہور: الفیصل ناشران، فروری ۲۰۰۶ء) ص: ۳۰۳
۲۲۔محمد اقبالؒ، کلیات اقبال (اُردو) ضرب کلیم (لاہور: الفیصل ناشران، فروری ۲۰۰۶ء) ص: ۶۰۸
۲۳۔محمد اقبالؒ، کلیات اقبال (اُردو) بال جبریل (لاہور: الفیصل ناشران، فروری ۲۰۰۶ء) ص: ۳۹۲
۲۴۔محمد اقبالؒ، کلیات اقبال (اُردو) بال جبریل (لاہور: الفیصل ناشران، فروری ۲۰۰۶ء) ص: ۴۲۱
۲۵۔محمد اقبالؒ، کلیات اقبال (اُردو) ضرب کلیم (لاہور: الفیصل ناشران، فروری ۲۰۰۶ء) ص: ۶۴۴، ۶۴۵
۲۶۔محمد اقبالؒ، کلیات اقبال (اُردو) ضرب کلیم (لاہور: الفیصل ناشران، فروری ۲۰۰۶ء) ص: ۶۳۴، ۶۳۵
۲۷۔محمد اقبالؒ، کلیات اقبال (اُردو) بال جبریل (لاہور: الفیصل ناشران، فروری ۲۰۰۶ء) ص: ۴۵۵

کلامِ اقبال اور افکارِ اقبال کے زندہ و تابندہ جوہر کا کمال ہے کہ ممتاز دانشوروں سے لے کر لکھنے پڑھنے کا شوق رکھنے والے عام علم دوست احباب کو بھی کچھ نہ کچھ کہنے کی تحریک دیتا چلا آرہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ اقبالؒ کے حوالے سے ہمارے تحریری سرمائے میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے اور عام قارئین سے لے کر گہرے علمی و فکری مزاج رکھنے والے قارئین کے مطلب کا جتنا تنقیدی و تشریحی سرمایہ اقبال کے حوالے سے جمع ہو چکا ہے کسی دوسرے اردو شاعر کے بارے میں موجود نہیں ہے۔ طالب حسین ہاشمی کے مقالات بھی اقبالؒ سے ان کی گہری قلبی وابستگی کے آئینہ دار ہیں۔ انھوں نے اقبالؒ کے فکر و احساس کے چیدہ نکات بھی اپنی تحریروں میں نمایاں کیے ہیں ان کی وضاحت میں کلامِ اقبال اور فرمودات اقبال کے خیالات سے بھی بھرپور استفادہ کیا ہے اور ان کی نگارشات کے اقتباسات درج کیے ہیں۔ اُمید ہے ان کے یہ مقالات اسلام اور اقبالؒ سے عقیدت و محبت رکھنے والے عام حلقوں میں دلچسپی سے پڑھے جائیں گے۔

پروفیسر جلیل عالی

(تمغۂ امتیاز)

اقبالیات ایک عرصے سے ایک علیحدہ مضمون کے طور پر رائج ہے جُوں جُوں وقت گزرتا جاتا ہے اقبال کے اَفکار اور شاعری کے نت نئے پہلو سامنے آرہے ہیں۔ اقبال کے آثار و احوال وہی ہیں مگر اُن کی توضیحات، تفہیمات، تشریحات اور تصریحات ہوتی رہی ہیں اور ہوتی رہیں گی کیونکہ ہم اقبال کے بعد بھی عہدِ اقبال میں جی رہے ہیں اور ہماری اگلی نسلیں بھی اقبال کے تصورات سے روشنی حاصل کرتی رہیں گی۔ طالب حسین ہاشمی مطالعہ اقبال کی اسی وراثت کے امین ہیں۔ اقبال پر سندی تحقیق نے ان کے ذوق وشوق میں اضافہ بھی کیا ہے اور اسے مزید جلا بھی بخشی ہے۔ عام طور پر تو ایسا ہوتا ہے کہ اقبال پر تحقیق کرنے والے سند حاصل کر کے اقبالیات کو اپنی ترقی کا وسیلہ بنا کر ایک طرف ہو جاتے ہیں لیکن ان میں طالب حسین ہاشمی جیسے ہونہار بھی ہیں جنھوں نے اقبال اور اقبالیات کا دامن تھامے رکھا ہے۔ طالب حسین ہاشمی نے اپنے سادہ اور رواں اُسلوب میں اقبال کے افکار کی نئے انداز میں تفہیم کی ہے، اُس کی راست فکر اور مثبت اندازِ نظر اقبال کے نئے قارئین میں اقبال کے مزید مطالعے کا شوق پیدا کرے گا۔ کہتے ہیں کہ سندِ تحقیق کی تربیت کی تصدیق کرتی ہے۔ اصل تحقیق سند کے حصول کے بعد شروع ہوتی ہے۔ طالب حسین ہاشمی کی تحقیق کا آغاز اِس کتاب ''مُعارفِ فکرِ اقبال'' سے ہو گیا ہے اور اُن کا جذبہ دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ اقبالیات کے میدان میں ان کا سفر آیندہ بھی ایسی سوغاتیں ہمارے لیے لاتا رہے گا۔

پروفیسر ڈاکٹر خالد اقبال یاسر۔ تمغائے امتیاز
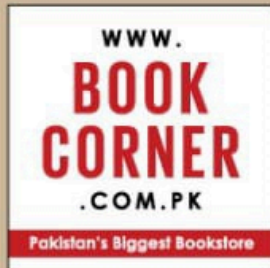
Book Corner
Jhelum (Pakistan)
bookcornershowroom
bookcornerjhelum
bookcorner
0314-4440882